جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ

Khizar Hayat Tiwana

جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ

کے

سوانح حیات اور اُن کی خاندانی تاریخ کا پس منظر

مرتبہ

غلام رسول مہر

سنہ ۱۹۶۵ء

مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس رتن چند روڈ لاہور

پیش لفظ

اس کتاب کی ترتیب و تسوید سے اصل مقصد صرف یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت کے سوانح حیات سامنے آجائیں، جو مختلف اعتبارات سے خاص قدر و منزلت کی مستحق تھی۔ بلاشبہ اس شخصیت کا ماحول اور دائرہ عمل موجودہ فضا سے بالکل مختلف تھا، تاہم اس نے ہمت و ایثار، عوام کی خدمت گزاری کیلیے خاص محویت و شیفتگی، اپنے سیاسی وغیر سیاسی معتقدات پر ثبات و استحکام اور ذاتی اغراض سے کاملاً بے نیازی کی بدولت اپنے عہد میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ پھر اس شخصیت کے ذاتی اوصاف و خصائل اس کے زمانے میں بھی قابلِ قدر تھے اور آج بھی یکساں بلکہ کچھ بڑھ کر ہی قابلِ قدر ہیں۔

جو کچھ اصل کتاب میں پیش ہو چکا ہے، اسے پیش لفظ میں دہرانا مناسب نہ ہو گا مقصودِ حقیقی صرف اسی شخصیت کی تصویر کشی تھی، لیکن پس منظر کے طور پر خاندانی حالات بھی قدرے تفصیل سے بیان کر دینے ضروری معلوم ہوتے، کیونکہ بعض اوقات شخصیت کی سیرت کا سانچا تیار ہونے میں خاندانی روایات بھی موثر عامل کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ حالات بڑی حد تک افسانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ انہیں خالص تاریخی پیرایہ ملا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ تمام حالات اصل داستان کے لیے محض آرائش و زیبائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ اور سیر و سوانح میں عموماً سبق آموز واقعات مل جاتے ہیں بیشِ نظر

داستان میں سبق آموزی کی خصوصیات راقم الحروف کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ ہیں البتہ ایک گزارش پیش کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق تقریباً نصف صدی پیشتر کے حالات سے ہے اور نصف صدی پیشتر کا ماحول سامنے رکھ کر تمام واقعات کا اندازہ کرنا چاہیے۔ امید ہے کہ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت مفید و نفع بخش ثابت ہو گی۔

فہرست ابواب

تیسرا حصہ

چوتھا حصہ

پہلا حصّہ



ملک عمر حیات خاں ٹوانہ

پہلا باب

حسب و نسب

تاریکی کے پردے

سینکڑوں دوسرے قبیلوں اور گروہوں کی طرح ٹوانوں کے ابتدائی حالات پر بھی تاریکی کے بعض ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ تاریخی روشنی کی کوئی کرن انہیں چاک کرنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ ٹوانے راجپوت ہیں اور راجپوتوں کے متعلق عام شہرت یہی ہے کہ وہ اپنے حسب و نسب کی حفاظت میں ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ٹوانوں کی اصل و نسل کے متعلق جو روایتیں شہرت پذیر ہوئیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی الجھنوں سے پاک سمجھا جا سکے۔ یا تاریخی معلومات کی بنا پر ان میں سے کسی ایک کو اول سے آخر تک مستحکم و پائیدار قرار دیا جا سکے؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

انہیں ابتدائی ماحول سے باہر نکلے ہوئے کئی صدیاں گذر چکی ہیں۔ اس اثنا میں ان پر عروج و زوال کے متعدد دور گزرے اور وہ سب کے سب یکجا بھی نہ رہ سکے۔ اس وجہ سے یا تو حالات کی بعض کڑیاں نظرانداز ہو گئیں

یا بعد میں کسی خالی حصے کو پُر کرنے کیلئے قیاس کی بنا پر کچھ رنگ آمیزی کر لی گئی۔

۲۔ عزت و احترام کی زندگی کیلئے لگاتار جدوجہد کے باعث اتنا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اطمینان سے حسب و نسب کے تمام رشتوں کو محفوظ رکھ سکتے۔ پھر ان میں باہم کشمکشیں بھی ہوئیں۔ اس وجہ سے اگر کوئی پُرانا تاریخی سرمایہ ان کے پاس موجود تھا تو وہ یا بکھر گیا یا ضائع ہو گیا۔

۳۔ راجپوت حسب نسب کے سلسلہ میں عموماً بھاٹوں یا مراثیوں پر بھروسہ کرتے رہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں نے نسب سلسلہ کو کہاں سے کہاں اور کس کس طرح جوڑا اور جن شخصیتوں کو انہوں نے اپنے خیال کے مطابق ممتاز تاریخی درجہ دے دیا۔ ضروری نہ تھا کہ وہ تاریخ نگاروں کے نزدیک بھی واقعی ممتاز یا قابل ذکر قرار پاتیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ اور افسانوی روایات کی حدیں ملتی بھی ہیں اور جدا بھی ہوتی ہیں۔

وجہ خواہ کچھ ہو، لیکن روایات کا جو سرمایہ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کیلئے یا تو کوئی مستند تاریخی حوالہ نہیں دیا جا سکتا یا جن حالات کو تاریخی قرار دینے کی کوشش کی گئی، ان کے اثبات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ تاہم ضروری نہیں کہ انہیں بے تکلف افسانے مان لیا جائے۔ کم از کم ان روائتوں کو قرین یقین تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں جو کسی تاریخی بیان کے خلاف نہ ہوں، اس لئے کہ دنیا کے کسی خطے یا قوم یا گروہ کی کوئی ایسی تاریخ پیش نہیں کی جا سکتی، جس میں تمام چھوٹے بڑے واقعات یقینی طور پر جمع ہو چکے ہوں۔

لیپل گرفن کا پہلا بیان

سر لیپل گرفن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ رؤسائے پنجاب" میں دو روائتیں پیش کی ہیں۔

۱- پہلی روایت یہ ہے کہ جھنگ کے سیالوں، پنڈی گھیپ (ضلع کیمبل پور) کے گھیبوں اور مٹھا ٹوانہ (ضلع شاہ پور) کے ٹوانوں کا جدِّ اعلیٰ ایک تھا۔ جس کا نام رائے شنکر تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ گھیو، ٹیو، اور سیو گھیبے، ٹوانے اور سیال انہیں تینوں کی اولاد تھے[1]

پھر لکھتے ہیں کہ رائے شنکر دھارا نگر کا باشندہ تھا، جو صوبجات متحدہ مغربی و شمالی میں الہ آباد اور فتحپور کے درمیان واقع ہے۔ وہ ۱۲۳۰ء میں دھارا نگر سے جون پور پہنچا اور اس کا بیٹا سیو جس کی اولاد سیال ہیں، ۱۲۴۳ء میں جون پور سے پنجاب چلا آیا[2]

اس روایت کو درست سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سیالوں، گھیبوں، اور ٹوانوں کے جدِّ اعلیٰ کا اصلی وطن راجپوتانہ نہیں، یوپی تھا، پھر جہاں ملکی حالات کی ابتری نے بعض دوسرے راجپوت قبیلوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ وہاں رائے شنکر کے فرزند بھی بیک وقت یا یکے بعد دیگرے پنجاب پہنچ گئے

دوسرا بیان ٹوانوں کے بھاٹوں نے تحقیق و تفتیش اور چھان بین کے بعد ایک نیا شجرۂ نسب تیار کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ گھیبوں، ٹوانوں، اور سیالوں کی اصل ایک ہے، تاہم یہ صحیح نہیں کہ وہ سب رائے شنکر کی اولاد ہیں۔ اس شجرۂ نسب رو سے ان قبیلوں کے جد اعلیٰ کا نام راجا کام دیو تھا۔ اس کے دو فرزندوں میں سے ایک کا نام کرم چند تھا، دوسرے کا بجدیو۔ بجدیو کی تیسری پشت میں رائے شنکر تھا، جس سے سیال ہوئے۔ کرم چند کی چوتھی پشت میں ٹوانہ تھا اور اس کی چھوٹی پشت میں رائے میلو ٹوانہ، میلو کے تین فرزند تھے، ٹیو، لکھو، واڈو،

---

[1] پیل گرفن کی کتاب انگریزی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۰ء جلد دوم ص ۱۹۲

[2] ایضاً ایضاً ص ۳۶ میری تحقیق کے مطابق دھارا نگر جسے بعض نقشوں میں دھارو پور لکھا گیا ہے، ضلع پرتاب گڑھ میں واقع ہے۔

لکھو کی اولاد میں وہ ہندو ٹوانے ہیں، جو ریاست پٹیالہ میں متوطن ہوئے۔ داؤد کی اولاد میں بہاولپور کے داوَد پوترے ہیں[1]

باقی رہا ٹیو تو اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک مل یا رائے مل جس سے ٹوانے ہوئے۔ دوسرا مورد خ[2] جو گھیبوں کا جدّ امجد تھا۔

تیسرا بیان ملک محمد امیر نے اپنی کتاب "تحفتہ الامیر" میں لکھا ہے۔ علاقہ اجمیر، بیکانیر، ڈھانگر، مارواڑ میں مشہور و معروف راجہ کرن ہو گذرا ہے، جس کے مفصل حالاتِ عدل و انصاف و بہادرانہ افسانے کُتب اہل ہنود میں مندرج ہیں اور اس مشہور و نامور راجہ کے نام سے ہندوؤں کا بچہ بچہ شناسا ہے۔[3]

اجمیر، بیکانیر، ڈھانگر، مارواڑ، کا مطلب یہ ہے کہ کرن راجپوتانہ کا کوئی راجہ تھا۔ اس نام کے راجہ بیکانیر میں بھی ملتے ہیں، اور میواڑ میں بھی لیکن ان کے سنین "تحفۂ امیر" کے بیان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مارواڑ میں اس نام کا کوئی راجہ ہی نہیں ہوا۔

"تحفتہ الامیر" میں رائے میلو سے کرن تک شجرہ نسب یوں بیان کیا گیا ہے۔ میلو بن مین پال، بن جے پال[4] بن دڑرائے بن رجو دھر[5] بن رائے وسندھ بن ٹوانہ بن برال بن مونگرہ بن کرم چند[6] بن کام دیو بن کرن، گویا کرن سے میلو تک بارہ پشتیں ہیں۔ اگر فی پشت تیس سال کا اوسط بھی رکھا

---

[1] یہ بیان بالکل غلط ہے۔ داود پوترے از روئے نسل عباسی ہیں۔ وہ مدت دراز تک سندھ میں رہے اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں بہاولپور پہنچے۔ انہیں کسی ہندوستانی نسب نامے سے منسوب کرنا تاریخی لحاظ سے سراسر غلط ہے۔

[2] تاریخ جہاں نما میں اس کا نام مارخ خاں لکھا ہے ص ۱۰۱۔ [3] تحفتہ الامیر ص ۵۳۔ [4] تاریخ جہاں نما میں اس کا نام جس پال درج ہے ص ۶۵۔ [5] تاریخ جہاں نما میں اس کا نام جے دھر بیری بتایا گیا ہے ص ۶۷

جائے، توتین سو ساٹھ سال ہوئے ۔ میلو کے والد مین پال کا انتقال ۱۱۹۵ء میں ہوا ۔ گویا سمجھنا چاہیے کہ رائے کرن آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر اور نویں صدی عیسوی کے اوائل میں تھا ۔ تاریخ اس کرن کے ذکر سے خالی ہے ۔ ہندوؤں کی کتابوں میں اگر کوئی ذکر ہو تو اسے تاریخی تصدیق کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا ۔

چوتھا بیان چوتھا بیان "تاریخ جہان نما" کا ہے ۔ جس میں سلسلہ نسب حضرت نوح علیہ السلام سے شروع کیا گیا ہے ۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ حام بن حضرت نوح علیہ السلام کا ایک فرزند "ہند" تھا، جس کے چار بیٹے ہوئے ۔ ان میں سے ایک کا نام "پورب" تھا ۔ جس کا فرزند کشن تخت سلطنت پر متمکن ہوا ۔ یہ طہمورث شہنشاہ ایران کا معاصر تھا ۔ اسی کی اولاد میں سے دِجہّ اور اَتّر سے سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کا آغاز ہوا ۔ چندر بنسی خاندان سے راجہ کرن تھا، جس کے اخلاق کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے [۱]۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا سلسلہ ہائے نسب ترتیب دینا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے ۔ ہمارے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ راجہ کرن چندر بنسی خاندان سے تھا ۔ اسی کی اولاد میں سے رائے میلو پنجاب پہنچ کر مسلمان ہوا ۔ اس کے چھٹے جدّ امجد کا نام، راجہ ٹوانہ تھا، وہ یقیناً غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو گا اس لئے کہ اسی کے نام سے پورا قبیلہ موسوم ہوا ۔

تبصرہ ان بیانات کا تفاوت اور اضطراب کسی تشریح کا محتاج نہیں، لیکن ان میں بعض باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ٹوانے راجپوت ہیں، وہ باہر سے پنجاب میں آئے

---

[۱] "تاریخ جہان نما" صفحہ ۵۶۴ ۔ ۵۶۹

اور ان کے اجداد اپنے پہلے وطن میں حکومت و فرمانروائی کے منصب پر فائز تھے۔ واضح قرینہ یہی ہے کہ وہ راجپوتانہ سے پنجاب پہنچے۔ جس علاقہ میں انہوں نے ابتدائی قدم رکھا وہ راجپوتانہ سے ملا ہوا ہے، یو۔ پی کے نہایت زرخیز اور آباد حصے سے کسی بڑے قبیلے کا پنجاب کے اس علاقے میں آنا جس کی حیثیت زیادہ تر صحرائی تھی، دل کو نہیں لگتا، البتہ راجپوتانہ سے نکل کر پنجاب کے ویسے ہی علاقہ میں ڈیرے ڈال دینا عین قرین قیاس ہے۔

پتے کی بات مسز ولسن نے کہہ دی۔ وہ ٹوانوں کی پرانی تاریخ یوں بیان فرماتی ہیں۔

> مٹھا ٹوانہ کے ٹوانے نسباً راجپوت ہیں یہ طیب خاطر مسلمان ہوئے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے مٹھا ٹوانہ کے ہیبت ناک پرانے قلعے میں قدم جمائے بیٹھے ہیں انہیں اپنی خاندانی تاریخ کا سراغ لگانے کیلئے کسی تملق پیشہ بھاٹ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تاریخ کوہستانِ نمک سے شمالی ہند کی مغربی سرحدوں تک خونی حرفوں سے لکھی جاچکی ہے[1]

ٹوانوں نے جو عظمت حاصل کی، یقیناً وہ ان کے اجداد کی سابقہ برتری کا نہیں، بلکہ ان کے پشت بہ پشت عظیم الشان کارناموں کا نتیجہ ہے، گویا لیڈی ولسن کے الفاظ میں انہوں نے اپنی عظمت کا مرقع خونی حروف سے تیار کیا۔ البتہ یہ واضح کر دینا چاہیے، کہ پنجاب پہنچنے تک وہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اور اپنے پہلے مذہب پر قائم تھے۔ جو عام راجپوتوں کی طرح ٹھیٹھ ہندو مذہب تھا۔ یعنی برہمن مت جس کا احیاء گپت خاندان کی سلطنت میں ہوا اور برہمن از سر نو مذہبی پیشوائی کے درجے پر پہنچ گئے۔

---

[1] ہندوستان سے خطوط Letters from India از لیڈی ولسن صہ ۱۳۲

دوسرا باب

ترکِ وطن اور قبولِ اسلام

رائے میلو ٹوانہ

گذشتہ باب میں ٹوانوں کے حسب و نسب اور مقام و وطن پر بحث کرتے ہوئے ہم بتا چکے ہیں کہ مختلف روایتوں میں سے زیادہ قرینِ قیاس کونسی ہے۔ "تحفہ امیر" کا بیان ہے

۱۱۹۵ء میں (رائے میلو) بعد انتقال والدِ خود علاقہ بیکانیر، مارواڑ اجمیر وغیرہ راجپوتانہ میں حاکم ہوا۔ اس کا جائے قیام مقام ڈھانگر تھا۔ شاہانِ اسلام میں سے وہ زمانہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کا تھا، جو ۱۱۹۴ء میں راجہ قنوج مہاراجہ جے چند کو مغلوب کر کے بنگالہ و بہار کی طرف لشکر کشی اور یلغار کر رہا تھا اور مقام دہلی پر اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک لکھ داتا کو اپنا جانشین مقرر کر گیا تھا۔ اسی سال شہاب الدین محمدؒ نے راجہ رائے میلو کے والد راجہ مین پال پر بھی ایک شدید حملہ کیا تھا اور بعد جنگ و جدال کے مابین سلطان موصوف و راجہ مذکور عہد و پیمان ہو رہے تھے،

اور وقت خوشی اور امن سے گذر رہا تھا۔[1]

اس بیان میں متعدد الجھنیں ہیں، جنہیں واضح کر دینا چاہیے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

۱۔ میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں بیکانیر، مارواڑ، اجمیر وغیرہ کی کوئی حکومت موجود نہ تھی۔

۲۔ ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کی شکست کے بعد اجمیر کی حکومت اس کے بیٹے راجہ گولا یا کولا کو دیدی گئی تھی، جیسا کہ فرشتہ اور بعض دوسرے مورخوں نے لکھا ہے۔[2]

۳۔ جے چند والئ قنوج کو چندوار کے مقام پر شکست دینے کے بعد شہاب الدین محمد غوری کا اسنی کیطرف بڑھنا مسلّم ہے۔ ممکن ہے، وہ بنارس بھی گیا ہو۔ لیکن اور کسی لڑائی کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود نہیں۔

کیا یہ افسانہ ہے؟

پھر کیا اس بیان کو محض افسانہ سمجھ لیا جائے؟ اگر ہم اس کی تصدیق کیلئے مستند تاریخی شہادتیں پیش نہیں کر سکتے تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ اصل داستان سراسر بے اصل ہے۔ تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان میں بے شمار چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں۔[3]

---

[1] "تحفۂ امیر" صفحہ ۵۳ دھانگر کے متعلق جنرل سر محمد حیات خاں مرحوم نے خاصی چھان بین کرائی تھی۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ کہ اس سے مراد "دھار" ہے۔ جو وسط ہند کی مشہور ریاست ہے۔ رقبہ ایک ہزار سات سو ستر مربع میل اور آبادی ۲ لاکھ سوا تیس ہزار۔ "دھار" زمانہ قدیم میں بھی راجپوتوں کا ایک مشہور مرکز تھا۔ ممکن ہے اسے پہلے دھار نگر کہتے ہوں اور وہ "دھانگر" بن گیا ہو۔ [2] مثلاً تاریخ فرشتہ صفحہ ۵۸ ہسٹری آف میڈیول انڈیا مصنفہ ایشوری پرشاد صفحہ ۱۳۴

[3] مثلاً آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا مصنفہ ونسنٹ سمتھ صفحہ ۲۰۱

خصوصاً شمالی اور مغربی ہندوستان میں - ان میں سے صرف چند بڑی ریاستوں کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے - ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بے شمار رئیس اور راجے ایسے ہوں گے - جو تمام انتظامی معاملات میں خود مختار تھے اور لڑائیوں کے موقع پر کسی بڑے رئیس سے وابستہ ہو جاتے تھے - اس بنا پر ممکن ہے ، بیکانیر یا مارواڑ کے کسی حصے میں مین پال کی ریاست بھی موجود ہو -

مسٹر ایشوری پرشاد تسخیر قنوج کے سلسلے میں رقم طراز ہیں -

ہندو رؤسا اظہارِ عقیدت کی غرض سے سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہوئے - اس کے نام پر سکے ڈھالے اور جاری کئے گئے - معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کسی قابل ذکر مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا - اور انہوں نے آسانی سے پورے ملک پر قبضہ جما لیا[۱]

اغلب ہے ، راجہ مین پال نے بھی اس موقع پر یہی مناسب سمجھا ہو کہ اطاعت کا اقرار کر کے اطمینان سے مسند پر بیٹھا رہے - غرض "تحفہ امیر" کے بیان کے مطابق ۱۱۹۵ء میں مین پال نے وفات پائی اور اس کا فرزند رائے میلو جدی میراث کا مالک بنا -

وطن سے اخراج

معلوم ہوتا ہے کہ رائے میلو کو سلطان شہاب الدین محمد غوری ، سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان ، آرام شاہ کے زمانے میں کوئی پریشانی دامنگیر نہ ہوئی - "تحفہ امیر" کے بیان کے مطابق سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں خراج کے جھگڑے شروع ہوئے - چند راجے خود مختار ہو گئے - ان جھگڑوں میں راؤ میلو بھی اُلجھ گیا - شاہی فوج حملہ آور ہوئی - اس کا

---

[۱] دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا مصنفہ ایشوری پرشاد ص ۱۳۶-۱۳۷

سالار مارا گیا۔ پھر باغیوں کی سرکوبی کے لئے خاص اہتمام کیا گیا۔ ان یورشوں میں رانے میلو وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس کے محلات اور قلعے مسمار کر دیئے گئے ؎۱

حالات کا تاریخی نقشہ

تاریخی بیانات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ سلطان قطب الدین کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ تو نظم ونسق میں خلل پیدا ہو گیا۔ ان دنوں بنگال کے علاوہ وسط ہند اور راجپوتانہ میں بھی بعض مقامی رئیسوں نے خودسری اختیار کر لی۔ سلطان شمس الدین التمش تخت نشین ہوئے۔ تو انہیں تاج الدین نامی حاکم غزنی اور ناصر الدین قباچہ حاکم سندھ سے لڑائیاں پیش آگئیں۔ پھر تاتاریوں کی یورش کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ ان پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد سلطان التمش کی توجہ بنگال کے حالات کی درستی پر مبذول ہوئی۔ ادھر سے اطمینان ہو گیا تو سلطان نے گوالیار کا رُخ کیا۔ چنانچہ ۱۲۳۲ء میں سلطان بھیلسا کو متسخر کرتا ہوا اجین جا پہنچا۔ جو مہاراجہ بکرماجیت کی راج دھانی ہونے کے باعث بہت مشہور ہو چکا تھا۔

ان تاریخی حالات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ سلطان شمس الدین کے لشکر ۱۲۳۲ء کے قریب وسطِ ہند اور راجپوتانہ کی طرف بڑھے۔ اغلب ہے، اسی زمانے میں رائے میلو کو بھی ترکِ وطن کی مجبوری پیش آئی۔ اس کے بچاؤ کا راستہ یہی تھا۔ کہ شمال یا شمال مغرب کی طرف نکل جاتا۔ یہی اس نے کیا۔

تاریخ جہاں نما کا بیان

"تاریخ جہاں نما" میں رائے میلو کے ترکِ وطن کی ایک عجیب وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان کا ایک زبردست راجہ رائے موصوف کی راج کماری سے شادی کا

---

۱ تحفہ امیر صد ۵۴۔

خواہاں تھا۔ رائے کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ لیکن صاف انکار کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ ایک تدبیر سے راجہ مذکور کو بلا کر ہمراہیوں کے ساتھ قتل کرا دیا۔ اور خود فیروز شاہ تغلق کے پاس دہلی پہنچ گیا۔ وہاں تیر اندازی میں سب سے بازی لے گیا۔ فیروز شاہ اتنا خوش ہوا کہ کہا۔ جو مانگو گے دوں گا۔ رائے میلو نے خاص شاہی بادرچی مانگ لیا۔ بعد میں فیروز شاہ سے ان بن ہو گئی۔ لہٰذا رائے میلو فیروز شاہ کے ماموں کو قتل کر کے پنجاب چلا آیا۔ اور خواجہ فرید شکر گنج کی خدمت میں سعادت اسلام سے مشرف ہوا[1]

یہ بیان بہ وجوہ ناقابل قبول ہے۔ مثلاً تیر اندازی میں سب سے بازی لے جانے کے بعد انعام میں شاہی بادرچی طلب کرنا تعجب انگیز حد تک غیر متوقع ہے۔ رائے میلو ہندو راجہ سے یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ وہ مسلمان بادرچی کا طلب گار ہوگا۔ اس بیان کے سقیم ہونے کی روشن ترین دلیل یہ ہے کہ خواجہ فریدالدین شکر گنج کا وصال ۵ محرم الحرام ۶۶۰ھ (۳۰ نومبر ۱۲۶۱ء) کو ہوا۔ فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی نوے سال بعد ۱۳۵۱ء میں ہوئی۔

ترکِ وطن کی کیفیت

جس حال میں ترکِ وطن کیا۔ اس کا اندازہ چنداں مشکل نہیں۔ حکومت چھن چکی تھی۔ خزانے میں جو کچھ بھی تھا، وہ یا تو خرچ ہو چکا ہوگا۔ یا فاتحوں کے قبضے میں آگیا ہوگا۔ زیادہ آدمی بھی ساتھ نہ لئے جا سکتے تھے۔ اس لئے کہ نہ ان کے گزارے کا بندوبست سہل تھا۔ اور نہ بڑی جماعت کے ساتھ اجنبی علاقے میں جانا اور پناہ حاصل کرنا ممکن تھا۔ لہٰذا قیاس یہ ہے کہ خویش و اقارب اور چند خاص خادموں یا متوسلوں کے سوا زیادہ آدمی ہمراہ

---

[1] تاریخ جہاں نما ص ۵۶۹-۵۷۰

نہ ہوں گے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رائے میلو نے ساتھیوں کے چھوٹے چھوٹے قافلے بنا دیئے ہوں تاکہ کسی جگہ مزاحمت کی صورت پیدا نہ ہو ۔ میرا خیال ہے کہ وہ سامان بھی چھوڑ دیئے ہوں گے ۔ جو سرداری اور فرمانروائی کے خاص نشان ہیں ۔ اور ایسی صورت بنا لی ہو گی ۔ کہ دیکھنے والوں کے دل میں راجائی کا شبہہ پیدا نہ ہو ۔

قبول اسلام بیان کیا جاتا ہے کہ رائے میلو ترکِ وطن کے بعد آہستہ آہستہ ملتان پہنچا ۔ وہاں کے صوبہ دار نے اچھا برتاؤ کیا ۔ اسی جگہ رائے کے دل میں قبولِ اسلام کا جذبہ پیدا ہوا تو صوبہ دار نے انہیں حضرت خواجہ فریدالدین شکر گنج رح کے پاس اجودھن بھیج دیا[۱] ۔ جو بعد ازاں پاک پٹن شریف کے نام سے مشہور ہوا ۔ "تحفۂ امیر" کی روایت ہے کہ رائے میلو کچھ مدت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہا ۔

آخر الامر تاثیر ولایت حضرت نے اپنا کام کیا ۔ اور ۶۲۷ھ میں ، بمقام اجودھن مشرف بہ اسلام ہو کر سلسلۂ چشت میں بیعت اختیار کر لی[۲] ۔

رائے میلو کے تمام ساتھی بھی اس موقع پر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ۔

یہاں یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ حضرت خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج رح اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کی حیات تک ہانسی میں مقیم تھے اور وقتاً فوقتاً دہلی جاتے تھے ۶۳۴ھ میں پیر و مرشد کی وفات کے بعد انہیں خلافت مل گئی ۔

---

[۱] تحفۂ امیر صفحہ ۵۴ ۔ [۲] تحفۂ امیر صفحہ ۵۵ ۔ کتاب میں مرقوم ہے کہ عیسوی سن ۱۲۲۰ تھا ۔ اغلب ہے ۔ یہ کتابت کی غلطی ہو ۔ عیسوی سن ۱۲۲۹ - ۱۲۳۰ ہونا چاہیئے ۔

اور شائقینِ فیض گروہ در گروہ ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ہانسی کی اقامت چھوڑ کر اجودھن چلے آئے۔ اس لئے کہ تاریخ فرشتہ کے قول کے مطابق اجودھن کے باشندے بڑے "کج طبع" اور "درشت مزاج" تھے۔ اور انہیں زاہدوں یا عالموں سے کوئی سروکار نہ تھا[1]۔ خواجہ صاحب کو ایسی ہی فضا پسند تھی۔ جہاں تبلیغ حق کی راہ میں محنت و مشقت اٹھانی پڑے۔

غرض خواجہ صاحب کو اجودھن پہنچے ہوئے صرف تین سال گزرے تھے۔ جب رائے میلو نے ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔

دوسری روایت قبولِ اسلام کی ایک روایت مجھے ملک خضر حیات خاں نے سنائی، جو ان کی خاندانی روایات میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ رائے میلو اور ان کے ساتھی مال مویشی کے ہمراہ مناسب جائے امن کی تلاش میں تھے۔ کچھ مدت انہوں نے اجودھن کے آس پاس گزاردی ان کے خاندان کی عورتیں روزانہ دودھ خواجہ صاحب کے پاس لے جاتیں۔ جو آبادی سے باہر درویشانہ زندگی گزار رہے تھے مردوں کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے عورتوں کو سختی سے روک دیا۔ چند روز کے بعد اتفاقیہ مال مویشی کا بڑا حصّہ آس پاس کے جنگل میں گم ہو گیا۔ اور تلاش کے باوجود کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آخر عورتوں نے مردوں سے کہا کہ اجازت ہو تو اس درویش سے دعا کرائیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب سے دُعا کی درخواست کی گئی۔ انہوں نے بے توقف ہاتھ اٹھائے۔ اور

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم صـ۳۸۴۔

دعا کی - اور فرمایا کہ دودھ کے برتن صاف کر رکھو - اور خدا کے فضل پر بھروسہ رکھو - مردوں نے یہ کیفیت دیکھی تو بولے یہ تیاری بے سود ہے - مستورات اور بعض مردوں نے کہا - کہ برتن صاف کر رکھنے میں ہرج کیا ہے - جب شام ہوئی - تو گائیں بھینسیں ڈیرے کی طرف آنے لگیں - اس غیر معمولی واقعہ سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ دوسرے دن پورا قبیلہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں آکر مشرف بہ اسلام ہوا - روایت میں بتایا گیا ہے کہ ان کے زنار (جینؤ) اترے - تو ان کی مقدار سوا من تھی - شاید اسے مبالغہ سمجھا جائے - لیکن اس سے ایک حقیقت واضح ہے - اور وہ یہ کہ رائے میلو کی برادری اور متوسلین کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ تھی - اور یقیناً ترک وطن کرتے وقت محض رشتہ دار ہی نہیں - بلکہ نوکر چاکر بھی ساتھ ہو گئے ہوں گے -

تبلیغی نکتہ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے نہ ان غیر مسلموں کا تحفہ قبول کرنے میں کبھی تامل کیا - اور نہ دُعا کی درخواست مسترد فرمائی - وہ روحانیت کے حاذق طبیب تھے - جانتے تھے کہ ان لوگوں کو راہِ حق پر لانے کے لئے کون کون سی تدابیر کس کس موقع پر ہونی چاہئیں - انہوں نے تحفے اس غرض سے قبول کئے - کہ غیر مسلموں کی استمالت اور دلداری منظور تھی - تاکہ وہ مانوس ہو جائیں - اور پیغام حق سننے کے لئے ان کے دلوں میں آمادگی کی روح ظہور کر آئے - دعا کی درخواست کے وقت بھی ان پر کوئی شرط نہ لگائی - جب ان کی مراد ،

پوری ہو گئی - تو وہ خود اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے - یہ طریق تبلیغ تھا - جو ابتدائی دور کے ان بزرگ علم بر اسلام نے اختیار فرمایا - جن کے نام آج بھی ہر حلقے میں انتہائی احترام کا مرکز بنے ہوتے ہیں - اور ہمیشہ بنے رہیں گے -

حضرت خواجہ معین الدّین اجمیریؒ - حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ حضرت خواجہ فریدالدّین مسعود شکر گنجؒ کی مقدس زندگیوں سے ہمیں اسی شانِ تبلیغ کا سبق ملتا ہے -

تیسرا باب

نئی آبادی اور نیا وطن

نئی آبادی کا انتظام حضرت خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج رح نے رائے میلو کو قبول اسلام کے بعد کچھ مدت اپنے پاس رکھا "تحفہ امیر" کا بیان ہے کہ رائے موصوف کے ساتھ جو لوگ تھے۔ ان میں سیال، کھرل، شلولی، کندی، کلیرا منج ڈھوری۔ ڈھڈی، چدھڑ وغیرہ قوموں کے سردار بھی شامل تھے۔ وہ بھی سب کے سب مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت خواجہ رح نے حاکمِ ملتان کو لکھ کر ان لوگوں کی اقامت اور معاش کا بندوبست کروایا۔ چنانچہ :۔

۱۔ سیال اور کھرل علاقہ جھنگ کے جنگلات میں بیٹھ گئے ان کی وجہ سے جھنگ کا نام جھنگ سیال مشہور ہوا۔

۲۔ رائے میلو دریا خاں پہنچ گیا۔ اور علاقہ تھل کے اس حصے پر قابض ہو گیا۔ جہاں جنگل تھا۔ کندی قوم کو اپنے مقبوضہ

علاقے کی شمالی سرحد پر آباد کیا - اس مقام کا نام اب تک کندیاں ہے -

۳ - رائے نے خاص اپنے لئے دریا خاں سے دو کوس مشرق کی طرف ایک آبادی قائم کی - جس کا نام اپنے فرزند کے نام "ٹھٹھہ ٹوانہ" رکھا - اسے آج کل "ٹبہ ٹوانہ" کہتے ہیں - اور یہ موضع داگھورا تحصیل بھکر میں شامل ہے[۱]

مقبوضات میں توسیع

رائے میلو نے ٹھٹھہ ٹوانہ پہنچ کر تمام انتظامی معاملات اپنے بیٹے ٹیٹو کے سپرد کر دے اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی - دریا خاں میں چشتی خاندان کے ایک با کمال بزرگ حضرت سلطان حاجی تھے - ان سے خاص تعلق پیدا ہو گیا - علاقہ تھل اس زمانے میں بے آباد سا پڑا تھا - حضرت سلطان حاجی نے ٹوانہ سرداروں کی ترقیٔ اقبال کے لئے دعا کی - اور انہیں ترغیب دی کہ بے آباد علاقے کو قبضے میں لاکر اس کی آبادی کا بندوبست کریں - چنانچہ "تحفہ امیر" کے بیان کے مطابق ٹیٹو نے ہمراہیوں میں سے ایک لشکر تیار کیا - اور داگھا - چھینا ، بھٹا ، شیخ ، بالی ، گھلو ، ہوتا ، انگرا ، جوڑا ، پھی ، جھنٹ ، لک ، کہاوڑ ، گدارے ، بھچر ، جویا - اور اعوان قوموں کو مطیع کر لیا - وہ لوگ جس علاقے پر قبضہ کرتے - اس کی آبادی کا بندوبست کر دیتے - اس طرح رائے میلو اس کے بیٹے اور پوتوں کو اجنبی سرزمین میں ایک ایسی حکومت کے انتظام کا موقع مل گیا - جس کی حیثیت غالباً راجائی کی سی تو نہ تھی - لیکن طبیعت کے مطابق باعزت زندگی بسر کرنے کی صورت پیدا ہو گئی تھی -

---

[۱] "تحفہ امیر" ص ۵۵-۵۶ -

رائے میلو کی وفات

"تحفہ امیر" کا بیان ہے کہ رائے میلو نے ۱۲۵۹ء میں وفات پائی - اور وہ دریا خاں میں سلطان حاجی کے مزار کے پاس دفن ہوا[1]

کہا جاتا ہے کہ رائے موصوف عام ہند و علوم کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی دسترس رکھتا تھا - آخری دو زبانیں اس نے اس زمانے سیکھی ہوں گی - جب وہ اسلام کے حلقہ بگوش بنا - اس سے پیشتر نہ عربی و فارسی زبانیں سیکھنے کی کوئی ضرورت تھی - اور نہ ان کے سیکھنے کا موقع پیش آیا ہوگا - وہ فن سپاہ گری میں بھی بے نظیر مانا جاتا تھا - انتظام جاگیر میں بھی اس کی دانش مندی، لیاقت، تدبر، عدل اور رعایا پروری کا شہرہ تھا - جس خوش نصیب کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے نورِ اسلام کے لئے کھول دیا - اس کے اوصافِ حسنہ کے متعلق کسی کے دل میں یقیناً شبہہ پیدا نہیں ہو سکتا -

ٹیٹو رائے مل اور موردخ

رائے میلو کی وفات کے بعد ٹیٹو قوم کا سردار بنا رہا - وہ باپ کی زندگی ہی میں تمام انتظامات کا ذمہ دار تھا - اور یقین ہے کہ اس کا عہد بھی انتہائی اطمینان سے گزرا ہو گا - وہ بھی انتقال کے بعد اپنے والد کے پہلو میں بمقام دریا خان ہی دفن ہوا -[2]

ٹیٹو کے دو بیٹے تھے - رائے مل اور موردخ - کچھ مدت تک وہ اطمینان و یک جہتی سے زندگی بسر کرتے رہے - پھر موردخ نے ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیا - کہ دونوں بھائیوں میں کشاکش شروع ہو گئی - آخر لڑائیوں تک نوبت پہنچی - موردخ نے شکست کھائی -

---

[1] "تحفہ امیر" صہ ۵۲ - اس بیان کی تصدیق اور کسی ذریعے سے نہ ہو سکی - اور مصنف "تحفہ امیر" نے اس سلسلے میں کسی ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا - [2] "تحفہ امیر" صہ ۵۲

اور بھاگ کر شمال کی طرف ویران علاقے میں نکل گیا - وہیں اس نے ایک آبادی قائم کی - جس کا نام اپنے فرزند گھیبا کے نام پر پنڈی گھیب رکھا - یہ آج کل ضلع کیمبل پور میں ایک تحصیل ہے -

رائے مل ٹھٹھہ ٹوانہ ہی میں مقیم رہا - اور وہیں فوت ہوا اسے بھی اپنے باپ دادا کے پاس دریاخاں ہی میں دفن کیا گیا[1] ٹیٹو اور رائے مل کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں - اور یہ پتہ بھی نہ چل سکا کہ وہ کتنی مدت تک اپنے علاقے میں سرداری کے فرائض انجام دیتے رہے

پھیرو اور اودر

رائے مل کے بعد س کا بیٹا پھیرو جانشین ہوا - اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں - ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ جلد وفات پا گیا - پھر اس کے فرزند رائے اودر خاں کے سر پر سرداری کی دستار رکھی گئی - بیان کیا جاتا ہے کہ وہ درشت خو اور بدمزاج تھا - اس کے عہد میں رعایا پر جبر و تشدّد ہوتا رہا - یہاں تک کہ لوگ اس سے بیزار ہو گئے - اور رائے کی شکایتیں حاکم ملتان کے پاس پہنچائیں - اس لئے کہ ٹوانوں کا علاقہ رسمی طور پر حکومت ملتان ہی کے ماتحت تھا -

اس پریشانی کے علاوہ ایک اور پریشانی پیدا ہو گئی - یعنی جنوبی سمت سے بلوچ قبیلوں کا ریلا شمال کی طرف بڑھا - اور انہوں نے دریا کے دونوں کناروں پر جا بجا اپنی آبادیاں قائم کر لیں یا جو آبادیاں پہلے سے موجود تھیں - انہیں اپنے تصرف میں لے لیا یوں ٹوانہ سرداروں اور بلوچوں کے درمیان لڑائیوں کا آغاز ہوا - کہا جاتا ہے کہ بلوچوں نے منکیرا - حیدر آباد ، لدھیانہ ، لیہ ، کوٹ سلطان

---

[1] تحفہ امیر" صفحہ ۵۸ ، ۵۹ -

کوٹ ادو، محمود کوٹ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ان تمام مقامات میں وہی آباد ہو گئے۔

جب حاکم ملتان کو ٹوانوں اور بلوچوں کی لڑائیوں کا علم ہوا۔ تو اس نے دونوں کی جاگیروں کے درمیان حد بندی کرا دی۔ چنانچہ، دولا والا، جنڈاں والا، اور منکیرا دونوں جاگیروں کے درمیان۔ سرحدی مقامات قرار پائے۔ تھل کے شمالی حصّے میں پہاڑ تک رائے اودر خان کی حکومت تھی۔ جنوبی حصّے پر بلوچ قابض تھے۔

رائے اودر نے بھی ٹھٹھہ ٹوانہ میں وفات پائی۔ اور وہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح دریا خاں میں دفن ہوا۔ جو خاندانی قبرستان بن چکا تھا۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔

اودر خاں کی اولاد

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ضلع شاہ پور کے بڑے بڑے ٹوانہ خاندان اسی رائے اودر خاں کی اولاد ہیں۔ اس کے تین بیٹے تھے: سدھاری خاں، بخاری خاں، اور شہزادہ خاں، ان کی اولاد نے مختلف اوقات میں کئی مرکز بنا لیے۔ لیکن ان کے ابتدائی بڑے مرکز یہ تھے۔ "ٹھٹھہ ٹوانہ" ہڈالی، بوتالہ، وغیرہ۔ شہزادہ خاں کی اولاد کا ذکر ہم تفصیلاً کریں گے۔ اس لئے کہ جس شخصیت کے متعلق یہ کتاب لکھی جا رہی ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب شہزادہ خاں ہی سے ملتا ہے۔

شہزادہ خاں اور مالھو خاں

اودر خاں کے ظلم و جور کی وجہ سے رعایا میں جو بے اطمینانی پیدا ہوئی تھی۔ اسے اس کے جانشین شہزادہ خاں کی نرم مزاجی اور حق شناسی نے بالکل محو

ٹ یہ حالات "تحفۂ امیر" سے ماخوذ ہیں۔ لیکن تحفے میں جو تاریخیں دی گئی ہیں۔ وہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ "تاریخ جہاں نما" سے بھی فی الجملہ ان بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

کر دیا ۔ تمام لوگ پھر پہلے کی طرح مطمئن ہو کر اپنے سردار کے جان نثار بن گئے ۔

"تحفہ امیر" کا بیان ہے کہ شہزادہ خاں تغلقوں کے آخری دور میں گزرا ہے ۔ جب ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی ۔ گویا اس کا زمانہ چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی کے آغاز میں ماننا چاہیئے ۔ چونکہ ملک میں بدامنی پھیل گئی تھی ۔ اس لئے ممکن ہے ۔ "تحفہ امیر" کی تحریر کے مطابق شہزادہ خاں پر سختیاں بھی ہوئی ہوں[1] ۔ غرض بے اطمینانی کی حالت میں اس نے وفات پائی ۔ اس کی قبر بھی دریا خاں ہی میں ہے ۔ پھر اس کا بیٹا مالھو خاں سردار بنا ۔ اسے بھی امن چین نصیب نہ ہوا ۔ بعد وفات وہ بھی دریا خاں ہی میں دفن ہوا ۔

جلال خاں اور حسین خاں

مالھو کے بعد اس کا فرزند جلال خاں آبائی میراث کا مالک بنا ۔ تغلقوں کے آخری دور میں سلطان تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا ۔ جس میں دہلی کو لوٹا گیا ۔ اور وہاں قتل عام بھی ہوا ۔ تیمور نے مراجعت کے وقت سید خضر خاں حاکمِ ملتان کو اپنا نائب بنا دیا تھا ۔ اسی بنا پر خضر خاں تغلقوں کے آخری سلطان محمود کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کا دعویٰ دار ہوا ۔ اور اس نے دولت خاں لودھی کو شکست دے کر مرکز ہند میں حکومت سادات کی بنیاد رکھی ۔

سید خضر خاں سے جلال خاں کے تعلقات بہت اچھے تھے ۔ ایک اور روایت کے مطابق اس کے بیٹے حسین خاں ٹوانہ نے حصولِ تاج و تخت کی لڑائیوں میں بھی خضر خاں کا ساتھ

---

[1] "تحفہ امیر" صفحہ ۶ ۔

دیا تھا - اور وہ دوسری لڑائیوں میں بھی شریک رہا - بہر حال جلال خاں اور حسین خاں کی زندگی فی الجملہ اطمینان سے گزری۔

کہا جاتا ہے کہ ضلع شاہ پور میں ادکھلی موہلا کی آبادی حسین خاں کے فرزند میر عالی خاں نے قائم کی تھی۔ "تحفۂ امیر" سے واضح ہوتا ہے - کہ واں کیلا اور ادکھلی موہلا کی آبادیاں پہلے سے موجود تھیں حسین خاں کے زمانے میں انہیں بہت رونق نصیب ہوئی - وہ شکار کا شوقین تھا - اپنی زندگی تھل اور دندہ میں بسر کر کے وہیں وفات پائی[1]

لیپل گرفن کا بیان

ہم نے جس داستان کو اس تفصیل سے بیان کیا - لیپل گرفن نے اسے صرف دو فقروں میں ختم کر دیا ہے - یعنی یہ کہ ٹوانے پندرھویں صدی کے اختتام سے پیشتر پنجاب پہنچے - اسلام قبول کیا اور دریائے سندھ کے کنارے جہانگیر میں آباد ہوئے - جہاں وہ میر عالی خاں کے زمانے تک مقیم رہے[2]

اس بیان کا ماخذ بھی یقیناً وہی ہے - جس سے "تحفۂ امیر" نے فائدہ اٹھایا - لیکن گرفن کا دائرہ تحریر محدود تھا وہ پنجاب کے تمام رؤسا کے حالات اختصاراً لکھنا چاہتا تھا۔ اور ٹوانوں یا کسی دوسرے خاندان کے تعلق میں تفصیلات کا سلسلہ شروع نہ کر سکتا تھا۔

تبصرہ

جو کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے - اسے یقین و وثوق کا وہ درجہ تو نہیں دیا جا سکتا - جو مسلمہ تاریخی واقعات کو حاصل ہے اتاہم یہ خاندانی روایات زیادہ سے زیادہ قرین

---

[1] "تحفۂ امیر" صہ ۶۲ - [2] لیپل گرفن جلد دوم صہ ۱۹۲

قبول ہیں اور کسی تاریخی واقعے کے خلاف نہیں۔ہم نے اس طویل مدّت کے مسلّمہ تاریخی واقعات کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا۔ اس کے بعدانہیں معرضِ بیاں میں لائے۔اب ہم ایسے دور میں پہنچ گئے ہیں، جس کے متعلق کسی قدر زیادہ تاریخی روشنی ملتی ہے۔ البتہ سنین کا معاملہ خاصا پریشان کن ہے۔ اگرہم یہ سمجھیں کہ رائے میلو کی وفات ۱۲۵۹ء میں ہوئی تو رائے کرن جہان سے ٹوانہ کا سلسلہ نسب چلا نویں صدی عیسوی میں گذرا ہو گا۔ اسی طرح حسین خاں کا عہد جو رائے میلو کی نویں پشت میں تھا۔ سولھویں صدی کے اوئل میں ہونا چاہیئے۔ لیکن گرفن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سترھویں صدی کے نصف آخر میں گذرا ہے۔ اس معاملے میں قیاس سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔ ہم نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے۔ کہ قیاس زیادہ سے زیادہ معقول و مستند ہو اور اس میں کوئی ضروری تاریخی پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے

جنرل صاحب کا بیان

سب سے آخر میں یہاں جنرل عمر حیات خاں مرحوم کا بیان درج کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے خود نوشت سوانح عمری کے آغاز میں اختصاراً تحریر فرمایا تھا۔ یہ بیان نہ مفصّل ہے اور نہ اس میں تاریخی حوالے دیئے گئے ہیں۔ تاہم اس سے مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔ کہ خاندانی روائتیں ابتداء سے وہی تھیں، جکا مرقع اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

جنرل صاحب فرماتے ہیں:

یہ خاندان چندر بنسی ہے۔ جو وسط ہند سے آیا اور اُسنے

پٹیالہ میں قیام کیا، جہاں ٹوانوں کے بہت سے گاؤں ہیں اور وہ ابھی سکھ ہیں۔

"خاندان کا ایک حصّہ اسلامی پنجاب کیطرف بڑھا اور اس نے پاک پٹن میں مسلمان ہونے کا شرف پایا۔ پھر وہ جنگلوں میں سے ہوتا ہوا جھنگ پہنچا، اور اپنے سیال بھائیوں کو وہاں چھوڑ کر دریائے سندھ اور جہلم کے دوآبے میں آباد ہوا۔

علاقہ ریگستانی تھا۔ اور دشوار گذار، آمدنی کم تھی اس لئے حکومت پنجاب نے اس کیطرف کم دھیان دیا اور ٹوانے اس علاقہ پر کم و بیش قابض رہے زیادہ دولت کے باعث لوگ آرام طلب، عیش پسند اور کمزور ہو جاتے ہیں، لیکن ٹوانوں نے دولت کے باوجود اپنی سرگرمیاں نہ چھوڑیں، وہ بدستور جنگجو اور اعلیٰ سوار رہے۔ دور دراز کے علاقوں میں لوٹ مار کے باعث اُن کی سپہ گری قائم رہی۔ اس وجہ سے ان پر حملے بھی ہوئے۔ جب بڑی فوج مقابلے پر آجاتی تو وہ ریگستان کے اندر چلے جاتے، جہاں پانی اور خوراک کی قلت کے باعث بڑی فوج نہ جا سکتی تھی اور نہ لمبا عرصہ رہ سکتی تھی۔ جونہی اس کی تعداد کم ہوتی یہ ریگستان کے اندر سے نکل کر اسے تباہ کر دیتے

اس بیان سے ظاہر ہے کہ پورا خاندان یا قبیلہ رائے میلو کے ساتھ نہ تھا۔ کچھ لوگ اس علاقے میں ٹھہر گئے جہاں بعد میں ریاست پٹیالہ قائم ہوئی۔ وہ ہندو ہی رہے بعد ازاں سکھ ہو گئے اور اب بھی موجود ہیں۔

چوتھا باب

میر عالی خاں

مرکز کی تبدیلی

ٹوانے رائے میلو کے وقت سے ٹھٹھہ ٹوانہ میں مقیم تھے۔ میر عالی خاں کے وقت میں یہ مرکز ترک کرنا پڑا۔ ترک کے صحیح وجوہ معلوم نہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ یہ ترک میر عالی خاں کے روحانی پیشوا کی خواہش کے مطابق عمل میں آیا۔ وہ حسب حکم مشرق کی طرف چل پڑا اور اس علاقے میں پہنچا جو ونده کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام ادکھلی موہلا رکھا۔ ہم قوموں کے علاوہ دوسری قوموں کے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔[1]

"تحفہ امیر" کا یہ بیان ہم نقل کر چکے ہیں، کہ کیلا، بھچر[2] اور ادکھلی موہلا

[1] "لیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۲ [2] اب نام واں بھچراں ہے۔

وغیرہ بستیاں رائے مبلو کے فرزند ٹیٹو کے زمانے میں آباد ہو چکی تھیں ۔

تبدیلی کی وجوہ

اصل سوال یہ نہیں کہ بستیاں پہلے سے موجود تھیں۔ یا میر عالی نے آباد کیں ؟ موجود تھیں تو اُن کی حیثیت کیا تھی اور میر عالی کے عہد میں وہ کس درجے پر پہنچ گئیں ؟ اصل سوال یہ ہے کہ پہلا مرکز کیوں چھوڑا گیا۔ جہاں ٹوانہ خاندان کم وبیش تین سو سال گذار چکا تھا ؟ محض مرشد کی ایما تو ایسی چیز نہیں کہ دل اسپر مطمئن ہو جائے ۔ تحفہ امیر" نے وجہ یہ بتائی ہے کہ بابر نے ہندوستان پر پیش قدمی کی تو ایک فوج ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے راستے بھی بھیجی تھی۔ ملتان کے لودھی صوبہ دار نے دریائے سندھ پر اس کا مقابلہ کیا۔ میر عالی خان بھی صوبہ دار کے ہمراہ تھا ۔ بابر نے یہ سن کر کمک کیلئے تازہ دم فوج بھیجدی ۔ صوبہ دار بھاگ نکلا ۔ اور بابر کے مقابلے کا پورا الزام میر عالی خاں پر عائد ہوا ۔ اس کا مرکز ٹھٹھہ ٹوانہ بابر کے حکم سے برباد کر دیا گیا ' اور میر عالی خاں کیلئے دوسری پناہ تلاش کرنے کے سوا چارہ نہ رہا [1]

تاریخی حقائق

یہ بیان تاریخی نقطۂ نگاہ سے قطعاً قابل قبول نہیں اس لئے کہ ۔

۱۔ بابر نے ہندوستان پر متعدد حملے کئے ' لیکن ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی طرف فوج بھیجنے کا کوئی ذکر موجود نہیں اور اس کے مفصل حالات سامنے رکھ لئے جائیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ اسطرف کوئی فوج نہ بھیجی گئی ۔

---

[1] "تحفۂ امیر" ص ۹۳

۲- لودھیوں کی سلطنت میں ملتان شامل نہ تھا، لہذا اُن کی طرف سے ملتان میں کسی صوبہ دار کا تقرر خارج از بحث ہے۔

۳- جس زمانے میں بابر کو دولت خاں لودھی حاکم پنجاب نے دعوت دیکر بلایا تھا۔ اُس زمانے میں سندھ کے بادشاہ شاہ حسین ارغون نے خود بابر کے ایما سے ملتان پر حملہ کر دیا تھا۔ شدید محاصرے کے بعد شہر فتح ہوا۔ اور کم و بیش دو سال شاہ حسین ارغون کے ماتحت رہا۔ پھر وہاں کے ایک مقامی سردار نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ جب اسے شاہ حسین کے مقابلے کی ہمت نظر نہ آئی۔ تو اس نے غالباً ۱۵۲۸ء میں ملتان کو بابر کے حوالے کر دیا۔ شاہ حسین ارغون اپنے آپ کو بابر کا متوسل قرار دیتا تھا۔ اس نے بھی بادل خواستہ یا ناخواستہ اس نذر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

غرض تاریخی لحاظ سے "تحفہ امیر" کا بیان ناقابل قبول ہے۔ ممکن ہے ٹھٹھہ ڈانہ کی سکونت کسی مقامی کشمکش کے باعث چھوڑی گئی۔ مثلاً بلوچ پڑوسیوں یا افغانوں سے ایسی لڑائیاں پیش آئیں کہ میر عالی خاں کیلئے وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ لہذا وہ مشرق سمت میں ایک محفوظ تر مقام پر آ بیٹھا۔ اگر وہ بابر کے زیر عتاب آ جانے کے باعث فرار اختیار کرتا تو مغرب کی طرف جاتا۔ مشرق کی طرف آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اپنے آپ کو بابر کی گرفت میں دے دیتا۔

عالی خاں کی سرگذشت

"تحفۂ امیر" نے میر عالی خاں کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان کی کیفیت درج ذیل ہے۔

۱ - وہ والد کی وفات کے وقت صرف چودہ سال کا تھا - یعنی بہت چھوٹی عمر میں اسے سرداری کا منصب مل گیا -

۲ - وہ ٹھٹھہ ٹوانہ کے مرکز کو چھوڑ کر ادکھلی موہلا میں آباد ہوا - خواہ یہ آبادی پہلے سے موجود تھی - اور میر عالی خاں کے عہد میں اسے خاص شہرت و عظمت حاصل ہوئی خواہ اس کی بنیاد ہی میر عالی خاں نے رکھی -

۳ - نئے مرکز میں اطمینان سے بیٹھ کر میر عالی نے بہت جلد اپنی فوجی قوت درست کر لی ، پھر حاکم ملتان سے تعلقات بڑھا کر ونده کی حکومت کا پروانہ حاصل کر لیا - اس سلسلے میں دریا خاں کا علاقہ ٹوانوں کے ہاتھ سے نکل کر رئیس منکیرہ کے قبضے میں چلا گیا - اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھٹھہ ٹوانہ کا ترک مقامی کشمکش کا نتیجہ تھا - اغلب ہے ، منکیرہ کے رئیس نے زور و قوت سے میر عالی خاں کا علاقہ دبا لیا ہو ، ورنہ سرداری کا نیا پروانہ حاصل کرتے وقت اس علاقے سے دست برداری کیوں اختیار کی جاتی - ؟

۴ - میر عالی خاں کو خوشاب ساہی وال اور گروٹ کے سرداروں نیز اعوانوں سے لڑائیاں پیش آئیں - ایک لڑائی میں اعوانوں کا مشہور سالار جنگ خاں اور دوسرے بڑے بڑے سردار قتل ہوئے -

۵ - جنڈاں والا کی طرف سے افغان ٹوانوں کے علاقے پر ترکتازیں کرتے رہتے تھے - میر عالی خاں نے ادکھلی موہلا کی حفاظت کیلئے - جنوبی و مغربی سمت میں کوٹ آدھی آباد کیا -

۶ - میر عالی خاں کے سواروں نے بہت سے علاقے

قبضہ کر لیا۔ ادکھلی موہلا کے مشرق میں شیخو اور بجار کے نام سے دو بستیاں قائم کیں، جس میں زراعت پیشہ لوگ بسائے۔

یہ بھی لکھا ہے کہ شیر شاہ کو تھل کے علاقے میں اور دریائے سندھ کے کنارے پر جو لڑائیاں پیش آئیں - ان میں میر عالی خاں نے رسد کے علاوہ فوجی امداد بھی دی۔[1] ان لڑائیوں کا کوئی سراغ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا اور شیر شاہ کبھی اس علاقے میں نہیں گیا۔

ممکن ہے، یہ معمولی مقامی کشمکشیں ہوں، جنہیں شیر شاہ سے منسوب کر دیا گیا۔ بہرحال میر عالی خاں کی زندگی بڑے اطمینان سے گذری۔

حدودِ جاگیر

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے کی نیّت سے آیا تو میر عالی خاں کی جاگیر کے حدود یہ تھے۔

سمت مشرق۔

دریائے جہلم، شیخوداں، خوشاب، اور داں بولا۔

سمت مغرب۔

گوڑکوٹ اور گندیاں۔

سمت جنوب۔

جنڈاں والا اور ماڑی[2]۔

سمت شمال۔

کوہ سون کا دامن۔

---

[1] تحفۂ امیر، صفحہ ۶۳ و ۶۴۔ [2] یہ وہ ماڑی نہیں جو کالا باغ کے سامنے ہے بلکہ دوسرا مقام ہے۔

ٹوانوں کا ذریعہ معاش زمینیں تھیں اور اس سلسلے میں مویشی بھی کثرت سے پال رکھے تھے۔ میر عالی خاں نے اپنی جاگیر میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی آبادیاں قائم کر دیں اور مختلف لوگوں کو مویشیوں کے ساتھ ان میں بٹھا دیا تاکہ چرائی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ کہا جاتا ہے کہ وڑچھا کے مقام پر نمک کی کھدائی بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی[۱]۔

وفات اور اخلاق

"تحفۂ امیر" کا بیان ہے کہ میر عالی خاں نے ایک سو انیس سال کی عمر پائی۔ اتنی لمبی عمر آج بے شک غیر معمولی سمجھی جائے۔ لیکن تعجب انگیز قطعاً نہیں۔ اس بنا پر سمجھنا چاہیے کہ وہ سترھویں صدی کے اوئل تک زندہ تھا۔ ممکن ہے اس روایت میں مبالغہ ہو۔ خود "تحفۂ امیر" کا ایک اور بیان اس کے خلاف ہے۔ یعنی لکھا ہے کہ میر عالی خاں کے بیٹے میر احمد خاں نے ۱۵۸۰ء میں مٹھا ٹوانہ آباد کیا[۲]۔ اگر میر عالی خاں کی عمر ایک سو انیس سال کی تھی تو ماننا چاہیے کہ وہ ۱۵۸۰ء کے بہت دیر بعد تک زندہ رہا۔ لہذا مٹھا ٹوانہ کی آبادی اسی سے منسوب ہونی چاہیے اگر یہ آبادی میر احمد خاں سے منسوب کی جائے، اور اس کی تاریخ قیام ۱۵۸۰ء مانی جائے تو میر عالی خاں کی عمر ایک سو انیس سال کی نہیں ہو سکتی۔

بہر حال سنین کی الجھنیں اس درجہ پریشان کن ہیں کہ انہیں سلجھانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ تاہم یہ مان لینے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ میر عالی خاں نے بہت لمبی عمر پائی۔

"تحفۂ امیر" کا بیان درست ہے تو میر عالی خاں اخلاق و اوصاف

---

[۱] "تحفۂ امیر" صفحہ ۶۵۔ [۲] "تحفۂ امیر" صفحہ ۶۶

کے لحاظ سے ٹوانوں میں بے مثال سردار گذرا ہے۔ وہ علم و فضل اور عقل و دانش میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ حلیم الطبع، مدبر اور بہادر سردار تھا۔ اپنے والد کے تمام ساتھیوں کی انتہائی قدر و منزلت کرتا تھا۔ فیاضی اور حسن اخلاق میں بھی اس دور کا کوئی شخص اس کا ہم پایہ نہ تھا۔

ٹوانوں کی تربیت

ٹوانے حلقہ بگوشِ اسلام بننے سے پیشتر بھی شمشیر زنی، نیزہ بازی، اور شہسواری میں ممتاز مانے جاتے تھے۔ چونکہ اس دور میں سرداروں کو اکثر لڑائیوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اس لئے فنون جنگ میں سب کو مشق بہم پہنچانی پڑتی تھی۔ میر عالی خاں نے اپنے ہم قوموں کیلئے ان فنون کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور انہیں مہارت حاصل کرنے کی بہت ترغیب دی۔ اس وقت سے ٹوانے شہسواری اور نیزہ بازی میں خاص شہرت و امتیاز کے مالک بن گئے۔ ان کے زیبا لباسوں اور طرہ دار پگڑیوں کو دیکھ کر ہر ایک پر رعب طاری ہو جاتا تھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تو سب سے الگ اور نمایاں نظر آتے۔ ان کی یہ شان انگریزوں کے آخری عہد تک جاری رہی۔ اگرچہ آج ان فنون کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور ان کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی، تاہم ٹوانے اسپ سواری اور نیزہ بازی میں آج بھی سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور سواری کے شوق میں وہ گھوڑے بھی خوب پالتے ہیں۔

ملک کا خطاب

کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ سوری نے میر عالی خاں کے فوجی دستوں کی سواری اور نیزہ بازی کے کمالات دیکھے، تو خوش ہو کر میر کو ملک کا خطاب دیدیا جو ٹوانوں کا عام لقب بن گیا

میرے نزدیک یہ بیان محلِ نظر ہے، پنجاب کی مختلف قوموں نے مختلف حصّوں میں اپنے لئے جو لقب تجویز کئے، ان میں سے لقب "ملک" بھی ہے، مثلاً لاہور کے ککّے زئی شمالی و مغربی، پنجاب کے اعوان نیز ٹوانے عموماً ملک ہی کہلاتے ہیں، دوآبہ بست جالندھر میں اعوانوں کو چودھری کہتے ہیں، اور ملک کا لقب گھٹیا درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ ستلج پار کے اعوان "میاں" کہلاتے ہیں۔ لاہور کے ارائیوں کا لقب بھی "میاں" ہی ہے۔ قیاس یہی ہے کہ ٹوانے جس علاقے میں مقیم ہو گئے تھے، اس میں ملک کا لقب بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ یہی لقب انہوں نے اپنے لئے تجویز کر لیا، اور یہی لقب اعوانوں کو پسندیدہ معلوم ہوا۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی واضح رہے، کہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں تمام بڑے بڑے سردار عموماً ملک کہلاتے تھے۔ ممکن ہے اس وجہ سے "ملک" اور "سردار" مترادف بن گئے ہوں۔

پانچواں باب

ملک میر احمد خاں

بھائیوں کی کشمکش

میر عالی خاں کے دو فرزند تھے ! بڑا حامد خاں اور چھوٹا میر احمد خاں۔ حامد خاں سادہ مزاج تھا اور اسے انتظامی امور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں احمد خاں بڑا لائق، ہوشیار اور ہونہار تھا۔ جاگیر کے حسن انتظام کا تقاضہ یہی تھا کہ اسی کو جانشینی کے لئے منتخب کیا جاتا۔ میر عالی خاں نے بھی غور و فکر کے بعد اسی کی جانشینی کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے مشیران

خاص کو اس بارے میں وصیت کر دی۔ چنانچہ وہ لوگ اوکھلی موہلا میں میر عالی خاں کے کفن دفن سے فارغ ہوئے تو برادری کو جمع کر کے مرحوم کی وصیت کے مطابق ملک میر احمد خاں کے سر سرداری کی دستار باندھ دی۔

حامد خاں کو طبعاً یہ گوارا نہ ہو سکتا تھا کہ اس کی جگہ چھوٹا بھائی سردار بن جائے۔ لیکن وہ خاندان کے بزرگوں اور مشیروں کی متفقہ رائے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکا، البتہ کچھ مدت بعد چند کوتاہ اندیش رفیقوں نے کہہ سُن کر اسے مخالفت پر آمادہ کر دیا اور رعایا میں سے بھی بعض طبقے اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ غالباً اُن سے کچھ رعایتوں کے وعدے کر لئے گئے ہوں گے۔ بہرحال کندیوں نے اور بھچروں نے حامد خاں کا ساتھ دیا۔ ملک میر احمد خاں نے یہ دیکھتے ہی ان کی ایسی سرکوبی کی کہ انہیں ہتھیار ڈالنے اور ہار مان لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ حامد خاں گرفتار ہو گیا اور اسے اوکھلی موہلا میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں باقی عمر نظر بندی میں گذاری۔ اس کے دو بیٹے تھے: رانجھا خاں اور فتح محمد خاں، ان کا ذکر موقع پر آئیگا۔

بھائی نے جو کشمکش بپا کی تھی، وہ یوں ختم ہوئی تو ملک میر احمد خاں کو جنڈاں والا کے افغانوں اور خوشاب کے سرداروں سے بھی لڑائیاں کرنی پڑیں، تمام لڑائیوں میں ملک میر احمد خاں کو کامیابی حاصل ہوتی رہی۔

مٹھا ٹوانہ کی آبادی "پیپل گرفن" اور "تحفۂ امیر" دونوں کے بیان کے مطابق مٹھا ٹوانہ کی بنیاد

ملک میر احمد خاں نے رکھی[1]۔ لیکن دونوں کی تاریخوں میں پورے ایک سو سال کا فرق ہے۔ گرفن کے نزدیک یہ ۱۶۸۰ء کا واقعہ ہے، اور تحفۂ امیر کے نزدیک ۱۵۸۰ء کا۔ ان میں سے کسی بھی تاریخ کو درست ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ملک میر احمد خاں کے اسلاف کے متعلق جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے "تحفۂ امیر" کی تاریخ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، لیکن ملک میر احمد خاں کے اخلاف کی سرگذشت سامنے رکھی جاتے۔ تو "پیپل گرفن" کا بیان صحیح نظر آتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ جگہ آبادی کے لئے بہت موزوں تھی۔ ادکھلی موہلا سے یہ تقریباً پانچ کوس یا سات میل مشرق میں واقع ہے۔ یہاں سب سے پہلے ایک کنوآں کھودا گیا۔ اس لئے کہ کنوئیں کے بغیر آبادی ممکن نہ تھی۔ خلافِ معمول اس کا پانی بہت میٹھا نکلا۔ میٹھے کو پنجابی میں مٹھا کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے آبادی کا نام "مٹھا ٹوانہ" مشہور ہوا۔ یعنی ٹوانوں کا وہ مرکزی مقام جس کا پانی میٹھا ہے۔

اس علاقے میں ٹوانوں کے علاوہ بھی بہت سے گروہ آباد تھے۔ مٹھا ٹوانہ کی آبادی قائم ہوئی۔ تو اکثر نے یہاں بھی گھر بار بنا لئے۔

اعوانوں سے خونریز جنگ

ملک میر احمد خاں کو اعوانوں سے ایک نہایت خوفناک

---

[1] "پیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۲۔ "تحفۂ امیر" صفحہ ۶۶۔

اور خونریز جنگ پیش آئی۔ وہی سب سے بڑے اور طاقتور حریف تھے۔ اس جنگ کی کہانیاں مقامی لوگوں کو اب تک یاد ہیں۔ صحیح تفصیلات تو معلوم نہیں۔ قیاس یہ ہے دونوں طرف سے لڑنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ وہ خوب لڑے۔ آخر اعوانوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اور وہ شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ بھاگنے والوں میں اعوانوں کا مشہور سردار شاہ نواز خاں بھی تھا۔ جو اکثر ہم قوموں کو ٹوانوں کے خلاف لڑائی کی غرض سے اشتعال دیتا رہتا تھا۔

لڑائی اس میدان میں ہوئی تھی، جو مٹھا ٹوانہ سے شمال مشرق میں کوئی پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں مدت تک مقتولوں کی ہڈیاں نظر آتی رہیں۔ اس وجہ سے میدان کا نام "ہڈاں والا" مشہور ہو گیا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

میر احمد خاں نے اعوانوں کی ان بڑی بڑی آبادیوں پر قبضہ کر لیا جو پہاڑ کے دامن میں واقع تھیں۔ مثلاً بھیٔ، چنکھی، کنڈ، نلی، نارڑی۔

حفاظت کے انتظامات

یہ معرکہ سر کر لینے کے بعد میر احمد خاں کی شہرت اور دبدبہ و شکوہ میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ارد گرد کے تمام رئیس اس سے دبنے لگے، تاہم یہ امر نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ کہ مخالفین کسی بھی وقت ساز باز کر کے حملہ

آور ہو سکتے ہیں اور ان سے غافل نہ رہنا چاہیے ۔ اس غرض سے ملک میر احمد خاں نے حفاظت کے خاص انتظامات کر دیئے ۔ مثلاً اپنے علاقے میں گشت کے لیئے ایک لشکر مقرر کر دیا ۔ جو سرحدوں کی دیکھ بھال کرتا رہتا ۔ مٹھا ٹوانہ کے ارد گرد ایسی آبادیاں قائم کر دیں، جو دفاعی چوکیوں کا کام دیتی تھیں ۔ مثلاً بولا، ہڈالی، بوتالہ، ردڈا، بلو، کوٹ، چسو ۔ ان میں فوجی آدمی بھی بٹھا دیئے ۔ اور کاشتکار بھی بسا دیتے تاکہ بیک وقت دشمنوں کا مقابلہ بھی ہوتا رہے ۔ اور کھیتی باڑی میں بھی خلل نہ آئے، جس کے بغیر لوگوں کیلئے گزارے کی کوئی صورت نہ تھی اور آبادی کا طریقہ بھی یہی تھا ۔ کہ ایک ایک چپے کو زیر کاشت لایا جاتا ۔ ہڈالی دراصل مندیالوں منتیالوں اور ٹوانوں کے دوسرے قبیلوں کی بستی تھی ۔ ہڈاں والا کے قریب ہونے کے باعث اس کا نام ہڈالی پڑ گیا ۔ بعد میں یہ ٹوانوں کی ایک شاخ کا مرکز بن گیا ۔ بوتالہ میں میر احمد خاں نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قطب خاں کو حفاظتی دستے کا سردار مقرر کیا تھا ۔ اس قطب خاں سے ٹوانوں کی دو مشہور شاخیں چلیں ۔ ایک کا نام حسنال ہے، دوسری کا قطبی، یہ دونوں شاخیں ہموکا اور بوتالہ میں مقیم ہیں ۔ ؎

؎ "تحفہ امیر" صد ۶۷ ۔

آخری دور

ملک میر احمد خاں نے باقی زندگی بڑے اطمینان سے گذاری۔ اس نے اپنے بھتیجوں یعنی حامد خاں کے دونوں بیٹوں "رانجھا خاں" اور فتح محمد خاں کیلئے مناسب گذارے کا انتظام کر دیا تھا۔ اور وہ چچا کے ماتحت فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ البتہ میر احمد خاں کی وفات کے بعد انہوں نے سرکشی اختیار کی، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

کہا جاتا ہے کہ میر احمد خاں ملتان کے صوبہ دار کو کچھ رقم بطور خراج بھی دیا کرتا تھا۔ اس کی صحیح کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ اس زمانے کا عام طریقہ یہی تھا۔ کہ جاگیریں فوجی خدمات کی غرض سے ملا کرتی تھیں۔ یعنی ضرورت کے وقت ہر جاگیر دار سواروں اور پیادوں کی ایک خاص تعداد ساتھ لے کر حاکم اعلیٰ کی خدمت میں پہنچ جاتا تھا۔ اور جو فرض اس کے ذمے لگا دیا جاتا تھا۔ اسے پورا کرنا تھا۔ ممکن ہے ملتان کے حاکم نے ملک میر احمد خاں کے ذمے کچھ رقم بھی لگا دی ہو۔

"تحفۂ امیر" کا بیان ہے۔ کہ ملک میر احمد خاں نے ایک سو برس کی عمر پائی۔ وفات کے بعد وہ مٹھا ٹوانہ میں دفن ہوا۔ نہایت خلیق اور بہادر سردار تھا۔ اس کی قبر اب تک محفوظ ہے [1]

---

[1] "تحفۂ امیر" صفحہ ۶۸

اولاد ملک میر احمد خاں کے پانچ فرزند تھے، ملک اللہ داد خاں، عرف ملک دادو، بکھو خاں امیر خاں، اللہ یار خاں، اور علی خاں - ملک اللہ داد خاں عمر میں بھی سب سے بڑا تھا - عقل و دانش اور انتظامی امور میں بھی اسے نمایاں فوقیت حاصل تھی - لہذا اسی کے سر پہ سرداری کی دستار باندھی گئی -

چھٹا باب

ملک اللہ داد خاں

ملک اللہ داد کا عہد

ملک اللہ داد خاں عموماً ملک دادو کے نام سے مشہور ہے اور پنجاب کا عام قاعدہ یہی ہے کہ وہ ناموں کو پیار سے یا پکارنے میں آسانی کی بنا پر مخفف کر لیتے ہیں۔ اس کی سرداری کا زمانہ چنداں اہم نہیں۔ کچھ لڑائیاں پیش آئیں، جن کی سرسری کیفیت آگے بیان کی جائے گی۔ پھر اس کے بیٹوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اسی میں ملک اللہ داد خاں کا عہد بیت گیا اور اسی میں اس کی جان بھی گئی۔

مٹھا ٹوانہ کی شام

پورب کی تاریخ میں "صبح بنارس" اور "شامِ اودھ" کو خاص شہرت حاصل ہے۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ بنارس اور اودھ یا اجودھیا ہندوں کے نہایت مقدس مذہبی مقام ہیں۔ بنارس میں صبح کے وقت ہزاروں آدمی دریا پر نہاتے اور پوجا میں مشغول ہوتے تھے۔ اس وجہ سے صبح کا منظر بہت ہی دلکش ہوتا تھا۔ اجودھیا میں غالباً شام کے وقت پوجا پاٹ کا زور ہوتا تھا، اس وجہ سے دونوں مقاموں کی

صبح اور شام نے شہرت حاصل کر لی ۔ "تحفۂ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں مٹھا ٹوانہ کی شام بھی ملک بھر میں مشہور ہوگئی تھی۔[1]

ملک اللہ داد نے اپنے والد کے کھدوائے ہوئے کنوئیں کو پختہ بنوا دیا تھا۔ غروبِ آفتاب کے وقت سینکڑوں آدمی اس کنوئیں پر جمع ہو جاتے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ، کشیدہ قامت، خوش وضع اور خوش پوش، لشکریوں کی چہل پہل اور عام لوگوں کے ہجوم کے باعث ایسی رونق پیدا ہو جاتی تھی جو اس خطّے میں بے مثال تھی۔ کنواں میٹھے پانی کی وجہ سے بہت مشہور تھا اور سب لوگ وہاں کھچے چلے آتے تھے۔ اب وہ رونق اور چہل پہل باقی نہیں رہی۔

حامد خاں کے فرزندوں کی سرکشی

ملک میر احمد خاں کے بڑے بھائی حامد خاں کے فرزند رانجھا خاں اور فتح محمد خاں چچا کی زندگی میں تو اس کے مطیع و فرمانبردار رہے۔ ملک اللہ داد خاں کا زمانہ آیا تو وہ سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ ممکن ہے، مختلف قوموں کے سرغنوں نے انہیں مخالفت پر آمادہ کر دیا ہو۔ حامد خاں کو بھچرّوں اور گُنڈیوں نے مدد دی تھی۔ رانجھا خاں اور فتح محمد خاں کی امداد کیلئے بھچرّوں اور گنڈیوں کے علاوہ بندیال اور شیخ بھی تیار ہو گئے۔ ملک اللہ داد خاں نے بڑی ہمّت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا اور تمام سرکشوں کو بزورِ شمشیر دبا دیا۔ رانجھا خاں اور فتح محمّد خاں نے یہ حالت دیکھکر راہِ فرار اختیار کر لی۔ پھر انہیں کوئی فتنہ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔[2]

متفرق لڑائیاں

چچیرے بھائیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر ملک اللہ داد خاں اپنی جاگیر کے انتظام میں لگ گیا۔ اس نے تمام بستیوں کی رونق بڑھائی۔ تقریباً ہر مقام پر پختہ کنوئیں بنوا

---

[1] "تحفۃ الامیر" صـ ۶۸ ۔ [2] "تحفۃ الامیر" صـ ۶۹ ۔

دیئے تاکہ عام لوگوں کو پینے کیلئے پانی حاصل کرتے ہیں کوئی دقت پیش نہ آئے ۔ اس کے حالات میں چند لڑائیوں کا بھی ذکر ہے ، جن کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی ۔

۱۔ خوشاب کے بلوچ سردار سے لڑائی پیش آئی جس میں ملک اللہ داد خاں کو کامیابی حاصل ہوئی ۔

۲۔ جنڈاں والہ کے پٹھانوں سے کئی مرتبہ لڑائی پیش آئی ۔ آخر فریقین نے صلح کر لی ، اور دونوں جاگیروں کے درمیان حد بندی کا انتظام ہو گیا تاکہ آئندہ کسی کو دوسرے کے علاقے میں مداخلت کا موقع نہ مل سکے[1] ۔

بیٹوں سے کشمکش

معلوم ہوتا ہے کہ ملک اللہ داد خاں نے دو شادیاں کی تھیں ۔ پہلی بیوی حسن خاں حسنال کی بیٹی تھی ، جس سے دو فرزند ہوئے ! ملک شیر خاں ، ملک عالم شیر خاں ، دوسری شادی وسادا خاں بھچر کی بیٹی سے کی ، جس کے بطن سے چار فرزند ہوئے ، پہاڑ خاں ، اللہ یار خاں عرف یارو خاں ، جہان خاں ، اور فتح خاں ، پھر ایک مرتبہ اس کے فرزند شیر خاں نے ساہی وال اور گروٹ کے رئیسوں پر فوج کشی کی اور شاندار فتح پائی ، وہ بہت سے قیدی پکڑ کر لایا ۔ ان میں ایک جوان عورت تھی ، جسکا خاوند لڑائی میں قتل ہو چکا تھا ۔ ملک اللہ داد خاں نے عدت گزرنے کے بعد اس سے بھی نکاح کر لیا ۔ غالباً اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی ۔

فتح کا آغاز

غالباً ملک اللہ داد خاں کی دوسری بیوی (وسادا خاں بھچر کی صاحبزادی) کو سب سے زیادہ اقتدار حاصل تھا ۔ اُس نے اس غرض سے جوڑ توڑ شروع کر دیئے کہ ملک شیر خاں کی جگہ

---

[1] تحفۂ امیر ۔ ص ۶۹

خود اس کے بیٹے پہاڑ خاں کو جانشین بنایا جائے ، اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔ کہ ملک اللہ داد خاں کے متوسل دو فریقوں میں بٹ جاتے ۔ یہی ہوا ایک فریق ملک شیر خاں کا ساتھی بن گیا ۔ دوسرا فریق پہاڑ خاں کی طرف داری کرنے لگا ۔ "تحفۂ امیر" کے بیان کے مطابق ملک اللہ داد خاں کے سامنے معاملے کو اس رنگ میں پیش کیا گیا کہ شیر خاں پہاڑ خاں کو قتل کر دینا چاہتا ہے ، ملک اللہ داد خاں نے بھائیوں میں اتفاق کرا دیا۔

مگر اندرونی کینہ بدستور قائم رہا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک شیر خاں اور عالم شیر خاں مع اقوام حسنال و مستیال و مندیال وغیرہ اور پہاڑ خاں اور اس کے ساتھی بندیال ، بھچر وغیرہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے ۔ ملک دادو (ملک اللہ داد خاں) نے پہاڑ خاں کا طرف دار ہو کر اپنے بیٹے شیر خاں کو مٹھا ٹوانہ سے نکال دیا[1]

شیر خاں کی جدوجہد

شیر خاں مٹھا ٹوانہ سے باہر نکل گیا اور اسے یقین سا ہو گیا کہ اب اس کی جگہ پہاڑ خاں صاحب دستار بن جائے گا ۔ اس نے والد سے صلح کیلئے کئی کوششیں کیں ، لیکن کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوئی تو آخر بزور شمشیر اپنا حق منوانے کا فیصلہ کر لیا اور مٹھا ٹوانہ پر حملہ کر دیا ۔ جب دیکھا کہ یوں کامیابی مشکل ہے تو سیالوں کے پاس چلا گیا ۔ کہ شاید ان سے مدد مل سکے ۔ ادھر سیال مدد دینے کیلئے تیار نہ ہوئے ، ادھر اس کے ساتھیوں میں مندیال اور مستیال پہاڑ خاں سے مل گئے ۔ گویا شیر خاں کی رہی سہی امیدوں پہ بھی پانی پھر گیا ۔

آخری اقدام

مایوسی کی حالت میں شیر خاں کے پاس جو تھوڑی سی جمعیت رہ گئی تھی ، اس میں میر خاں اور نور محمد خاں حسنال

[1] "تحفۂ امیر" صـ

ہی سر برآوردہ تھے ۔ شیر خاں اسی جمعیت کو لے کر مٹھا ٹوانہ چلا آیا اور قصبے کے جنوب میں گڑگج والی مسجد کی جگہ ایک خام قلعہ بنوا کر رہنے لگا ۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ملک اللہ داد خاں نے اس کی واپسی کس بنا پر برداشت کر لی ؟

بہر حال وہ باپ کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی جمعیت بڑھاتا رہا ۔ پھر ایک دفعہ باپ پر حملہ کر دیا جس میں شیر خاں کو کامیابی ہوئی ۔ ملک اللہ داد خاں اور اس کا بھائی مارے گئے ۔ پہاڑ خاں بھاگ گیا ۔ تین روز تک مقتولین کی لاشیں میدان میں پڑی رہیں ۔ پھر انہیں مٹھا ٹوانہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا[1] ۔

لیپل گرفن کا بیان

لیپل گرفن نے تفصیلات بیان نہیں کیں اور حالات کی سرسری کیفیت پیش کر دی ہے ۔ وہ لکھتا ہے : ۔

> شیر خاں بے قاعدگی سے سردار بنا ۔ وہ اپنے والد کے سخت گیر طرز حکومت سے غیر مطمئن تھا ۔ اپنے بھائی عالم شیر کے ساتھ اس نے سرکشی اختیار کر لی ۔ پہلے اپنے چچا میر خاں کو قتل کیا پھر (مٹھا ٹوانہ کے) قلعے کی فصیل سے ایک چپقلش میں اپنے والد کو موت کے گھاٹ اتار دیا[2] ۔

"تحفۂ امیر" سے ملک اللہ داد خاں کی سخت گیری کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھائیوں کی کشمکش نے نازک حالت

---

[1] "تحفۂ امیر" صفحہ ۔ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے ۔ کہ ملک اللہ داد خاں کے ساتھ اس کا بھائی فتح خاں مارا گیا ۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ ملک اللہ داد خاں کے کسی بھائی کا نام فتح خاں نہ تھا ۔ لیپل گرفن نے مقتول بھائی کا نام میر خاں لکھا ہے اور یہی صحیح ہے ۔ [2] لیپل گرفن جلد دوم صہ ۱۹۲

پیدا کی ۔ ملک اللہ داد خاں نے اس کے انسداد کا جو طریقہ اختیار کیا ، وہ صحیح نہ تھا اور ملک شیر خاں اضطراب کی حالت میں اس راستے پر ہو لیا ۔ جو سعادت مند فرزند کے لئے ہرگز زیبا نہ تھا، لیکن سرداری، ریاست اور بادشاہی میں حدود کا لحاظ بہت کم رکھا جاتا ہے ۔ بعض اوقات جائز ذاتی حفاظت کے پیشِ نظر ایسی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں جن کا نتیجہ امید و توقع سے کہیں زیادہ دردناک صورت اختیار کر جاتا ہے ۔

ساتواں باب

ملک شیر خاں

مخالفوں کی سرکوبی

ملک شیر خاں والد کی زندگی میں بھی کئی لڑائیاں فتح کر چکا تھا۔ اور والد سے لڑ کر ہی اس نے سرداری حاصل کی تھی۔ دستار بندی کے بعد اس نے اپنے بھائی عالم شیر خاں کو بندیال، بھچر وغیرہ قوموں کی سرکوبی پر مامور کیا اور خود پہاڑ خاں اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ پہاڑ خاں کے حامی زیادہ تر میتال اور منڈیال تھے۔ اور ڈھالی کی طرف ان کا زور تھا۔ ملک شیر خاں نے بڑے بڑے سرکشوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پہاڑ خاں نے موضع جوبا میں پناہ لی جو دریائے جہلم کے کنارے واقع تھا۔ آخر پہاڑ خاں کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ شیر خاں نے اسے جوبا ہی میں بٹھا دیا اور اس کے لئے مناسب گزارہ مقرر کر دیا۔ ان لڑائیوں میں منڈیال قوم کا مشہور سردار شیر خاں بھی مارا گیا، جو ملک اللہ داد خاں کے زمانے میں بہت طاقت ور بن گیا تھا[1]

[1] تحفۂ امیر ص۷۱

بھائیوں کی یک جہتی

ملک شیر خاں اور عالم شیر خاں نے جس اتحاد اور یک جہتی سے عمر گذاری، وہ ایک ایسا نمایاں واقعہ تھا کہ لیپل گرفن نے اس کا خاص ذکر ضروری سمجھا[۱]۔ اسی اتحاد کی برکت تھی کہ ٹوانوں کی جاگیروں کے حدود خاصے وسیع ہو گئے۔ دامن کوہ کی زمینیں زیادہ زرخیز تھیں اور انہیں میں غلہ بہ افراط پیدا ہوتا تھا۔ یہ سب اعوانوں، بھچروں اور گندیوں کے قبضے میں تھیں۔ ملک عالم شیر کی زندگی انہیں قوموں سے لڑتے بھڑتے گذر گئی۔ اور اس نے تمام اچھی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ ملک شیر خاں اور ملک عالم شیر خاں نے :۔

اعوانوں سے زمینیں چھین کر اپنے علاقے میں معتدبہ اضافہ کر لیا۔ ورچھا اور دامن کوہ کے دوسرے علاقوں پر بھی وہ قابض ہو گئے[۲]۔

مقامی لڑائیاں زیادہ تر اس وجہ سے پیش آتی رہیں کہ مغلیہ سلطنت پر زوال و ابتری کا دور طاری ہو چکا تھا۔ نواب عبدالصمد خاں، دلیر جنگ اور نواب زکریا خاں کے بعد پنجاب کا انتظامی نقشہ بہت بگڑ گیا تھا۔ بیرونی حملوں نے انتظام کی رہی سہی ساکھ ختم کر دی تھی۔ اور مقامی امیر و رئیس صرف قوت بازو کے بل پر اپنی حیثیت بحال و برقرار رکھ سکتے تھے۔

نور پور کا استحکام

۱۷۹۵ء میں ملک شیر خاں نے نور پور نام ایک آبادی کی ترقی پر خاص توجہ مبذول کی۔ جو مٹھا ٹوانہ سے اٹھارہ کوس جنوب مائل بہ غرب میں واقع تھی۔ یہ مقام اس لحاظ سے بہ طور خاص اہم سمجھا جاتا تھا۔ کہ منکیرہ اور جنڈاں والا دونوں کی طرف سے حملے کی حالت میں ایک مضبوط دفاعی مورچے کا کام دے سکتا تھا۔

---

[۱] لیپل گرفن، جلد دوم ص۱۹۲۔ [۲] ایضاً ایضاً۔

بارش کے سیلابوں کا مقابلہ بھی یہاں سے بخوبی ہو سکتا تھا۔ ملک شیر خاں نے یہاں ایک کوٹ تعمیر کرایا۔ اس میں فوج کا ایک دستہ رکھا۔ اِدھر اُدھر سے لوگوں کو لا کر آباد کیا۔ پھر اس کے اردگرد سترہ چھوٹی چھوٹی آبادیاں قائم کر دیں، جنہیں پنجاب کی اصطلاح میں جھوک کہتے ہیں اور اپنے بھائی محمد عالم شیر خاں کو نور پور کے لشکر کا سردار مقرر کیا۔

ادائے خراج سے انکار

معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل کامیابیوں نے شیر خاں کے دل میں خود مختاری کا جذبہ پیدا کر دیا اور ملکی انتظام کی ابتری کے پیشِ نظر اس قسم کا خیال پیدا ہونا تعجب انگریز نہ تھا۔ لیپل گرفن کا بیان ہے:-

شیر خاں نے اب اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھ لیا۔ کہ ٹوانے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے حاکم کو جو خراج ادا کرتے رہے تھے، اس سے انکار کر دے۔ چنانچہ اس کے بھائی نے ان فوجوں پر حملہ کر دیا جو خراج وصول کرنے کیلئے بھیجی گئی تھیں اور اپنا کام پورا کر کے واپس جا رہی تھیں۔ یہ حملہ اچانک ہوا تھا، اس لئے فوجوں نے شکست کھائی اور ان کا سالار مارا گیا۔[۱]

"تحفۂ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں اس زمانے میں ملتان کے ماتحت تھا۔ اور ٹوانوں کا علاقہ ڈیرہ سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ جو فوجی دستہ خراج وصول کرنے کیلئے آیا تھا۔ اس کے سالار کا نام محمد اکبر خاں تھا۔ یہ دستہ مٹھا ٹوانہ پہنچا تو ملک شیر خاں نے ادائے اخراج سے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں عالم شیر خاں بھی بھائی سے ملنے کیلئے آیا ہوا تھا۔ اس نے:-

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ترک سواروں پر حملہ کر دیا اور ان کے

---

[۱] لیپل گرفن، جلد دوم صفحہ ۱۹۲ و ۱۹۳۔

افسر محمد اکبر خاں کو قتل کر کے باقی سواروں کو جنڈاں والہ کی طرف بھگا دیا۔ صوبہ دار ملتان کو اس سانحہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے بدلہ لینے کیلئے منکیرہ اور جنڈاں والہ کی فوج کو ٹوانہ پر تعینات کیا۔[۱]

اس مشترکہ فوج نے نور پور پر حملہ کیا، جو دونوں مقاموں کے قریب تھا۔ عالم شیر خاں مردانہ وار لڑا اور صوبہ دار ملتان کی فوج کو بہت بُری طرح شکست دی۔ اس فتح نے ٹوانوں کی دھاک اردگرد کے علاقے میں ہر جگہ بٹھا دی۔

سیالوں سے جنگ

"تحفۂ امیر" کی روایت ہے کہ صوبہ دار ملتان کی فوج کو شکست دے چکنے کے بعد ملک شیر خاں نے سیالوں کے سردار عنائت اللہ خاں پر حملہ کر دیا۔ ماڑی اس سے چھین لی۔ کوٹ کھائی اور کوٹ لنگر خاں کا محاصرہ کر لیا۔ عنائت خان نے زبردست لشکر تیار کر کے کوٹ کھائی اور کوٹ لنگر خاں کو واپس لے لیا۔ البتہ ماڑی ملک شیر خاں کے قبضہ میں رہی۔[۲]

"پیپل گرفن" کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عنایت اللہ خاں سیال نے ماڑی صوبہ دار ملتان سے چھینی تھی۔ لیکن انتظام کی غرض سے اسے ملک شیر خاں کے حوالے کر دیا، اور کچھ رقم بھی دینی منظور کی جو باقاعدہ ادا نہ ہوتی تھی۔

شیر خاں نے یہ سوچا کہ رقم بزور حاصل کرے۔ اس نے قبیلے کے لوگوں کو جمع کیا۔ سیالوں کو کوٹ کھائی سے باہر نکالا اور کوٹ لنگر خاں کا محاصرہ کر لیا۔ عنایت خاں کوٹ کو محاصرے سے آزاد کرانے کیلئے بڑھا اور اس کی دیواروں کے سامنے،

۱۔ "تحفۂ امیر" ص۲۷۔ ۲۔ ایضاً ایضاً۔

ٹوانوں کو زبردست شکست دی[1]

"جھنگ گزیٹیر" سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عنایت اللہ خاں نے پرگنہ ماڑی کو محفوظ رکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ سوچا کہ شیر خاں ٹوانہ کو کچھ رقم بطور رشوت دیتا رہے۔ آگے چل کر اس نے رقم دینی بند کر دی۔ شیر خاں نے اپنے قبیلے کو جمع کر کے کھائی پر حملہ کر دیا۔ جو ضلع جھنگ کے موجودہ حدود سے چند میل شمال میں دریائے جہلم کے دائیں کنارے واقع ہے۔ سیالوں کو کھائی سے نکال کر شیر خاں نے کوٹ لنگر کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں عنایت اللہ نے مقابلہ کیا اور ٹوانوں کو شکست دے دی[2]۔

بہر حال جو واقعات اوپر بیان ہو چکے ہیں، ان کے متعلق شبہ کی گنجائش نہیں وجوہ و تفصیلات کے بارے میں اختلاف اصل واقعات پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

نواب منکیرہ سے لڑائی

اس اثناء میں ملتان کے صوبہ دار نے نواب حافظ محمد خان کو منکیرہ کا حاکم بنا دیا۔ اس نے دو آبہ سندھ کے پار کوہ وزیرستان تک بڑی قابلیت سے حکمرانی کا آغاز کیا۔ منکیرہ کی حفاظت کیلئے اس نے گردو پیش متعدد قلعے تعمیر کئے۔ مثلاً خانسر، کلورکوٹ، دنگھانہ، حیدر آباد، موج گڑھ، فتح پور، بھکر دریا خاں، چوبارہ، اور لیہ، ان تمام قلعوں میں افغانی فوج متعین کر دی۔ پھر صوبہ دار ملتان کے ایما کے مطابق ملک شیر خاں ٹوانہ پر حملہ کر دیا، ملک شیر خاں نے حافظ محمد خاں کا شدید مقابلہ کیا۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی، ملک شیر خاں کے علاقے کی حدیں مقرر کر دی گئیں۔ مشرق میں دریائے جہلم، شمال میں سون سکیسر، مغرب میں کنڈیاں اور جنوب میں نورپور

---

[1] امپیریل گزٹیر جلد دوم صفحہ ۱۹۳ ۔ [2] جھنگ گزٹیر مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۶

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ادائے خراج کے متعلق کیا فیصلہ ہوا۔

عالم شیر کی وفات

جس زمانے میں ملک شیر خاں حاکم منکیرہ سے لڑ رہا تھا۔ بھچڑوں اور کنڈیوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ ملک شیر خاں نے اپنے بھائی عالم شیر خاں کو فوج دیکر ان کی سرکوبی کیلئے روانہ کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عالم شیر خاں کے پاس فوج بہت کم تھی۔ لیکن وہ جوش تہور میں آگے بڑھتا گیا، دشمن نے اسے نرغے میں لے لیا اور اسی حالت میں وہ مارا گیا۔

اس اثنا میں حاکم منکیرہ سے شیر خاں کی صلح ہو گئی تھی۔ اور وہ لشکر جرار لے کر بھچڑوں اور کنڈیوں پر جوش و غیظ میں حملہ آور ہوا۔ ہزاروں لوگ تہ تیغ کئے۔ جو بچ رہے، ان سے بھاری "تاوان" لے کر جان بخشی کی۔

ملک شیر خاں کی وفات

ملک عالم شیر خاں کی وفات سے ملک شیر خاں کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ اسی وقت سے بیمار رہنے لگا۔ پھر کبھی جنگ میں شریک نہ ہوا۔ علاقے کا انتظام اس نے اپنے فرزندوں ملک خان محمد خاں اور ملک خان بیگ خاں کے حوالے کر دیا۔ ملک خان محمد کو نور پور میں بٹھایا اور خان بیگ خاں کو مٹھا ٹوانہ میں۔

ایک روز ملک شیر خاں اس میگزین کا ملاحظہ کر رہا تھا، جس میں اسلحہ کے علاوہ بارود بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک ملازم کی بے احتیاطی سے بارود کو آگ لگ گئی اور میگزین بھک سے اڑ گیا۔ اسی حادثے میں ملک شیر خاں، اس کے چند رفیق اور سپاہی جل کر فوت ہو گئے یہ ۱۶۷۰ء کا واقعہ ہے[1]

آخر میں "شاہ پور ڈسٹرکٹ گزٹیئر" کا بیان درج کر دینا ضروری ہے، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک شیر خاں کے عہد میں جاگیر کتنی

---

[1] "تحفۂ امیر" صفحہ ۳۰-۴۳۔ "پیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۳۔

وسیع تھی ۔

بیان مظہر ہے ۔

دریائے جہلم کے پار ٹوانے ملک شیر خاں کی سرداری میں نور پور اور گردو نواح کے مالک بن گئے ۔ گل جہانیاں ساکن دہیچھا کی وفات کے بعد انہوں نے سلسلہ کوہِ نمک کے کے اعواؤں پر بھی جزوی اقتدار قائم کر لیا ۔ شیخو وال اور متعدد دوسرے گاؤں جو دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع تھے ۔ انہوں نے ساہی وال کے بلوچ رئیس سے چھین لئے، لیکن ملک شیر خاں خوشاب کو مسخر کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔[1]

---

[1] شاہ پور گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۸ء صفحہ ۲۶

آٹھواں باب

ملک خان محمد خاں

ابتدائی دور

گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ ملک شیر خاں نے زندگی ہی میں جاگیر کا انتظام دونوں بیٹوں کو سونپ دیا تھا۔ بڑے بیٹے خان محمد خاں کا مرکز نور پور مقرر کر دیا اور چھوٹے بیٹے ملک خان بیگ خاں کا مٹھا ٹوانہ۔

ملک شیر خاں کی تاریخ وفات "ٔپیل گرفن" کے بیان کے مطابق ۱۷۶۷ء ہے۔ اسی سال سے ملک خان محمد خاں کی سرداری کا آغاز سمجھنا چاہیے "تحفہ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔ گویا وہ کم و بیش اٹھاون سال قوم کا سردار رہا[1]

---

[1] تحفۂ امیر صفحہ ۹۴ کتاب مذکورہ میں بتایا گیا ہے کہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۲ء میں ملک خان محمد خان کو ایک جاگیر عطا کی تھی اور ماگھ سمت ۱۸۸۲ (۱۸۲۵ء) میں اس نے وفات پائی۔ تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔

یہ پوری مدّت لڑائیوں میں بسر ہوئی ۔ ارد گرد کے سرداروں سے جدال وقتال کا ہنگامہ گرم رہا اور سکھوں سے بھی مقابلے پیش آئے جو پنجاب پر قابض ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ اپنے اثر و اقتدار کا دائرہ بڑھا رہے تھے ۔ ان لڑائیوں کی تفصیلات مختلف کتابوں میں ایسے طریق پر پیش کی گئی ہیں کہ ان میں موافقت کی کوئی موزون صورت ذہن میں ۔ نہیں آتی ۔ ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مختلف تصانیف میں جو کچھ درج ہے، اسے پیش کرتے جائیں ۔ ساتھ ساتھ مستند تاریخی واقعات کی روشنی میں اندازہ کرتے رہیں کہ کونسا بیان قابلِ قبول یا قرینِ قیاس ہے ۔

لیپل گرفن کا بیان

ابتدائی حالات کے متعلق لیپل گرفن کا بیان بہت مختصر ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ خان محمد خان کو سب سے پہلے حسان و میتال قبیلوں کی بغاوت سے سابقہ پڑا، جو بھوکر اور ڈالی میں آباد تھے ۔ یہ بغاوت فرو کرنے کے بعد ۔

> وہ اپنے ہم قوموں سے ملنے کیلئے جھنگ چلا گیا ۔ اور مٹھا ٹوانہ کو اپنے بھائی کے حوالے کر گیا ۔ واپس آیا تو مٹھا ٹوانہ کے دروازے اسپر بند تھے اور اس کے بھائی کو سردار تسلیم کیا جا چکا تھا ۔ ناچار وہ نور پور ٹوانہ چلا گیا ۔ وہاں ایک فوج تیار کی، خان بیگ خان پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دیکر قید میں ڈال دیا، لیکن بہت جلد رہا کر دیا کیونکہ اس نے آئندہ کیلئے فرمانبرداری کا عہد کر لیا تھا[1]۔

بھائیوں میں اختلاف کا سبب

"لیپل گرفن" نے بھائیوں میں اختلاف کا سبب کوئی نہیں بتایا ۔ "تحفہ امیر" میں اختلاف کی وجہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے ۔ جو بہت معقول

---

[1] "لیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۳ ۔

معلوم ہوتی ہے۔

یاد ہو گا کہ ملک اللہ داد خاں نے آخری زمانے میں نون خاندان کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی، جو سیاہی وال اور گروٹ کی جنگوں میں ہاتھ آئی تھی۔ اس کا خاوند لڑائی میں مارا جا چکا تھا۔ دو خورد سال بچے اس کے ساتھ تھے۔ جن کی پرورش ٹوانوں میں ہی ہوئی۔ ٹوانے سردار اس خاتون اور اس کے بیٹوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بڑے بیٹے سپاہی خاں نون کے فرزند نور محمدؐ خاں کو ملک شیر خاں کی بیٹی اور ملک خان محمد خاں کی بہن منسوب کر دی گئی۔ یوں نور محمد خاں نون ٹوانوں کا ہم خاندان بن گیا۔

وہ اس علاقے کا ناظم بنایا گیا تھا۔ جس میں وڑچھا کی کان نمک واقع تھی۔ نور محمد خاں نے موقع پا کر بہت سا نمک مختلف اطراف میں بہ غرض تجارت بھیج دیا اور اس سے جو روپیہ وصول ہوا، اس کا اندراج نہ کیا۔ ملک خان بیگ خاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو خفا ہو کر نمک ضبط کر لیا اور اسے مٹھا ٹوانہ بلا لیا۔ وہ ملک خان محمد خاں کے پاس نور پور چلا گیا۔ اور ایسے طریقہ پر باتیں کیں۔ جس سے بھائیوں میں کشیدگی کا آغاز ہوا۔ بلکہ کہا جاتا ہے نور محمد خاں نے خان محمد خاں کے بیٹوں احمد یار خاں اور چراغ خاں کو بھی نفاق آمیز باتوں میں اپنا ہم نوا بنا لیا اور انہیں یہ سمجھایا کہ اگر خان بیگ کے خلاف کوئی موثر قدم نہ اٹھایا گیا تو مٹھا ٹوانہ اسی کی اولاد کے قبضے میں رہے گا اور تم لوگ سرداری سے بے دخل کر دیئے جاؤ گے

بس یہیں سے اختلاف شروع ہوا، ملک خان محمد خاں نے بھائی کو لکھ بھیجا کہ مٹھا ٹوانہ مجھے ملنا چاہیے۔ خان بیگ خاں کے انکار پر لڑائی ناگزیر ہو گئی۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ دونوں طرف غرض مند

لوگ اشتعال انگیزی کر رہے تھے۔ اور نور محمد خان نون نے جو آگ بھڑکائی تھی اسے فرو نہ ہونے دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ خان بیگ خاں مٹھا ٹوانہ کے جنوب میں پھر رہا تھا۔ سلطان خان ماحل، سلطان خان رتیال وغیرہ بہت سے آدمی ساتھ تھے۔ اچانک ملک خان محمد خاں جمعیت کثیر کے ساتھ ان پر آ پڑا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد خان بیگ خان پکڑا گیا اور اسے نور پور میں نظر بند کر دیا گیا۔ بعض معزز اصحاب نے بیچ بچاؤ کر کے بھائیوں میں صلح کرا دی اور پہلے کی طرح خان بیگ خاں اور خان محمد خان اتحاد و اتفاق سے جاگیر کا انتظام کرتے رہے[1]۔

نصرت خاں ہوت کی بغاوت

پنجاب اور کشمیر احمد شاہ ابدالی ہی کے زمانے میں افغان سلطنت کا جزو بن چکے تھے۔ ان کے گورنر اور مختلف حصوں کے ناظم دربار افغانستان سے مقرر ہو کر آتے تھے۔ غالباً زمان شاہ درانی کے عہد میں شاہ نذر خاں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا حاکم تھا۔ اور اسے نصرت خاں ہوت بلوچ قلعہ ددوے والا کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی، اس لئے کہ اس نے بغاوت اختیار کر لی تھی اور مقررہ خراج دینا بند کر دیا تھا۔ نصرت خاں خاصا طاقتور تھا، اس لئے شاہ نذر خاں نے ملک خان محمد خاں سے بھی مدد حاصل کی اور قلعہ ددوے والا پر حملہ کر کے نصرت خاں کو قید کر لیا۔ شاہ نذر خاں نے نصرت خاں کی سرکوبی کا ذکر کرتے ہوئے ملک خان محمد کی خدمات کو بھی نہایت کشادہ دلی سے سراہا۔ چنانچہ سنہ ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵-۹۶ء) میں زمان شاہ درانی نے ملک خان محمد خان کو شاہانہ خلعت اور پروانہ خوشنودی۔

---

[1] تحفۂ امیر کے مطابق جن معززین نے بیچ بچاؤ کیا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ شیر خاں اور نذیر خاں (چھتال)، طاہر خاں (دانگرا) مبارز خاں (رندیال)، کٹا خان (ٹوانہ)، گھیبا خان (میتال) ص ۵۵۔

عطا کیا۔ [1]

نواب منکیرہ کا حملہ

اس عہد میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ نواب محمد خاں والی منکیرہ نے اچانک خان محمد خاں کے مرکز نور پور پر حملہ کر دیا۔ ایک مہینہ سے بھی زیادہ محاصرہ جاری رہا۔ پھر اس کے اٹھوانے کا بندوبست ہوا۔[2]

تحفۂ امیر کا بیان ہے کہ حملہ ہرنولی پر ہوا تھا۔ والی منکیرہ کی پیادہ اور سوار فوج کے کمانڈار دریائی سنگھ پوربیا اور انور خاں خاکوانی تھے۔ ملک خان بیگ خان کو یہ اطلاع ملی تو جرار لشکر لے کر مقابلے کیلئے پہنچ گیا ملک خان محمد خان نے بھی بھائی کی امداد میں توقف نہ کیا۔ خان بیگ خان خان محمد خاں کے پہنچنے سے پیشتر والی منکیرہ کی فوج کو شکست دے کر فرار پر مجبور کر چکا تھا۔

جاگیر کا انتظام

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ خان بیگ خان اور خان محمد خان صرف لڑائیوں کے شائق نہ تھے۔ انہوں نے اپنی جاگیر میں جا بجا قلعے اور چوکیاں بنائیں تاکہ مختلف علاقوں کی حفاظت کا انتظام اچھے طریقہ پر ہوتا رہے۔ بدنظمی کا دور تھا۔ حکومت سے کسی قسم کی توقع نہ تھی۔ ہر سردار کو اپنی قوت بازو کے بل پر حریفوں کے حملے کی روک تھام کرنی پڑتی تھی۔ ٹوانہ بھائیوں نے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے۔ اپنی جاگیر کی تمام قوموں میں سے بہادر اور عقلمند لوگ مختلف حصوں کی سرداری کے لئے چن لئے۔ مثلاً نون، رتیال، منتیال، مندیال، بھچر، اترا، چاہل، اور شلولی۔[3] اس طرح تمام قومیں

---

[1] ۔ تحفۂ امیر" صفحہ تحفۂ امیر نے اس واقعہ کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔ گویا یہ خان محمد خاں کی سرداری کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ زمان شاہ ۱۷۹۳ء میں تخت نشین ہوا۔ ہوت خاں بلوچ کی بغاوت ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۶ء کے درمیان کا واقعہ ہونا چاہیئے۔

[2] گریفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۳۔ [3] امیر نامہ صفحہ ۷۶۔ [4] تحفۂ امیر" صفحہ ۶

ٹوانہ سرداروں کی وفادار و جان نثار بن گئیں۔

سردار خوشاب سے جنگ

خان محمد خاں کے تعلقات۔ خوشاب کے رئیس لال خاں سے بہت دوستانہ تھے۔ جب لال خاں کا بیٹا جعفر خاں ولی عہد بن گیا تو اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ خان محمد خان خوشاب کی سرداری چھیننے کے درپے ہے۔ چنانچہ خان محمد خان لال خاں سے ملنے کیلیے آیا۔ تو جعفر خاں نے اسے قتل کرنے کی سازش مکمل کر لی۔ خان محمد خاں خوش قسمتی سے بچ نکلا اور اس نے مٹھا ٹوانہ پہنچتے ہی خوشاب پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لال خاں اپنے بیٹے کی سازش سے بالکل بے خبر تھا۔ اسے حالات کا علم ہوا تو اپنے چھوٹے بیٹے عالم خاں اور اپنی بیوی نور بھری کو ساتھ لے کر اس غرض سے مٹھا ٹوانہ پہنچا کہ خان محمد خاں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا دے، موصوف نے مہمانداری کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا اور فوج لے کر خوشاب پر حملہ کر دیا۔ جعفر خاں کو بچاؤ کی اور کوئی تدبیر نہ سوجھی وہ شکور چکیا مسل کے سردار جہان سنگھ کے پاس امداد کیلئے پہنچا جو خان محمد خان کا بھی دوست تھا۔ جہاں سنگھ بھاری فوج لے کر آگیا، اور خان محمد خان کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس نے واپسی سے پہلے، لال خاں اور اس کے بیٹے اور اس کی بیوی کو توپ سے اڑا دیا۔[۱]

حالانکہ ان لوگوں کا قتل سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۔ پیپل گرفن جلد دوم صفحہ ۱۹۳۔ یہ واقعہ صرف گرفن نے بیان کیا ہے اور کسی کتاب میں اس کی طرف اشارہ تک موجود نہیں۔

نواں باب
سکھوں کی مداخلت

بھائیوں میں دوبارہ اختلاف

ملک خان محمد خاں اور اس کے بھائی خان بیگ خان میں پہلی مرتبہ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ تو خیر خواہوں نے کوشش سے اسے دور کر دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نور محمد خاں نون برابر لگائی بجھائی میں مصروف تھا۔ خان محمد خان کے بیٹوں میں سے ملک احمد یار خاں اور ملک چراغ خاں اس کے ہمنوا بن چکے تھے۔ لہذا بھائیوں میں دوبارہ بدگمانی اور تلخی کا آغاز ہو گیا۔ ملک خان بیگ خان کا مزاج بھی تیز تھا۔ اس نے معاملات کی اصلاح کی بجائے۔ خان محمد خان کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں ایک طرف خوشاب وساہی وال کے رئیسوں اور دائی منکیرہ سے گہرے تعلقات پیدا کرئے تاکہ ضرورت کے وقت ان سے مدد مل سکے۔ دوسری طرف بھچر' اور اترا قبیلوں کو نیز جسنال۔ مستیال اور منڈیال خاندانوں کو ساتھ ملا کر مقابلے کے لئے مستعد ہو گیا۔

ملک خان محمد خاں کو تنہا اس لاؤ لشکر سے عہدہ بر آ ہونے کی امید نظر نہ آئی۔ تو وہ اپنے پرانے دوست سردار مہان سنگھ کے پاس گوجرانوالہ چلا گیا تاکہ امداد حاصل کرے۔ کچھ امداد اس سے حاصل کی، کچھ جھنگ کے سیالوں سے، بایں ہمہ وہ خان بیگ خاں کے مقابلہ میں ناکام رہا۔ حالات ابھی کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچے تھے کہ مہان سنگھ فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ پر رنجیت سنگھ شکورچکیا مسل کا سردار بن گیا۔ جو چند ہی سال بعد پنجاب کا حکمران بننے والا تھا۔[1]

یہ سکھوں کی مداخلت کا آغاز تھا۔ جس نے آگے چل کر ٹوانوں کی مستقل حیثیت ختم کر دی۔ مہاں سنگھ کا انتقال ۱۷۹۲ء میں ہوا۔ لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ اس وقت تک اختلاف خاصی نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔

جاگیر کا اختلاف

تحفۂ امیر سے واضح ہوتا ہے کہ ان دنوں ملک خان بیگ خاں مٹھا ٹوانہ، ہڈالی تبالہ، بولا، ادکھلی موہلا، اترا، گنجال، بندیال، ہموکہ، جویا، دان بھچر، کوٹ احدی، ہرنوئی اور گندیاں تک نیز وڑچھا اور مقامات دامن کوہ جبی پر حکمران تھا۔ ملک خان محمد خان کے قبضے میں نور پور کے علاوہ تیئیس جوکیں تھیں۔ مثلاً رنگ پور راہداری، جمالی، ڈراڈی، لکو، چن دیس، ملبول، نواں سگو، ڈھمک، محمود شہید، جھر کل، جاٹا، سد، پلوان، ایز، شاہ والا، میکن، کھاٹوان، چھینا، گردٹ، مہا پور اور شیخو وال کے علاقے کا مالک مانا جاتا تھا۔ اس کے بیٹوں کے علاوہ نور محمد خاں نون اس کے حامی اور مؤید تھے۔[2]

اُنہی زمانے میں بارش نہ ہونے کے باعث قحط سالی نمودار ہوئی۔ ملک خان بیگ خاں نے اپنے جد امجد ملک اللہ داد خاں والے کوئیں

---

[1] تحفۂ امیر ص۷۲ - [2] تحفۂ امیر ص۶۸

کو آدمیوں اور جانوروں کے لئے کافی نہ سمجھتے ہوئے ایک اور کنواں کھدوا دیا۔

اس کا پانی بھی کافی میٹھا نکلا۔

رنجیت سنگھ کا دور ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہوا اور اس نے اپنی حکومت کا دائرہ بڑھانا شروع کیا۔ وسطی اور مغربی و شمالی پنجاب پر چھوٹے چھوٹے رئیس قابض تھے۔ اور ان میں باہم اتحاد نہ تھا بلکہ ایک دوسرے سے برابر لڑتے رہتے تھے۔ یہ حالات رنجیت سنگھ کے عزائم کے لئے بہت سازگار تھے۔ اسپر طرہ یہ ہوا کہ ملک خان محمد خاں خود رنجیت سنگھ کے پاس پہنچ گیا اور کہا کہ مجھے تھل اور ونده کا سردار مقرر کر دیجئے، میں خراج باقاعدہ ادا کرتا رہوں گا۔ میرے چار دشمن ہیں، ملک خان بیگ خاں، جعفر خاں بلوچ رئیس خوشاب، فتح خاں رئیس ساہی وال اور چراغ خان رئیس بھچراں۔ انہیں گرفتار کرا دیجئے میں فی کس ایک لاکھ روپے نذرانہ پیش کرونگا۔[۱]

ییپل گرفن کا بیان ہے کہ خان بیگ خاں نے گڑھ مہاراج کے سیال سردار رجب خاں، فتح خاں رئیس ساہی وال اور جعفر خاں رئیس خوشاب کی مدد سے بھائی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ مدت تک مدافعت کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ دشمن بہت طاقتور ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونا محال ہے۔ تو ۱۸۰۳ء میں رنجیت سنگھ سے امداد کی درخواست کی۔[۳]

---

[۱] تحفہ امیر ص۵۵ [۲] ایضاً ایضاً

[۳] ییپل گرفن جلد دوم ص۱۹۲

خان بیگ کی گرفتاری

سکھوں کی پہلی مداخلت سرسری تھی، لیکن رنجیت سنگھ کی مداخلت قبول کر کر لینے کے بعد اس سے بچ نکلنے کی تدبیر نہ تھی۔ افسوس کہ خان محمد خان نے نہ صرف یہ مداخلت قبول کی بلکہ اسے دعوت دے کر لے آیا۔

اس طرح وہ بے شبہ دشمنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ اپنی آزادی و خود مختاری اور جاگیر بھی کھو بیٹھا،

رنجیت سنگھ پورے علاقے پر قبضہ جمانے کا خواہاں تھا۔ اسے ملک خان محمد خان کی تجویز کامیابی کی کلید معلوم ہوئی۔ لہذا وہ تجویز فوراً قبول کر لی۔ آپس میں سمجھوتا یہ ہوا کہ رنجیت سنگھ کے خوشاب پہنچنے پر ملک خان محمد خاں سراسیمہ وار بھاگ جائے۔ ظاہر یہ کیا جائے۔ کہ وہ رنجیت سنگھ سے ہراساں ہے۔ یہ دیکھتے ہی اس کے دشمن رنجیت سنگھ کے پاس پہنچ جائیں گے اور انہیں بآسانی گرفتار کیا جا سکے گا۔

غرض اس سکیم پر عمل ہوا، ملک خان بیگ خاں نے رنجیت سنگھ کے پاس دربار میں حاضر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ فتح خاں رئیس ساہی وال اور جعفر خان رئیس خوشاب نے اسے بہت روکا۔ وہ نہ رکا۔ رنجیت سنگھ سے ملا۔ ظاہری سلوک بہت اچھا ہوا اور خاں بیگ خاں نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کر لیا۔

رنجیت سنگھ نے گرفتاری کی یہ سکیم سوچی کہ خان بیگ خاں کے ساتھ شکار کھیلنے کا شوق ظاہر کیا جائے اور

شکار کی حالت میں اس پر قابو پا لیا جائے۔ غرض خان بیگ خاں پکڑا گیا۔ ملک خان محمد خان نے حسب قرار داد ایک لاکھ روپیہ دیکر بھائی کو اپنے قبضے میں کر لیا اور اسے نورپور میں قید کر دیا۔ اس کے دونوں بیٹے خدایار خاں اور عالم شیر خاں بھی اس کے ساتھ تھے۔

خان بیگ خان کے ہمدردوں سے کہہ دیا کہ میرا خرچ کیا ہوا روپیہ مجھے دیدو اور خان بیگ خان کی اطاعت کا اقرار لے لو۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔

خان بیگ خان کا قتل

اس واقعے کے بعد خان محمد خاں نے اپنے فرزند چراغ خاں کو نور پور کا حاکم بنا دیا اور مٹھا ٹوانہ میں رہنے لگا۔

ملک پہاڑ خاں کے بیٹوں کٹا خاں اور میر باز خاں، شیر خاں اور نذیرا خاں حسنال، جعفر خاں میتال، مبارز خاں مندیال اور چراغ خاں بھچر نے دونوں بھائیوں میں صلح کرانے کی کوشش کی۔ جب دیکھا کہ ملک خان محمد خاں اس کے بیٹوں اور نور محمد خاں نون کے ارادے اچھے نہیں تو تمام سرداروں نے بغاوت کر دی اور بدنظمی پھیلا دی اور جگہ جگہ خونریزی شروع ہو گئی۔

اگر حالات ایسی نازک صورت اختیار نہ کرتے تو ممکن تھا۔ خان محمد خاں بھائی کو رہا کر دیتا۔ بغاوت و خونریزی کے باعث صورت حال بالکل بدل گئی۔ خان محمد خاں اب تنگ آکر رنجیت سنگھ کے پاس لاہور پہنچا۔ اس کے بیٹوں ملک احمد یار خاں اور چراغ خاں کو نور محمد خاں نون

نے یقین دلا رکھا تھا کہ اگر ملک خان بیگ خاں قید سے نکل گیا ۔ تو پھر تمہارے والد کیلئے اس ملک میں رہنے کی کوئی صورت نہ ہو گی ۔ چنانچہ انہوں نے والد کی غیر حاضری میں اپنے چچا کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھ لیا ۔ ایک روز خان بیگ عشا کی نماز ادا کر رہا تھا ۔ چراغ خاں اور نور محمد خاں نون اچانک اس پر جا پڑے ۔ اور اسی حالت میں مار ڈالا ۔ پھر اس کی میت کو نور پور سے مٹھا ٹوانہ لا کر دفن کر دیا ۔

ملک کی تادیبی اور اصلاحی کوشش

ملک خان محمد خاں نے واپسی پر بھائی کے قتل کی کیفیت سنی ۔ تو اسے بہت رنج پہنچا ۔ بیٹوں اور بہنوئی کو سخت ملامت کی ۔ جو سردار سرکشی اختیار کر چکے تھے ۔ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا ۔ کہ مقتول بھائی کے بیٹوں اور بیوہ کو راضی کرے ۔ چنانچہ انہیں نور پور سے مٹھا ٹوانہ بلا لیا ، خان بیگ خان کے دونوں بیٹے ۔ شیر خاں اور نذیرا خاں حسنال کے نواسے تھے ۔ حسنال سرداروں کو یقین دلایا کہ قتل میرے خلاف منشا ہوا ہے میں اپنے بھتیجوں کو بچوں کی طرح پرورش کرنے کیلئے تیار ہوں ۔ جس طرح چاہو ، اطمینان کر لو ۔ اس نے اپنے چچیرے بھائیوں کٹا خاں اور میر باز خاں سے اچھا سلوک کیا ، البتہ چراغ خاں بھچر ، جعفر خاں ، گھیبا خاں مستیال اور مبارز خاں مندیال بدستور سرکشی پر قائم رہے ۔ خان محمد خان نے جعفر خاں اور گھیبا خاں کو ساتھ ملا کر ہڈالی پر دھاوا

گیا اور وہاں پہنچ کر مبارز خاں نیز اس کے دو فرزندوں شاہ نواز خاں اور چراغ خاں کو قتل کر ڈالا ۔ اس کی بیوہ دو چھوٹے فرزندوں غلام حسین خاں اور غلام محمد خاں کو لے کر ہڈالی سے بھاگی اور سردار فتح خاں رئیس ساہی وال کے ہاں پناہ گزین ہوئی خان محمد خان نے جعفر خاں میتال کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس طرح وہ بھی ہم رائے بن گئے ۔ بندیال اور انزا سے بھی لڑائیاں ہوئیں ۔ چراغ خاں بھچر کے استیصال کیلئے خان محمد خان نے اپنے بیٹے احمد یار خاں کو مامور کیا ۔

بھتیجوں سے سلوک

غرض اگرچہ خان محمد خاں نے بھتیجوں سے حسن سلوک میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن انہیں اطمینان نہ ہوتا تھا ، چنانچہ ایک موقعہ پر دونوں بیٹے ان کی والدہ اور دادی وغیرہ موقع پا کر بھاگے اور ساہی وال میں سردار فتح خاں کے پاس پہنچ گئے جو ان کے والد کا پرانا دوست اور رفیق تھا ۔ خان محمد خاں کیلئے یہ خبر بہت رنج دہ تھی ، اس نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ بیٹی کی شادی بڑے بھتیجے خدا یار خاں سے کر دے ۔ رنجیت سنگھ کو بھی اس امر کا یقین دلا دیا چنانچہ اس نے اپنی بیٹی کو لشکر رسالے اور توپ خانے کے ہمراہ سامان جہیز دیکر رخصت کر دیا ۔ ملک احمد یار خاں ساتھ گیا ۔ شیخو وال دریائے جہلم پر پہنچ کر اس نے ہمشیرہ کی ڈولی اپنی سوتیلی دادی ، چچی، شیر خاں اور نذیرا خاں کے سپرد کر کے کشتی میں سوار کر دیا ، مشرقی کنارے پر خدا یار خاں (ابن خان بیگ خاں) ایک دستے کے ساتھ استقبال کیلئے موجود تھا ۔ اس طرح بے

اعتمادی آہستہ آہستہ دور ہوگئی ۔

والی منکیرہ کا حملہ

ایک مرتبہ والی منکیرہ نے نورپور پر حملہ کر دیا ۔ خان محمد خان کا بیٹا چراغ خان وہاں حاکم تھا ۔ وہ نشے کی حالت میں دیکھ بھال کرتا ہوا فصیل سے گر کر مرگیا ۔ خان محمد خان نے اپنے دو بیٹوں احمد یار خاں اور خدا یار خاں کو لشکر جرار کے ہمراہ مقابلے کیلئے بھیج دیا ۔ انہوں نے منکیرہ کی فوج کو شکست فاش دی اور بھائی کی لاش مٹھا ٹوانہ لا کر دفن کی ۔

رنجیت سنگھ سے اختلاف

"تحفہ امیر" کا بیان ہے کہ ۱۸۰۹ء میں شاہ شجاع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے راستے مٹھا ٹوانہ پہنچا تو خان محمد خان نے اس کی بہت خاطر مدارات کی اور حتی الوسع سواری اور بار برداری کیلئے امداد دی ۔ مالی امداد میں بھی دریغ نہ کیا ۔ پندرہ دن اپنے پاس مہمان رکھا ۔ پھر لشکر کے ہمراہ اسے رنجیت سنگھ کے پاس پہنچا دیا ۔ مشہور ہو گیا تھا کہ شاہ نے خان محمد خان کو ایک ایرانی تلوار اور ایک مشکی گھوڑا دیا ۔ رنجیت سنگھ نے دونوں چیزیں طلب کر لیں ۔ خان محمد خان نے مطالبہ پورا کر دیا ، لیکن رنجیت سنگھ کو یہ بتایا گیا کہ خان محمد خان نے اصلی چیزیں رکھ لیں اور نقلی بھیج دیں اس بنا پر ناراضی پیدا ہوئی ۔[1]

ممکن ہے ناراضگی کی یہ وجہ بھی ہو ، لیکن میرے اندازے کے مطابق اصل وجہ یہ تھی کہ ٹوانے ادائے خراج کے لئے

۱؎ شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ سے پہلی ملاقات خوشاب میں کی تھی ۔ ممکن ہے اس سے پیشتر وہ مٹھا ٹوانہ میں بھی مقیم رہا ہو لیکن اس کے لئے کوئی واضح شہادت نہ مل سکی ۔

آمادگی کے باوجود اپنی آزادی برقرار رکھنے پر تلے بیٹھے تھے ۔ کم وبیش یہی حالت دوسرے سرداروں کی تھی۔ رنجیت سنگھ اِس صورت حال کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹوانوں کا زور ٹوٹ جائے اور وہ بے بس ہو کر اس کا ساتھ دیں لہٰذا وہ ہر مناسب موقعہ سے فائدہ اٹھانے کو تیار رہتا تھا۔ ایسے ہی حالات میں رنجیت سنگھ نے مصر دیوان چند کو فوج دے کر ۱۸۱۶ء میں نور پور کی تسخیر کیلئے بھیج دیا۔ ٹوانوں نے زبردست مقابلہ کیا اور سکھ فوج کو شکست دیکر پیچھے ہٹا دیا، لیکن اس قسم کی کوئی شکست رنجیت سنگھ کے ارادے میں رکاوٹ نہ بن سکتی تھی۔ حملے جاری رہے جن میں بعض اوقات ٹوانوں نے شکستیں کھائیں اور بعض اوقات فتوحات حاصل کیں۔

احمد یار خاں کی دلاوری

پیپل گرفن نے لکھا ہے کہ خان محمد خاں کا فرزند احمد یار خاں باغی ہوگیا اس نے قبیلے کے لوگوں کو ساتھ ملا کر باپ کو سرداری سے دست برداری پر مجبور کیا۔ تحفۂ امیر کے بیان کے مطابق احمد یار خاں کو ایک مرتبہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ممکن ہے والد مجھے جانشین نہ بنائے لیکن خان محمد خان نے اسی کو جانشیں نامزد کیا اس نے تمام دشمن سرداروں سے ایسے رشتے پیدا کر لئے۔ کہ سابقہ تلخیاں بالکل مٹ گئیں۔ پھر وہ بڑی بہادری سے جابجا سکھوں کے خلاف ڈٹا رہا آخر رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوہ کو ٹوانوں کی سرکوبی کیلئے مقرر کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ باقی مختلف اطراف میں منتشر ہوگئے۔ صرف دو آدمی مٹھا ٹوانہ میں رہ گئے۔ دونوں خان محمد خاں کے

بیٹے تھے ۔ ایک عالم شیر خاں دوسرا فتح خاں ۔ خان محمد خاں ، اہل و عیال کو لے کر میانوالی اور بوٹ کیطرف چلا گیا ۔

جوابی حملے اور وفات

ہری سنگھ نے ٹوانوں کے علاقے میں بڑے ظلم کئے لیکن اسے بھی اطمینان نصیب نہ ہوا ۔ ٹوانے جہاں جہاں بیٹھے تھے ، وہاں سے اٹھ کر علاقوں پر ترکتازیں کرتے رہتے تھے ۔ سکھ فوج واپس ہوئی تو احمد یار خاں نے حملہ کرکے پورا علاقہ واپس لے لیا ۔ سکھ لوٹے تو قدم قدم پر لڑائیاں ہوئیں ، اور دوبارہ نکلنا پڑا ۔ غرض ٹوانے جاگیر سے تو بے دخل ہو گئے ، لیکن انہوں نے سکھوں کو چین نہ لینے دیا ۔ آخر رنجیت سنگھ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ انہیں نرمی سے مطمئن کرے ۔ چنانچہ ۱۸۲۲ء میں ملک خان محمد خاں کے لئے دس ہزار کی جاگیر میں بھادریاں ، چاچڑ ، بیدرحمن اور تعلقہ بھیرہ مقرر ہوئے ۔ ایک سو بار شتر نمک بھی ہر سال ملک کو بطور انعام دیا جاتا تھا ۔ یوں سکھ دربار سے تعلق پیدا ہوا ۔ ۱۸۲۵ء میں اس نے بمقام چاچڑ انتقال کیا اور مٹھا ٹوانہ میں دفن ہوا ۔

ٹوانوں سے اچھے برتاؤ کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ۱۸۲۱ء میں رنجیت سنگھ نے منکیرہ پر حملہ کیا تھا ۔ تو ٹوانوں نے اس حملے میں رنجیت سنگھ کو بہت امداد دی تھی ، خوش ہو کر رنجیت سنگھ نے ٹوانوں کو اپنی فوج میں بھی رکھ لیا ۔ اور ان کے لئے جاگیروں کا انتظام بھی کر دیا ۔

ملک احمد یار خاں

ملک خان محمد خاں کی وفات کے بعد ملک احمد یار خاں خاندان کا سردار بنا ۔ سکھ دربار

سے تعلق پیدا ہو چکا تھا - کچھ جاگیریں بھی مل چکی تھیں، لیکن جس علاقے پر وہ پہلے سے قابض چلے آتے تھے - وہ رنجیت سنگھ اپنے مشہور جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی جاگیر میں دے چکا تھا - ملک احمد یار خاں کا بھائی ملک خدا یار خاں اور بیٹا ملک قادر بخش براہ راست دربار سے وابستہ ہو چکے تھے - ملک خدا یار خاں کو رنجیت سنگھ نے اپنے خاص اصطبل کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا - اور ایک ہزار روپے سالانہ تنخواہ مقرر کر دی تھی.

ملک قادر بخش پچاس سواروں کا افسر تھا - اور اس نے ملتان کی مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیکر ناموری حاصل کر لی تھیں - کہا جاتا ہے کہ خدا یار خاں نے دھیان سنگھ وزیر اعظم اور گلاب سنگھ حاکم جموں سے گہرے تعلقات پیدا کر لئے تھے. امید پیدا ہو گئی تھی کہ ٹوانوں کی جاگیر انہیں مل جائے گی - لیکن ملک احمد یار خاں نے موضع بنگا تعلقہ ساہی وال میں وفات پائی، اور جاگیر کی واپسی کا معاملہ گو مگو میں پڑ گیا - اسے مٹھا ٹوانہ میں لا کر دفن کیا گیا

اس پر خاندان کی تاریخ کا پہلا حصہ ختم ہو گیا - دوسرا حصہ اس شخصیت کے حالات پر مشتمل ہے جو کارناموں کے لحاظ سے بہت اونچا مانا جاتا ہے - یعنی ملک فتح خاں، جو عام طور پر موتیاں والا کے لقب سے مشہور ہے -

دوسرا حصہ

پہلا باب

ملک فتح خاں ٹوانہ

تمہید سکھوں کے تصرف نے ٹوانوں کی وہ رئیسانہ حیثیت ختم کر دی تھی جو راجپوتانہ سے نکل کر پنجاب میں پہنچتے ہی انھیں حاصل ہو گئی تھی اور جس کی حفاظت یا توسیع کے لیے وہ برابر رزم و پیکار میں مشغول رہے۔ان کی ہمت و عزیمت میں کوئی فرق نہ آیا تھا، لیکن مصیبتوں کا بے پناہ سیل رک نہ سکا۔ بدلے ہوئے حالات میں نئی تدبیروں سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ قدرت نے اسی دور میں رہنمائی کے لیے ان میں ایک بہت بڑا آدمی پیدا کر دیا، جس نے نہ صرف خاندانی عظمت بحال کر دی بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ ملک فتح خاں ٹوانہ تھا۔ جو خان محمد خاں کا پوتا، احمد یار خاں کا بھتیجا اور خدا یار خاں کا بیٹا تھا اس کے گوناگوں کمالات کی شہادتیں وقت کے ممتاز انگریزوں نے بھی دی ہیں، جنھیں سامنے رکھ کر اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایسے شخص کو سازگار ماحول میں آزادی سے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو وہ ایک مستقل سلطنت کی بنیاد ڈال دیتا۔ اس کی پوری زندگی سکھ حکمرانوں کے ماتحت گزری، جن کا دربار فرقہ بندیوں اور سازش آرائیوں کی ایک عجیب و غریب پرورش گاہ تھا۔ ملک فتح خان نے اس فضا میں بھی اپنی ممتاز حیثیت بحال رکھی۔ اسی شخصیت کے کارناموں کی بدولت ٹوانوں کے اقبال کا ستارہ از سر نو چمکا اور انگریزی عہد میں بھی اس کی درخشانی بدستور قائم رہی۔ اس زمانے میں بھی ٹوانہ خاندان کے متعدد افراد نے بہت بلند کارنامے انجام دیے اور وہ ہمت جوانمردی، یا حسن تدبیر، دور اندیشی، معاملہ فہمی، اور کمال نظم و نسق میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے لیکن اس دور کی معززترین شخصیت ملک فتح خاں کے سوا کوئی نہیں۔ لہذا مرکزی حیثیت اسی کو حاصل ہے۔ باقی سب اس کے دست و بازو بنے رہے۔

خدا یار خاں

ہم بتا چکے ہیں کہ احمد یار خاں خاندان کا سردار تھا اور خدا یار خاں کو لاہور میں رنجیت سنگھ کے خاص اصطبل کا ناظم بنا دیا گیا تھا۔ احمد یار خاں کا فرزند اکبر ملک قادر بخش پچاس سواروں کے اُس دستے کا کماندار مقرر ہو گیا تھا جو رنجیت سنگھ کی خواہش پر ٹوانوں نے مرتب کیا تھا۔ احمد یار خاں فوت ہو گیا تو خدا یار خاں کو پہلے اڑھائی ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عنایت ہوئی۔ ۱۸۳۴ء میں اس جاگیر کا پروانہ بھی خدا یار خاں کو مل گیا جو اس کے والد ملک خان محمد خاں کے لیے دربار لاہور

سے مقرر ہوئی تھی ۔ ۱۸۳۶ء میں اس نے بمقام کوٹ آدھی وفات پائی اور مٹھا ٹوانہ میں اسے دفن کیا گیا[1]۔ اس کے متعلق زیادہ حالات معلوم نہیں ۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں ۔ کہ لاہور میں رہنے کی وجہ سے خدا یار خان نے بعض اصحاب سے گہرے تعلقات پیدا کر لیے تھے ، جنھیں دربار میں خاص احترام حاصل تھا ۔ ملک فتح خاں "موتیاں والا" اسی کا فرزند تھا ۔

جنرل صاحب کا بیان احمد یار خاں اور خدا یار خاں کے متعلق جنرل عمر حیات خاں مرحوم نے خود نوشت سوانح عمری میں بعض ایسی معلومات درج کی ہیں ۔ جو بڑی ہی قیمتی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہمارا خاندان پشت بہ پشت سپاہی اور حاکم رہا ۔ حکومت چلانے کا ڈھنگ اس کے خون میں شامل ہو چکا تھا ۔ حکومت کے ساتھ راہ و رسم پیدا ہوتے ہی سیاسیات میں بھی حصّہ لینا پڑا ۔ جب سکھ راج پنجاب میں پھیل گیا تو ٹوانوں کے نمایندے بھی لاہور میں رہنے لگے ۔ چنانچہ میرا دادا ملک احمد یار خاں لاہور گیا ۔ سنا جاتا ہے وہ نہایت خوبصورت تھا ۔ رنجیت سنگھ نے کہا اس کی آنکھیں خطرناک ہیں ۔ یہ کاروبار حکومت گھر ہی میں رہ کر کرے ۔ اس لیے وہ واپس گیا اور اپنے بھائی ملک خدا یار خاں کو حاضر باشی کے لیے لاہور روانہ کیا ۔ وہ بڑا شہ سوار تھا ۔ اس لیے مہاراجہ نے اپنا ذاتی اصطبل اس کے سپرد کر دیا ۔ وہ مہاراجہ کی ذاتی سواری کے گھوڑوں کو سدھاتا تھا اور ذاتی دوروں کا انتظام کرتا تھا ۔

---

[1] تحفۂ امیر ص ۹۵-۹۷

ملک فتح خاں

ملک فتح خاں کے ابتدائی حالات کہیں سے معلوم نہ ہو سکے۔ "پیپل گرفن" کا بیان ہے کہ ۱۸۳۷ء میں اسے ملک قادر بخش والے رسالے کی کمانداری میں شریک کر دیا گیا تھا[1]۔ "تحفہ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے ٹوانوں کے پہلے رسالے کی شان و زیبائش اور کارکردگی سے خوش ہو کر نیا رسالہ بھرتی کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ ملک خدا یار خاں نے اس حکم کی تعمیل میں جو رسالہ مرتب کیا، اس کا سالار اپنے بیٹے ملک فتح خاں کو بنا دیا[2]۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح سمجھی جائے۔ ممکن ہے، دونوں درست ہوں۔ اس لیے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ہو سکتا ہے، ابتدا میں ملک فتح خاں اپنے چچیرے بھائی ملک قادر بخش خاں کے ساتھ کام کرتا رہا ہو۔ جب دوسرا رسالہ بھرتی ہؤا تو وہ اپنی قابلیت کی بنا پر اس کا کماندار بن گیا۔

ٹوانوں کا علاقہ رنجیت سنگھ نے اپنے مشہور جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی جاگیر میں دے دیا تھا۔ اپنے علاقے میں ممتاز حیثیت پیدا کرنے کی شکل یہی تھی کہ ہری سنگھ نلوہ سے وابستگی اختیار کی جاتی۔ چنانچہ ملک فتح خاں ہری سنگھ نلوہ کی زندگی تک اسی سے وابستہ رہا اور جو جاگیریں اس زمانے میں اسے ملیں وہ ہری سنگھ ہی نے دی تھیں۔ دربار سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا[3]۔ "تحفہ امیر" سے واضح ہوتا ہے کہ ملک فتح خاں

---

[1] "پیپل گرفن" جلد دوم ص ۱۹۵
[2] "تحفہ امیر" ص ۹۶
[3] " " " ص ۱۹۵

کو قدیم علاقے کی نگرانی کا پہلا پٹا ہری سنگھ کی معرفت بھادوں ۱۸۸۵ء (۱۸۲۸ء) میں ملا تھا۔ جب اس کا والد بہ قید حیات موجود تھا۔ ہری سنگھ ملک کے حسنِ انتظام اور شایاں خدمات پر بہت خوش تھا۔[1]

خاندانی جاگیر کی بحالی

۱۸۳۷ء میں ہری سنگھ جمرود کی لڑائی میں مارا گیا۔ چونکہ اس زمانے میں جاگیریں فوجی خدمات کے لیے دی جاتی تھیں۔ ہری سنگھ کی جاگیر اس کی وفات کے ساتھ ہی ضبط ہو گئی۔ پہلا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تو ملک فتح خاں نے دربار کا رخ کر لیا۔ اس زمانے میں راجا دھیان سنگھ کا طوطی بول رہا تھا۔ وہی وزیر اعظم اور دربار کا سب سے بڑا رکن مانا جاتا تھا۔ راجا ملک فتح خاں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ۱۸۳۹ء میں مٹھا ٹوانہ کے پورے علاقے کی نظامت کا پروانہ اسے دلوا دیا۔ اس میں نمک کی وہ کانیں بھی شامل تھیں جو کوہ نمک کے جنوب میں میدانی علاقے کے قریب واقع تھیں جیسے وڑچھا اور چوہا۔[2]

ملک فتح خاں علاقے کے انتظام کی غرض سے وطن پہنچ گیا خاندان میں سے تین شخص دربار میں رہے۔ اوّل ملک فتح خاں کا

---

[1] "تحفۂ امیر" ص ۹۷ [2] "لیپل گرفن" جلد دوم ص ۱۹۵۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ ہری سنگھ کی زندگی میں ملک فتح خاں کے ذمے سرکاری روپیہ رہ گیا تھا لہٰذا اسے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے ملک کی خاطر تواضع میں کوئی خلل نہ آنے دیا کہتا تھا کہ یہ کام کا آدمی ہے۔ چنانچہ ہری سنگھ کے مارے جانے کی اطلاع ملی اس کے انتقام کا سوال پیش ہوا۔ اس موقع پر ملک فتح خاں سب سے آگے بڑھا۔ اس وقت رنجیت سنگھ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ دیکھو! میں نہ کہتا تھا کہ ملک کام کا آدمی ہے؟ غرض ملک کو اس فوج کا سالار بنایا گیا جو انتقام کی غرض سے سرحد بھیجی گئی تھی۔

چچیرا بھائی ملک قادر بخش - دوم ملک قادر بخش کا فرزند شیر محمد خاں سوم خود ملک فتح خاں کا فرزند فتح شیر خاں - خاندان کے باقی افراد مختلف حصوں کے انتظام اور دیکھ بھال پر مامور کر دیے گئے - مثلاً ملک صاحب خاں ، ملک عالم خاں اور ملک جہان خاں (فرزندانِ احمد یار خاں) ملک اللہ داد خاں (بن ملک فتح خاں بن ملک خان محمد خاں) ملک مرزا خاں (بن ملک غلام حسین خاں) ملک بخش خاں و ملک غلام محمد خاں (ابنائے ملک خدا یار خاں بن ملک خان بیگ خاں)

رنجیت سنگھ کی قدر شناسی

"تحفۂ امیر" میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے ، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رنجیت سنگھ ملک فتح خاں کو کتنی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا -

رنجیت سنگھ کے آخری دور میں اس کا پوتا کنور نو نہال سنگھ بہت با اقتدار بن گیا تھا - وہ ایک مرتبہ مالیہ وصول کرنے کی غرض سے بنوں جا رہا تھا - مٹھا ٹوانہ پہنچا تو ملک فتح خاں نے شاندار استقبال کیا اور کنور کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی - نذر بھی پیش کی جو کنور کے نزدیک مقدار میں کم تھی - اس نے حکم دے کر اڑھائی ہزار روپے وصول کر لیے - ملک فتح خاں نے اس واقعے کی رپورٹ دربار میں بھیجی - رنجیت سنگھ اس واقعہ پر حد درجہ ناراض ہوا اور حکم دے دیا کہ کنور کی والدہ اڑھائی ہزار روپے فوراً خزانے میں داخل کر دے - پھر دربارِ عام میں فتح خاں کے حسنِ انتظام ، عالیشان خدمات اور جان نثاری کی بہت تعریف کی اور صاف کہ دیا کہ جو شخص میرے سرداروں کی ہتک کرے گا ، اسے مجھ

سے اچھے سلوک کی توقع نہ رکھنی چاہیئے[1]

نظامت کی کیفیت

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مٹھا ٹوانہ کی نظامت ملک فتح خاں کے حوالے کرتے وقت قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر سال پینسٹھ ہزار روپے، دس گھوڑے، گیارہ اونٹ اور اکیس شکاری کتے دیا کرے[2] "لیپل گرفن" کا بیان ہے کہ انتظام تنہا ملک فتح خاں کے حوالے نہ ہوا تھا، بلکہ پارس کھتری کو بھی اس کا شریک بنا دیا گیا تھا لیکن مشترکہ انتظام ٹھیک نہ چل سکا۔ رنجیت سنگھ فوت ہو گیا اور کھڑک سنگھ اس کا جا نشین بنا۔ وہ صرف نام کا فرمانروا تھا۔ تمام اختیارات اس کے بیٹے کنور نو نہال سنگھ نے سنبھال لیے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں بیس ہزار روپے ملک فتح خاں کے ذمے واجب الادا نکلے۔ کنور نو نہال سنگھ ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ اسے ایک رنج یہ تھا کہ اڑھائی ہزار روپے نذرانہ جبراً وصول کرنے کے سلسلے میں اس پر رنجیت سنگھ کا عتاب نازل ہوا تھا۔ دوسرا رنج یہ تھا کہ ملک فتح خاں راجا دھیان سنگھ کے خاص حواریوں میں سمجھا جاتا تھا۔ کنور نو نہال سنگھ راجا اور اس کے حواریوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ ملک فتح خاں کو گرفتار کر لیا جائے۔ اس پر ملک کو مصر لال سنگھ ناظم توشہ خانہ کے گھر میں قید کر دیا گیا۔ رقم ادا ہوئی تو اس نے رہائی پائی۔[3]

---

[1] یہ واقعہ اور بعض دوسری تفصیل "تحفہ امیر" سے ماخوذ ہیں ص ۹۹

[2] "تحفہ امیر" ص ۹۸ [3] "لیپل گرفن" جلد دوم ص ۱۹۵

دوسرا باب

ڈیرہ جات کے بالائی علاقے کی نظامت

پسِ منظر سکھوں کی حکومت کو صرف اصطلاحی طور پر حکومت سمجھا جا سکتا ہے۔ ورنہ عملاً اس میں حکومت کا کوئی بھی وصف نظر نہیں آتا۔ نہ ملک کا انتظام، نہ رعایا کی بہبود نہ آبادکاری کا خیال، نہ جان مال اور آبرو کی حفاظت، آپس میں لوٹ مار اور قتل و غارت کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رنجیت سنگھ میں یقیناً یہ صلاحیت موجود تھی۔ کہ وہ ایک منظم اور پائیدار حکومت کی داغ بیل ڈال دیتا۔ لیکن اس کی عمر دائرہ اثر کی توسیع میں گذر گئی اور توسیع کا مقصد پورا کرنے کی آسان شکل یہی تھی۔ کہ بدنظمی، اور ظلم و جور کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ بے لگام رکھا جاتا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھ فوج جس طرف بھی جاتی، تباہی اور بربادی پھیلا دیتی۔ مظلوم جب موقع پاتے، متفرق سکھ دستوں پر اچانک دھاوے بول دیتے جو سامنے آتا، اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

ڈیرہ جات کے بالائی علاقوں مثلاً مروت، عیسیٰ خیل، ٹانک، بنوں وغیرہ پر سکھوں کی یورشیں تقریباً ہر سال ہوتی تھیں۔ لوگ مقابلے بھی کرتے۔ اور بھاگ کر پہاڑوں میں بھی جا چھپتے۔ سکھوں نے مدت تک لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن پائیدار حکومت کا نقشہ نہ جم سکا۔

ٹانک کی کیفیت

سکھوں کا قدم ٹانک میں پہنچا تھا۔ تو سرور خاں کٹی خیل اس علاقے کا سردار تھا۔ وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اپنے ہم قوموں کو بچانے کے لئے اس نے خراج دینا منظور کر لیا۔

ہربرٹ ایڈورڈز کے بیان کے مطابق ابتداء میں خراج یہ تھا:۔

تین ہزار روپیہ سالانہ، تین گھوڑے، ایک جوڑی باز پچیس اونٹ اور آٹھ شکاری کتے۔ تین سال بعد رنجیت سنگھ خود اٹک پار گیا۔ اور ٹانک کا خراج بڑھا کر ساٹھ ہزار روپے کر دیا[1]

سرور خاں اپنی زندگی میں لشتم پشتم خراج ادا کرتا رہا۔ تاکہ اس کی قوم کے لوگ سکھوں کے ظلم و جور کا ہدف نہ بنیں۔ جب وہ فوت ہو گیا۔ اور اس کے بیٹے اللہ داد خاں کا زمانہ آیا۔ تو ادائے خراج میں بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ اللہ داد خاں کا بھائی صاحب خاں سرداری کا دعوے دار بن گیا۔

کنور نونہال سنگھ نے اس خیال سے صاحب خان کی امداد کی۔ کہ اسے تھوڑا سا علاقہ دے کر راضی کر لیا جائے گا۔

---

[1] - سرحد پنجاب پر ایک سال جلد اوّل صفحہ ۳۵۹۔

باقی سارا علاقہ سرکار کے قبضے میں آ جائے گا۔ اللہ داد خاں سکھوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر وزیری علاقے میں جا بیٹھا۔ جہاں اس کی ننھال تھی۔ نونہال سنگھ نے پورا علاقہ متفرق خوانین میں بانٹ دیا اور اپنے لئے من مانے خراج کا انتظام کرنے لگا۔

اللہ داد خاں کی یورشیں

اللہ داد خاں سرداری کے زمانے میں تو کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دے سکا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سکھ مستقل طور پر اس کے علاقے سنبھال بیٹھے ہیں۔ تو وہ پہلے امداد حاصل کرنے کی غرض سے امیر دوست محمد خاں والی کابل کے پاس پہنچا۔ وہاں سے کوئی قابل قدر انتظام نہ ہو سکا۔ تو اس نے وزیریوں کو ساتھ لے کر سکھوں پر پے در پے یورشیں شروع کر دیں۔ کہتے ہیں کہ سات حملوں میں پورا علاقہ تہ و بالا کر ڈالا۔ اور سکھوں یا ان کے کارواروں کیلئے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ سکھوں نے اگرچہ اللہ داد خاں کے فرزندوں اور رشتہ داروں کے لئے وظیفوں کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن وہ وظیفے اتنے حقیر تھے کہ اللہ داد خاں ان پر مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔ عام بدنظمی نے شدید خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ کہ یہ آگ آس پاس کے دوسرے علاقوں میں بھی نہ بھڑک اُٹھے۔ رنجیت سنگھ کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ مر چکے تھے۔ شیر سنگھ پنجاب کا حکمران تھا۔ وہ اور اس کے مشیر چاہتے تھے۔ کہ جلد سے جلد امن کی صورت پیدا ہو جائے۔

فتح خاں کی پیش کش

حالات اتنے پریشان کن تھے۔ کہ کسی کو بھی آگے بڑھ کر امن قائم کرنے کی

ذمہ داری کا حوصلہ نہ ہوتا تھا ۔ اس موقع پر ملک فتح خاں نے یہ پیش کش کی کہ میں فتنوں کی آگ فرو کر سکتا ہوں ۔ بشرطیکہ اللہ داد خاں کو ڈیرہ جات کے بالائی علاقے کی حکومت سونپ دی جائے ۔ اور بیس ہزار روپے سالانہ اسے ملتے رہیں ۔ دربار نے یہ پیش کش بہ صد خوشی قبول کر لی ۔ اور حکم جاری ہو گیا ۔ کہ جن تین افغان سرداروں میں علاقہ بانٹا گیا تھا ۔ وہ اُسے چھوڑ دیں ۔ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا گورنر دولت رائے بھی واپس آجائے ۔ جو بالائی علاقے کا بھی ناظم تھا[1]

"تحفۂ امیر" اور "لیپل گرفن" کا بیان ہے کہ ملک فتح خاں نے خود یہ پیش کش نہ کی تھی ۔ بلکہ راجہ دھیان سنگھ نے مہاراجہ سے کہہ کر فتح خاں کو اس کام پر مامور کرایا تھا ۔ لیکن ہربرٹ ایڈورڈز کا بیان دونوں سے مقدم اور مستند معلومات پر مبنی ہے ۔ لہٰذا اسی کو درست سمجھنا چاہیئے ۔ "تحفۂ امیر" میں دو اور باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ جو صحیح معلوم نہیں ہوتیں ۔

۱:۔ اسے رنجیت سنگھ کے عہد کا واقعہ بتایا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ شیر سنگھ کے عہد کا واقعہ ہے ۔

۲:۔ بتایا گیا ہے کہ ملک فتح خاں کی تجویز منظور ہونے والی تھی ۔ جب اللہ داد خاں فوت ہو گیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ تجویز منظور ہو چکی تھی ۔ اور اس پر عمل در آمد کے لئے ملک فتح خاں موقع پر پہنچ چکا تھا ۔ اس اثنا میں اللہ داد خاں کا انتقال ہو گیا ۔

---

[1] "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد اوّل صہ ۳۶۳

فتح خاں کی کامیابی

بہر حال ملک فتح خاں اپنے مقصد میں، کامیاب ہوا۔ اس نے ڈیرہ جات کے بالائی علاقے میں امن قائم کر دیا۔ مالیہ وصول کیا۔ مروت کے علاقے میں لکی کے مقام پر دریائے گمبیلا' کے کنارے ایک قلعہ بنایا۔ اگر اللہ داد خاں فوت نہ ہوتا تو ملک فتح خاں کے مشن کا باقی حصّہ بھی پورا ہو جاتا۔ اللہ داد خاں کی وفات کا یہ نتیجہ نکلا کہ دولت رائے حاکم ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور مقامی افغان سرداروں نے وہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کے نفاذ کی غرض سے ملک فتح خاں مامور ہوا تھا۔

"تحفہ امیر" سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقامی خوانین نے لڑائی کا ڈول ڈال دیا تھا۔ ملک فتح خاں نے فوج کا کچھ حصّہ لکی بھیج دیا۔ اور خود ٹانک کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ملک غلام محمد خاں (ابن خدا یار خاں ابن ملک خان بیگ خاں) بھی ملک فتح خاں کے ساتھ تھا۔ اس نے بہ اصرار ملک کو قلعہ ٹانک سے آدھی رات کے وقت یہ کہتے ہوئے بنوں بھیج دیا۔ کہ ہم سب مارے جائیں تو فکر نہیں۔ آپ کو گزند پہنچا۔ تو قوم برباد ہو جائے گی۔ اس اثنار میں لکی سے ملک صاحب خاں اور عیسٰی خیل سے ملک بخش خاں امداد کے لئے پہنچ گئے۔ مخالف شکست کھا کر ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی طرف بھاگ

ۂ سرحد پنجاب پر ایک سال جلد اوّل صہ ۳۶۳

گئے ۔ ملک فتح خاں کامیاب و با مراد لاہور واپس آیا۔ اللہ داد خاں کے فرزند شاہ نواز خاں کو ساتھ لایا ۔ تا کہ باپ کی جاگیر کا پروانہ بیٹے کو دلا دے[1]

نئی افتاد

اس کارنامے نے ملک فتح خاں کو دربار میں اس اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ۔ جو صرف چند افراد کو حاصل تھا ۔ اچانک ایک ایسی مصیبت پیش آئی ۔ جس میں عزت و احترام کا خوش گوار نقشہ یکایک پارہ پارہ ہو گیا ۔ اور ملک فتح خاں کو جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سندھاں والا خاندان کے جن افراد نے کھڑک سنگھ کی بیوی اور نونہال سنگھ کی والدہ کی امداد میں شیر سنگھ کا مقابلہ کیا تھا ۔ وہ بھاگ کر تھانیسر چلے گئے تھے ۔ کچھ مدت بعد شیر سنگھ نے ان کا جرم معاف کر دیا ۔ وہ واپس آئے ۔ تو پہلے کی طرح دوبارہ دربار کے معزز رکن بن گئے ۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دھیان سنگھ وزیر اور شیر سنگھ دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ۔ پہلے شیر سنگھ سے کہا کہ دھیان سنگھ آپ کا بدخواہ ہے ۔ اور ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے ۔ آپ اس کے قتل کا فرمان لکھ دیں ۔ ہم دھیان سنگھ کا فیصلہ کر دیں گے ۔ شیر سنگھ سے تحریر لے کر وہ دھیان سنگھ کے پاس پہنچے اور وہ تحریر دکھلاتے ہوئے بولے کہ ہمارے ساتھ فیصلہ کیجئے ۔ ہم شیر سنگھ کا خاتمہ

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں ۔ "تحفہ امیر" صفحہ ٩٩-١٠١ ۔ "لیبل گرفن" جلد دوم صفحہ ١٩٥-١٩٦ سرحد پنجاب پر ایک سال جلد اول صفحہ ٣٤٩-٣٦٤ ۔

کئے دیتے ہیں - غرض انہوں نے شیر سنگھ اور اس کے بیٹے پرتاپ سنگھ کو شاہ بلاول میں قتل کر دیا - قلعے کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں دھیان سنگھ ملا - صرف چند آدمی ساتھ تھے - ان میں ملک فتح خاں بھی تھا - جسے دھیان سنگھ، اپنے خاص محافظوں میں شمار کرتا تھا - قلعے کے دروازے پر پہنچے تو سندھاں والا سرداروں نے دھیان سنگھ کو آگے کر لیا - فوراً دروازہ بند کر کے اس پر قرابتیں داغ دیں - اور خود قلعہ پر قابض ہو گئے -

آفت پر آفت

دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے باپ کے انتقام کا نعرہ بلند کر کے فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا - سندھاں والا سرداروں میں سے دو مارے گئے اور ایک بچ نکلا - ان کے باقی ساتھی بھی یا تو مارے گئے - یا ادھر ادھر چھپ گئے - ملک فتح خاں ممتاز ترین آدمیوں میں سے تھا - ہیرا سنگھ کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی دشمنوں سے مل گیا ہے - ورنہ اس کے ہوتے ہوئے دھیان سنگھ کا مارا جانا مشکل تھا - یا پھر وہ بھی ساتھ مارا جاتا - لہٰذا اس کی بھی گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے - اس طرح ملک فتح خاں پر پے در پے دو آفتیں نازل ہوئیں - ایک یہ کہ اس کا سب سے بڑا مربی اور سرپرست مارا گیا - دوسری یہ کہ وہ دھیان سنگھ کے قتل کا بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ ضرور ذمہ دار ٹھہرا -

چنانچہ ملک فتح خاں کی گرفتاری کے لئے اشتہار جاری ہو گئے - جا بجا اسے تلاش کیا گیا - مجبور ہو کر اس نے

بھیس بدلا - چپ چاپ لاہور سے نکلا اور غیر معروف راستوں سے اپنے وطن پہنچ گیا - اس کا چچیرا بھائی ملک قادر بخش اس وقت ملتان میں تھا - اس کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا - چنانچہ پنتالیس ہزار روپے کی ضمانت پر اس نے رہائی پائی -

ملک فتح خاں کے لئے وطن میں امن سے بیٹھنا ممکن نہ تھا - لہٰذا وہ دریائے سندھ سے پار اتر کر سوان خاں وزیری کے پاس پناہ گزین ہو گیا - جس کا ذکر ہربرٹ ایڈورڈز کی کتاب میں بارہا آیا ہے - سکھوں نے وزیری سردار کو روپے کا لالچ بھی دیا - کہ کسی طرح فتح خاں ہاتھ آ جائے وزیری نے ہر پیشکش ٹھکرا دی اور فتح خاں کی پوری حفاظت کی[۱]

قتل کی ذمہ داری

یہاں اس سوال پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ کہ آیا ملک فتح خاں دھیان سنگھ کے قتل کی سازش کا شریک تھا - یا اس نے حفاظت کا فرض انجام دینے میں کوتاہی کی؟ تاریخ کی واضح شہادت یہ ہے کہ نہ اسے سازش کا علم ہو سکتا تھا - اور نہ اس نے دھیان سنگھ کو بچانے کے سلسلے میں کسی خطرے سے رو گردانی کی - محمد لطیف اور سمائیتھ کے بیان کے مطابق شاہ بلاول میں جہاں شیر سنگھ اور اس کا بیٹا مارے گئے تھے - سازشیوں کے ساتھ تین سو سوار - اور اڑھائی سو پیادے تھے اجیت سنگھ سندھاں والا دونوں مقتولوں کے سر لے کر آگے چلا تاکہ

---

[۱] یہ تفصیلات پنجاب کے متعلق مختلف تاریخی کتابوں نیز "تحفہ امیر" "لیپل گرفن" اور ہربرٹ ایڈورڈز کے بیانات سے ماخوذ ہیں۔ "لیپل گرفن" کا بیان ہے - کہ سوان خان کو تین ہزار روپے پیش کئے گئے تھے - "تحفہ امیر" میں بھی رقم کی مقدار یہی بتائی گئی ہے -

جلد قلعے میں پہنچ جائے ۔ اس کے ساتھ تھوڑے سے سوار تھے ۔ اس کے پیچھے پیچھے لہنا سنگھ سندھاں والا دوسو سواروں کے ساتھ روانہ ہوا ۔ وہ کوئی نصف فاصلہ طے کر چکے تھے کہ دھیان سنگھ قلعے کی جانب سے آتا ہوا ملا ۔ صرف چند آدمی اس کے ساتھ تھے ۔ اسے قطعاً علم نہ تھا کہ شیر سنگھ اور اس کا بیٹا مارے جا چکے ہیں ۔ اجیت سنگھ نے اسے تمام حالات سنائے ۔ اور وہیں سے بہ اصرار لوٹا لیا ۔ قلعے کے بیرونی دروازے پر کسی کو نہ روکا گیا ۔ لیکن دوسرا دروازہ دھیان سنگھ کے داخل ہوتے ہی بند کر لیا گیا ۔ اور غالباً ایک آدمی کے سوا دھیان سنگھ کا کوئی ساتھی داخل نہ ہو سکا ۔ دھیان سنگھ کو غالباً خطرے کا پورا اندازہ ہو چکا تھا لیکن وہ کچھ کر نہ سکتا تھا ۔ مناسب یہی تھا کہ وہ اطمینان سے اجیت سنگھ کا کہنا مانتا ۔ اور اس طرح خطرے کو ٹالتا ۔ چند منٹ کے بعد اجیت سنگھ کے ساتھیوں نے اسے قتل کر دیا ۔ ملک فتح خاں ٹوانہ ان حالات سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کہ دھیان سنگھ کا بیٹا ہیرا سنگھ ، البتہ یہ ممکن ہے کہ داستان بافوں نے ملک کو ذمہ دار قرار دے دیا ہو ۔ اگر فتح خاں قاتلوں کی سازش میں شریک ہوتا تو وہ اجیت سنگھ کے ساتھ رہتا ۔ نیز وہ اس شخص کو مروا نہ سکتا تھا ۔ جو دربار میں اس کا سب سے بڑا سرپرست تھا ۔

جنگ رو کڑی

اس سلسلے کا صرف ایک واقعہ رہ گیا جس کا ذکر "تحفۂ امیر" میں آیا ہے یعنی

ملک فتح خاں ٹانک سے لاہور آ رہا تھا تو راستے میں میانوالی کے بعض پٹھانوں اور سکھوں نے قلعہ رودکھڑی میں بغاوت اختیار کر لی اور اعوان بھی ان سے مل گئے ۔ شدید لڑائی ہوئی، جس میں ٹوانوں کا بھی نقصان ہوا، لیکن وہ اس بہادری سے لڑے کہ پٹھان اعوان اور سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے[1] ۔

---

[1] تحفۂ امیر، ص۱۰۱ ص۱۰۲ ۔

تیسرا باب

دورِ مصائب

ملک کی ہر دلعزیزی ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا ہے کہ بالائی سندھ کے آس پاس جتنے قبیلے آباد تھے، ان کے رؤساء اور عوام میں ملک فتح خاں کو انتہائی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ کوئی غریب کسان یا کوئی مصیبت زدہ قبیلہ اس کے پاس پہنچ جاتا تو ملک اس کا مالیہ واپس کر دیتا۔ لکھمی مل یا اس کے بیٹے دولت رائے نے ڈیرہ جات کی گورنری کے زمانے میں جن جن رئیسوں کو جلا وطن کر دیا تھا یا سکھوں نے گھروں سے باہر نکال دیا تھا، فتح خاں خود ان کے پاس جا کر اپنے ساتھ واپس لے آیا یا آدمی بھیجکر بلوا لیا۔ انہیں گھروں میں آباد کر دیا، اور حسب ضرورت ان کیلئے وظیفے مقرر کر دیئے۔ جن درویشوں اور خانقاہوں کے وظیفے بند کر دیئے گئے

تھے۔ ملک فتح خاں نے وہ دوبارہ جاری کر دیئے۔ ایسے کشادہ دست اور فراخ حوصلہ رئیس پر کون جان نثار کرنے کیلئے تیار نہ ہوتا اور اس کے سوا سرحد میں کون امن قائم کر سکتا تھا؟ؔ

سفر کے بعض واقعات

ملک فتح خاں جس حالت میں لاہور سے نکلا تھا۔ اس میں کوئی روپیہ ساتھ لینے کا موقعہ نہ تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ وہ چھپ چھپا کر منزلیں طے کر رہا تھا۔ صرف ایک شخص زمان اعوان اس کے ساتھ تھا۔ راستے میں ایک ہندو لیکھ رام نے اسے پہچان لیا۔ اس کی گرفتاری کیلئے پانچ ہزار کے انعام کا اشتہار موجود تھا۔ ہندو نے اسکی حالت دیکھ کر چپ چاپ پانچ سو روپے خدمت میں پیش کر دیئے۔ اور عرض کیا کہ آپ نے ایک مرتبہ ٹانک میں میرے گرفتار شدہ اونٹ واپس دلا دیئے تھے اور مجھے صحیح سلامت گھر پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور ہندو بساکھی رام نے اتنی ہی رقم بطور نذر پیش کر دی، جس کے باپ شکھ رام پر ملک فتح خاں نے احسان کئے تھے۔ لیکن جسطرح روپیہ آتا تھا، اسی طرح وہ خرچ کر دیتا تھا۔ اس سفر میں ایک مرتبہ اس کے پاس صرف سات روپے رہ گئے تھے۔ ایک بڑھیا نے امداد کی درخواست کی تو ملک نے ساتھی کو حکم دے دیا۔ جو کچھ پاس ہے، بڑھیا کے حوالے کر دے۔ اس کے پاس صرف سات روپے تھے۔ دو اپنے پاس رکھے۔ پانچ اس بڑھیا کے حوالے کر

ؔ سرحد پنجاب پر ایک سال جلد اول صفحہ ۳۳

دیئے [1]

سکھوں پر ترکتازیں

ہیرا سنگھ نے ایک فوج اس کے تعاقب میں بھیجدی تھی۔ وہ لڑی تو ملک فتح خاں نے مسلمان قبیلوں کو ہتھیار سنبھالنے کی دعوت دے دی۔ وہ نامور رئیس تھا۔ اس کے کارناموں کی دھاک دُور دور بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت جلد ایک بھاری جمعیت اس کی حمایت میں جنگ کیلئے تیار ہوگئی اور اس نے پورے علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ سکھوں کے جتنے بے قاعدہ جتھے مقابلہ پہ آئے۔ سب کو شکست دی اور سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا [1]

ایک روایت مظہر ہے کہ ملک فتح خاں نے بھاری لشکر فراہم کرکے مٹھا ٹوانہ پہ حملہ کیا۔ سکھوں کی طرف سے حاکم رائے اس علاقہ کا ناظم تھا۔ وہ بھاگ گیا اور مبارک خاں بن لنگر خاں کو ایک دستہ فوج کے ساتھ قلعے میں چھوڑ گیا۔ ہری سنگھ ناظم خوشاب، پنوں سنگھ حاکم پنڈ دادن خاں، لنگر خاں رئیس ساہی وال وغیرہ نے مل کر بارہ ہزار جنگجوؤں کے ساتھ ہڈالی پہ دھاوا بول دیا۔ ان کے ساتھ توپیں بھی تھیں، لیکن ملک فتح خاں نے اس لشکر کو شکست دیکر بھگا دیا اور ٹبہ دھولو تک ان کا تعاقب کیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد اسی مقام پہ جوہر آباد آباد ہوا

یہ حالات ہیرا سنگھ نے سنے تو بہت بڑا لشکر ملک فتح خاں کی سرکوبی کیلئے تیار کیا۔ منگل سنگھ سراں والیہ اور دیوان

---

[1] ملاحظہ ہو "تحفۂ امیر" صفحہ ۱۰۶ صفحہ ۱۰۷۔

مول راج ناظمِ ملتان اس کے سالار مقرر ہوئے۔ یہ لشکر دریائے جہلم کے کنارے خوشاب اور گردٹ کے درمیان جویہ میں خیمہ زن ہوا۔

مٹھا ٹوانہ کی جنگ

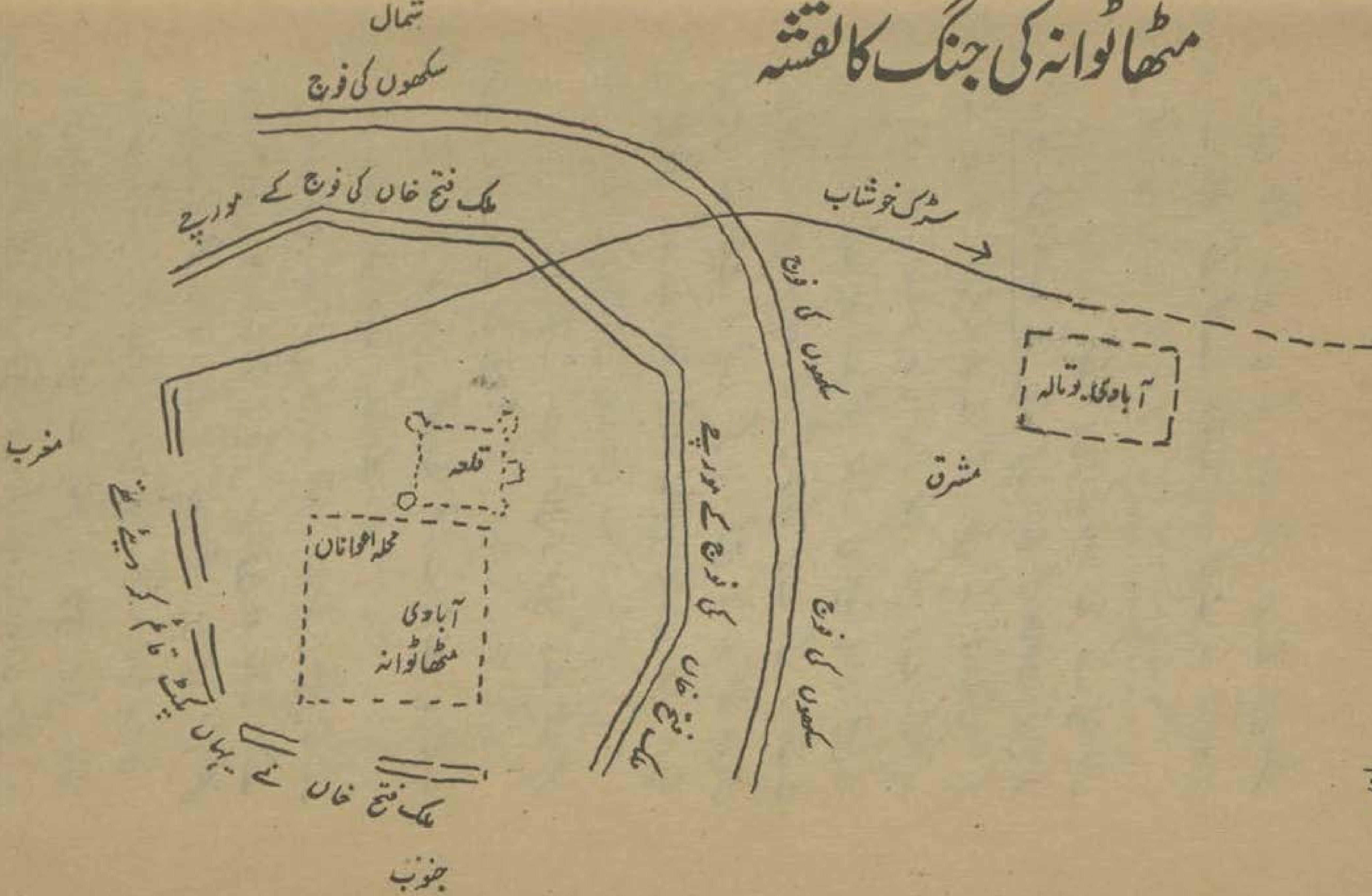
سکھ فوج کے سالار نے ملک فتح خاں کو پیغام بھیجدیا تھا۔ کہ اطاعت قبول کر لو گے، تو علاقہ نہ چھینا جائے گا۔ لیکن ملک کو حالات کا پورا اندازہ تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ ہتھیار ڈال دینے کے بعد ہیرا سنگھ یا پنڈت جلاّ سے حسنِ سلوک کی امید پوری نہیں ہو سکتی۔ اسے یقین ہو چکا تھا۔ کہ حوالگی موت کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس نے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بارش ہو چکی تھی ملک نے مٹھا ٹوانہ کے باہر چاروں طرف مورچے بنا لیے اور ان میں فوجیں بٹھا دیں۔

جنوبی و مشرقی گوشے سے شمالی و مغربی گوشے تک مسلسل مورچے قائم کر دیئے گئے تھے۔

جنوب اور مغرب میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے دستے بٹھا دیئے گئے تھے۔

سکھ فوج کے حملوں کا زور شمال اور مشرق ہی میں تھا۔ ملک کو دو مصیبتوں کا سامنا تھا۔ ایک سکھ فوج دو جانب سے حملہ کر رہی تھی۔ دوسرے جو سپاہ قلعے میں جمی بیٹھی تھی وہ مٹھا ٹوانہ پر گولہ باری کر رہی تھی۔ جنگ غالباً دو دن، جاری رہی۔ پہلے دن صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی، اور رات کو بھی سکھ فوج نے گولہ باری جاری رکھی۔ دوسرے دن صبح کو فتح خاں کے غازیوں نے شدید حملہ کر کے

مٹھاٹوانہ کی جنگ کا نقشہ



سکھ فوج کا مشرقی مورچہ توڑ ڈالا - وہ شمالی مورچے کو بھی اسی طرح توڑ دینا چاہتے تھے کہ محلہ اعواناں پر جو مٹھا ٹوانہ کے شمالی و مغربی گوشے میں واقع تھا - سخت گولہ باری شروع ہو گئی - اور وہاں بہت سے غازی مارے گئے - اس موقع پر ساتھیوں نے ملک فتح خاں سے بہ اتفاق رائے التجا کی کہ وہ چپ چاپ نکل کر دریائے سندھ کے پار چلا جائے - باقی فوج لڑتی رہے گی - چنانچہ ملک فتح خاں رات کی تاریکی میں جنوبی برج سے باہر نکلا - راہداری، ہرنولی میانوالی ہوتا ہوا سندھ کے پار چلا گیا - دوسرے دن فوج قصبے میں داخل ہو گئی - اور اپنی عادت کے مطابق قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا -

ایک خاتون کی جواں مردی ایک خاتون کا بھائی مجروح ہو گیا تھا - خاتون کو اتنا غصّہ آیا کہ تلوار سنبھال لی اور پے در پے پانچ سکھ موت کے گھاٹ اتار دیئے - جو سامنے آتا اسے ایک ہی وار میں ختم کر دیتی - ساتھ ساتھ پکار کر کہتی جاتی - کہ بندوقیں نہ چلاؤ - ہمت ہے تو تلوار سے مقابلہ کر دیکھو آخر ایک سکھ نے اس خاتون کو گولی سے شہید کر دیا

ملک فتح خاں کے تمام مکانوں کو آگ لگا دی گئی - سامان لوٹ لیا گیا - قادر بخش اور ملک صاحب خاں کی کوشش سے قتل و غارت کا سلسلہ ختم ہوا - میانوالی سے پنڈ دادن تک کا علاقہ ملک قادر بخش کے حوالے

کر دیا گیا۔ اس نے انتظام کی غرض سے جا بجا اپنے رشتہ دار مقرر کر دیئے۔ جب تک ہیرا سنگھ اور پنڈت جلاّ کی حکومت قائم رہی۔ ملک فتح خاں نے روپوشی میں وقت گذارا، اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی گورنری

ہیرا سنگھ اور پنڈت جلاّ سکھ فوجیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور رانی جنداں کا بھائی جواہر سنگھ وزیر اعظم بنا تو ملک فتح خاں فوراً لاہور پہنچا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جواہر سنگھ سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ وہ ہیرا سنگھ اور جلاّ کے خلاف برابر لڑتا رہا تھا۔ اس طرح اس نے جواہر سنگھ اور سکھ فوجیوں کے مقاصد کیلئے جدوجہد کی تھی۔ جواہر سنگھ نے اسے قیمتی تحائف دیئے اور مندرجہ ذیل علاقے کا گورنر بنا دیا۔

"مٹھا ٹوانہ" "راولپنڈی" اور جہلم کے کچھ حصے ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور بنوں[1]۔ اس علاقے کی جمع سولہ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو ملک فتح خاں جیسے بہادر و کاروان شخص کو مل سکتا تھا۔ گویا وہ دربار لاہور کے چند بڑے افراد میں شامل ہو گیا۔

"تحفۂ امیر" میں ملک فتح خان کے اعزاز و اکرام اور علاقے کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔

---

[1] "پیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۰ - "تحفہ امیر" صفحہ ۱۱۲۔

خلعت فاخرہ شاہانہ، ہاتھی جس کا ہودہ نقرئی تھا۔
سولہ لاکھ کا علاقہ یعنی مٹھا ٹوانہ، نور پور ٹوانہ، کچھی دریائے جہلم، کچھی کلاں دریائے سندھ، شیخو وال، میانوالی، خوشاب، احمد آباد، نور پور سیٹھی، کٹھا، ڈھاک، جسو وال، پھکڑ، کھیبی، جندال کھارڑو، عیسیٰ خیل، مکی مروت، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں، کلاچی دراین، پہاڑپور، دائرۂ دین شاہ۔

ملکی انتظام یہ علاقے مختلف سرداروں کے ماتحت تھے، جنہیں حکم دے دیا گیا۔ کہ وہ ملک فتح خاں کی ہدایات کے مطابق عمل کریں۔
ملک خود مٹھا ٹوانہ ہوتا ہوا ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مقیم ہوا۔ جسے پورے علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔
باقی علاقوں کا انتظام مندرجہ ذیل طریق پر کیا۔

۱۔ ملک قادر بخش ٹوانہ : خوشاب، کٹھا، ڈھاک، نور پور احمد آباد، مانگو وال۔
۲۔ ملک صاحب خاں ٹوانہ : مکی۔
۳۔ ملک بخش خاں ٹوانہ : عیسیٰ خیل۔
۴۔ ملک غلام محمد خاں ٹوانہ : خوشاب اور شاہ پور۔
۵۔ ملک شبیر محمد خاں ٹوانہ : میانوالی[۱]

---

[۱] یہ تفصیلات "تحفہ امیر" سے ماخوذ ہیں۔

چوتھا باب

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی گورنری

ہردلعزیزی

ملک فتح خاں سے پہلے دیوان دولت رائے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا گورنر تھا۔ جو ظلم و جور اور جلبِ زر کے باعث زمانے بھر میں رسوا تھا۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا ہے۔ کہ جن قبیلوں پر وہ حکمران تھا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو دولت رائے کی چیرہ دستیوں کیوجہ سے نالاں نہ ہو یا جس کی آرزو یہ نہ ہو کہ دولت رائے کی جگہ ملک فتح خاں ٹوانہ کو بھیج دیا جائے۔ دولت رائے صرف ہندو تاجروں میں ہردلعزیز تھا۔ اس لئے کہ اُن کی سودی رقوم قرض داروں سے کوڑی کوڑی دلاتا تھا۔ اور ان تاجروں سے کوئی ٹیکس نہ لیتا تھا۔[1]

بیشک دولت رائے کے پاس توپ خانہ تھا۔ اس کی فوج بھی نہایت اچھی تھی؛ جس میں ٹانک کے افغان جاگیردار اور

[1] سرحدِ پنجاب پر ایک سال جلد اول صفحہ ۳۶۵

وہ افغان آباد کار شامل تھے، جنہیں پنجاب میں ملتانی پٹھان کہا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملک فتح خاں ہر دل عزیز تھا اور جو لوگ ڈیرہ جات کے بالائی علاقے کی نظامت میں اس کا حسن انتظام دیکھ چکے تھے، ان کی خواہش یہی تھی۔ کہ دولت رائے نکل جائے اور ملک فتح خاں اس کی جگہ گورنر بن جائے۔ بہر حال اس کے تقرر کا خیر مقدم سب نے کیا۔

جاگیرداروں سے مصالحت

یاد ہو گا کہ نونہال سنگھ نے نواب اللہ داد خاں والی ٹانک کو علاقے سے نکال کر اس میں تین افغان جاگیردار بٹھا دیئے تھے۔ پائندہ خاں خواجہ زئی، عاشق محمد علی زئی، اور حیات اللہ ستدو زئی، انہیں عموماً ملتانی پٹھان کہا جاتا ہے۔ ملک فتح خاں کو اس علاقے کا انتظام سونپا گیا تھا تو اس نے تجویز پیش کی تھی کہ نواب اللہ داد خاں کو بحال کر دیا جائے اور بیس ہزار روپے سالانہ اسے وظیفہ دیا جائے

اللہ داد خاں فوت ہو گیا۔ تو ملک فتح خاں اس کے فرزند شاہ نواز خاں کا ہمدرد اور سفارشی بن گیا، اس وجہ سے افغان جاگیردار ملک فتح خاں پر خوش نہ تھے اور دولت رائے کے حامی بن گئے تھے۔

ملک فتح خاں نے نئے عہدے جائزہ لیتے ہی بالغ نظر مدبر کی طرح فیصلہ کر لیا کہ افغان جاگیرداروں سے مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ میانوالی کے ایک سید کی وساطت سے صلح کی گفتگو کی۔ قرآن مجید پر حلف اٹھائے گئے اور فریقین نے ایک دوسرے سے خلوص کا اقرار کر لیا، لیکن

جس سید نے صلح کی گفتگو کی ۔ اس نے صلح کے ساتھ ہی دونوں طرف نفاق کا بیج بو دیا ۔ جاگیر داروں سے علیحدگی میں کہا، خبردار رہو، ملک فتح خاں ان تمام آدمیوں کا جانی دشمن ہے، جو اس کے اقتدار کی راہ میں حائل ہو سکیں ۔ بے شک اس نے قرآن پر حلف اٹھایا ہے، لیکن اس حلف پر بھروسا نہ کرنا چاہیے ۔

اس کے برعکس ملک فتح خاں سے تنہائی میں کہا :۔

بیٹا! یہ لوگ اب بھی تیرے دشمن ہیں ۔ اگر انہیں موقعہ مل گیا تو تیری جان لئے بغیر نہ رہیں گے ۔ ان کی قسموں پر اعتماد نہ کرنا[1]

جاگیرداروں کا فیصلہ

غرض سید کی ان نفاق انگیز باتوں نے دونوں کو اپنے بچاؤ اور مخالفوں کے قتل پر آمادہ کر دیا ۔ افغان جاگیرداروں نے باہم سازش کی کہ ملک فتح خاں کو کسی حیلے سے اپنے ہاں بلائیں اور قتل کر دیں۔ چنانچہ پائندہ خاں خواجہ زئی اور اس کا بیٹا سکندر خاں دعوت دینے کی غرض سے ملک کے پاس پہنچے ۔ اخبار نویس نے ان تمام حالات کی اطلاع پہلے سے ملک کے پاس پہنچا دی تھی، ملک کچھ دیر پائندہ خاں سے باتیں کرتا رہا ۔ پھر چپ چاپ اٹھ کر اندر چلا گیا ۔ اور پیغام بھیجدیا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں ۔ میرا انتظار کرو ۔ افغان دستور کے مطابق یہ مہمان کی سخت ہتک تھی ۔ پائندہ خاں کے بیٹے نے جوشِ غیظ میں تلوار کھینچی اور پیغام لانے والے کا سر قلم کر دیا ۔

---

[1] سرحد پنجاب پر ایک سال، جلد اول، صفحہ ۳۴۹

ملک فتح خاں کے آدمی تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے چشم زدن میں باپ بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جو آدمی ان کے ساتھ آئے تھے، وہ بھاگ نکلے، ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے بازاروں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ عاشق محمد خاں علی زئی بھی مارا گیا۔ حیات اللہ خاں سدو زئی نے نواب ڈیرہ کے باغ میں پناہ لی، جس کے گرد مضبوط فصیل کھچی ہوئی تھی۔ دوسرے روز نواب نے چالیس ہزار روپے تاوان ادا کر کے حیات اللہ خاں کو اٹک پار چلے جانے کی اجازت دلا دی۔[۱]

لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ پائندہ خاں گفتگو کے ذریعے سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا، اس دوران میں گرم گفتگو تک نوبت پہنچی، ملک فتح خاں نے رُو در رُو پائندہ خاں کی توہین کی، وہ موقع اور محل کی نزاکت کا اندازہ کرتا ہوا چپ بیٹھا رہا، اس کا بیٹا سکندر خاں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور اس نے ملک فتح خاں کے جمعدار کو قتل کر دیا۔ ایک لمحے میں ہر طرف سے مسلح آدمی در آئے۔ پائندہ خاں اس کا بیٹا اور بہت سے ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔[۲]

یوں ملک فتح خاں کو افغان جاگیرداروں کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن افغانوں میں اس کی ہمہ گیر ہر دلعزیزی کو

---

[۱] "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد اول صفحہ ۳۶۶ و صفحہ ۳۶۷ - ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا ہے کہ پائندہ خاں اس سے پیشتر عمر خاں رئیس دار بند کو دھوکے سے گرفتار کر کے نواب ڈیرہ کے حوالے کر چکا تھا۔ نواب نے اسے قتل کر دیا۔ اب پائندہ خاں کو اس کی بدعہدی کی سزا مل گئی۔ لیپل گرفن جلد دوم صفحہ ۱۹۸ -

یقیناً نقصان پہنچا -

پشورا سنگھ کا قتل

کھڑک سنگھ، شیر سنگھ، اور دلیپ سنگھ کے علاوہ کشمیرا سنگھ، اور پشورا سنگھ بھی رنجیت سنگھ کے بیٹے مانے جاتے تھے - انہوں نے بھی ایک مرتبہ تاج و تخت کیلئے ہنگامہ بپا کیا، پھر کشمیرا سنگھ فوت ہو گیا۔ اور پشورا سنگھ سیالکوٹ کی جاگیر لے کر بیٹھ گیا - چونکہ اس کی طرف سے برابر کھٹکا لگا ہوا تھا - کہ خود سر سکھوں کا کوئی گروہ اسے اٹھا کر میدان میں لے آئے گا - تو رانی جنداں، اور جواہر سنگھ دلیپ سنگھ کے نام پر اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، لہذا جواہر سنگھ کی کوشش یہ تھی کہ پشورا سنگھ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دے - اس غرض سے اس نے اپنے دو نہایت قابل اعتماد رفیق چنے - ایک چتر سنگھ اٹاری والا جس کی بیٹی دلیپ سنگھ سے منسوب ہو چکی تھی، دوسرا ملک فتح خاں ٹوانہ -

پشورا سنگھ اٹک پر قابض ہو چکا تھا۔ افغان اس کے حامی بن گئے تھے - امیر دوست محمد خاں والی کابل سے بھی اس کی بات چیت شروع ہو چکی تھی - چتر سنگھ اور فتح خاں نے اٹک پر حملہ کر دیا - آخر فیصلہ ہوا کہ پشورا سنگھ کی جان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا - وہ قلعہ خالی کر دے اور بے خوف و خطر لاہور چلے، جہاں اس کی بلند حیثیت کے مطابق سلوک ہو گا - پشورا سنگھ نے یہ شرطیں مان لیں - چتر سنگھ اور ملک فتح خاں اسے لے کر حسن ابدال پہنچے تو جواہر سنگھ کا حکم ملا کہ کنور کو واپس لے جاؤ اور اس سے خلاصی حاصل کرو، دونوں سردار کنور کو واپس اٹک لے گئے - رات کی تاریکی میں گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔

اور لاش دریا میں پھینک دی

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک فتح خاں اور چتر سنگھ اٹاری والا دونوں اس کام میں شریک تھے۔ وہ ذاتی طور پر اسے پسند کرتے ہوں، یا نہ کرتے ہوں، لیکن وزیر اعظم کے حکم کی تعمیل کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اگرچہ یہ انوکھا واقعہ نہ تھا اور پشورا سنگھ کو رنجیت سنگھ کا بیٹا تسلیم کرنا بھی اکثر کے نزدیک محلِ نظر تھا۔ تاہم سکھوں نے اسے بہت بڑا جرم قرار دیا۔ اسی واقعہ کی بنا پر سکھ جواہر سنگھ کے مخالف ہوئے اور انجام کار وہ مارا گیا اور اسی واقعے نے سکھوں میں ملک فتح خاں کی ہردلعزیزی کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ یہ تفصیلات اس غرض سے بیان کی گئیں کہ انہیں ملک فتح خاں کے انجام سے گہرا تعلق ہے۔

لیپل گرفن کا بیان

لیپل گرفن نے افغان جاگیر داران ٹانک اور پشورا سنگھ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ قابل قبول نہیں۔ مثلاً

۱۔ اس کے نزدیک پنجاب کے دور مصائب کی سرگذشت کا سب سے بڑھ کر بیدردانہ واقعہ پشورا سنگھ کا قتل ہے، حالانکہ کھڑک سنگھ، شیر سنگھ، یا اس کے بیٹے پرتاب سنگھ یا دھیان سنگھ، ہیرا سنگھ بچت سنگھ، وغیرہ کے قتل اس سے کم دردناک نہ تھے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ جن لوگوں کو براہ راست قتل کے ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ وہ سب عام سکھوں کی نظروں میں عتاب کا نشانہ بنے۔ چتر سنگھ اٹاری والا نے جلاوطنی میں وفات پائی۔ جواہر سنگھ مارا گیا۔ ملک فتح خاں کے خلاف بھی عام دشمنی کا آغاز اسی واقعہ سے ہوا۔

۲- گرفن نے لکھا ہے۔ کہ ملک فتح خاں ٹانک کے افغان جاگیر داروں کو اس غرض سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کا اقتدار محفوظ ہو جائے - یہ بھی صحیح نہیں، جیساکہ ہم عرض کر چکے ہیں، فتح خاں مصالحت کا خواہاں تھا۔ لیکن مصالحت کرانے والے سیّد کی نفاق انگیز باتوں نے بگاڑ پیدا کر دیا۔ اور پیش دستی جاگیرداروں کی طرف سے ہوئی، نہ کہ ملک کی طرف سے۔

حکومت سے معزولی

جواہر سنگھ کے قتل کے بعد لال سنگھ وزیر بنا۔ وہ اگرچہ ملک فتح خاں کا دوست تھا۔ لیکن سکھوں کے مختلف طبقوں اور پٹھانوں میں ملک فتح خاں کے خلاف جو شور بپا ہو رہا تھا۔ اس نے لال سنگھ کو ملک فتح خاں کے عزل پر مجبور کر دیا۔ یپل گرفن کے بیان کے مطابق ملک نے لال سنگھ، رانی جنداں اور اس کی کنیز منگلاں[1] کو بیش بہا نذرانے بھی دیئے، لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی اور ملک کی جگہ دوبارہ دولت رائے کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا گورنر بنا دیا گیا۔

دیوان دولت رائے سے مقابلہ

دربار لاہور نے دولت رائے کو ملک فتح خاں کی جگہ گورنر مقرر کر دیا تھا۔ لیکن خود ملک کو براہ راست اطلاع نہ دی تھی۔

---

[1] - منگلاں سکھ حکومت کے آخری دور کی ایک عجیب وغریب شخصیت تھی۔ یہ ایک غریب ہندو ماشکی کی بیٹی تھی پچیس روپے میں ایک آدمی کے ہاتھ بکی، پھر مختلف ہتھیاروں سے کام لیتی ہوئی لاہور پہنچی ایک ماشکی بھکے ذریعے رنجیت سنگھ کے محل میں داخل ہوئی۔ آخر کار رانی جنداں کی مشیر خاص بن گئی اور کئی سال تک وہ سکھ دربار کی بہت اہم شخصیت بنی رہی۔

لہذا جب دولت رائے فوج لے کر بھکر پہنچا تو ملک مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

"لیپل گرفن" کا بیان ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے باہر لڑائی ہوئی۔ ملک کیساتھ تین ہزار جنگ جو تھے، لیکن وہ دولت رائے کی باقاعدہ فوج کا جم کر مقابلہ نہ کر سکے، اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ملک مجبور ہو کر اکال گڑھ پہنچا، جس کا ناظم اس کا بیٹا فتح شیر خاں تھا۔[۱]
"تحفۂ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لشکروں کا مقابلہ موضع ببتر میں ہوا۔ بلوچوں نے ملک سے بے وفائی کی اور فوج مقابل سے ساز باز کر کے جنگل میں چھپ گئے۔ ملک کے لشکر کا خاصا بڑا حصّہ مارا گیا۔ مقتولوں میں ملک کے دو قابلِ اعتماد سالار بھی تھے۔ ایک سردار حسنی خاں خیسور، دوسرا چوہدری غلام گنگر۔[۲]

اکالگڑھ میں جتنے قیدی موجود تھے، ملک نے اُن سب کو قتل کرا دیا۔ ان میں ٹانک کے نواب اللہ داد خاں کا بھائی صاحب خاں بھی تھا۔ اور ملک خود مٹھا ٹوانہ چلا گیا۔[۳]

"امیر نامہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک نے بنوں کا رخ کر لیا تھا۔

اور یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، البتہ یہ اندیشہ تھا۔ کہ کہیں مستورات کی بے حرمتی نہ ہو۔ لیکن فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ کہ اگر ننگ و ناموس کو خطرہ لاحق ہو تو انہیں موت

۱؎ "لیپل گرفن" جلد دوم صفحہ ۱۹۸۔ ۲؎ "تحفۂ امیر" صفحہ ۱۱۹۔ ۳؎ لیپل گرفن جلد دوم صفحہ ۱۹۸ صفحہ ۱۹۹۔

کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

ملک خان صاحب خاں اور ملک بخش خاں مٹھا ٹوانہ پہنچ گئے تھے۔ اس اثنا میں سکھوں اور انگریزوں کی جنگ شروع ہو گئی، اور جس صورت حال کا اندیشہ تھا، اس کی نوبت ہی نہ آئی

پانچواں باب

آخری دور

انگریزوں سے تعلق

"لیپل گرفن" نے لکھا ہے، کہ جنگ کے دوران میں ملک فتح خاں نے اپنی خدمات انگریزوں کے روبرو پیش کر دی تھیں۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ سکھ دربار سے ملک کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جو حالات پیش آ چکے تھے، انہیں سامنے رکھتے ہوئے ملک فتح خاں جیسے بالغ نظر سیاست دان کو یقین ہو چکا ہوگا۔ کہ سکھ حکومت کا تماشہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔ چونکہ وہ مدت سے دربار کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور اسے انگریزوں کے طور طریقوں کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے مناسب یہی سمجھا کہ نوکری ہی کرنی ہے۔ تو بہتر اور منظم تر حکومت سے کیوں تعلق پیدا نہ کیا جائے۔

ستمبر ۱۸۴۵ء میں جواہر سنگھ مارا گیا۔ نومبر میں جنگ

شروع ہوئی، لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ ملک فتح خاں کی معزولی اکتوبر ۱۸۴۵ء میں ہوئی۔ فروری ۱۸۴۶ء میں جنگ ختم ہوئی اور ۸۔ مارچ کو سکھوں نے صلح نامے پر دستخط کر دیئے۔

صلح کی شرطیں

صلح کی بڑی شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیان پورا میدانی اور کوہستانی علاقہ انگریز سنبھال لیں۔

۲۔ سکھ دربار ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ ادا کرے۔ چونکہ پورا روپیہ ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لہٰذا قرار پایا کہ ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کیلئے دریائے بیاس اور دریائے سندھ کا پورا کوہستانی علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے اور پچاس لاکھ کی باقی رقم معاہدے کی تصدیق کے وقت نقد ادا کی جائے

تاوان میں جو کوہستانی علاقہ انگریزوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ وہ کانگڑہ، منڈی سکیت، چمبہ، جموں کشمیر اور ضلع ہزارہ پر مشتمل تھا۔ انگریزوں نے جموں، کشمیر اور ہزارہ کا علاقہ ایک کروڑ روپے میں راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے حوالہ کر دیا۔ اور یوں ریاست کشمیر کی بنیاد پڑی۔

رانی جنداں نائب السلطنت قرار پائی، لال سنگھ وزیر اعظم رہا، آٹھ آدمیوں کی ایک کونسل بنا دی گئی جو پورے انتظام کی ذمہ دار تھی"

دیوان دینا ناتھ، سردار تیج سنگھ، سردار شیر سنگھ اٹاری والا، فقیر نور الدین، سردار جودھ سنگھ، بھائی ندھان سنگھ، سردار عطر سنگھ کلیاں والا، سردار شمشیر سنگھ سندھان والا، سر ہنری لارنس کو ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ کونسل کے لئے لازم تھا۔ کہ ریزیڈنٹ کے مشورے اور ہدایت

کے مطابق انتظام چلاتے ۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ دس ہزار انگریزی فوج دلیپ سنگھ کی نابالغی کے زمانے تک پنجاب میں موجود رہے، اور سکھ حکومت بائیس لاکھ روپے سالانہ اس کے خرچ کیلئے دیتی رہے ۔

یوں متعدد انگریز پنجاب کی حکومت میں داخل ہوئے ۔ جو بہ لحاظ نمائش سکھ حکومت تھی ۔ لیکن عملاً اس کی ساری کیفیت بدل چکی تھی ۔

حاکم کشمیر کا معاملہ

سکھ دربار کی طرف سے نواب امام الدین کشمیر کا گورنر تھا ۔ جنگ کے زمانے میں وہ اپنے عہدے پر قائم رہا ۔ معاہدے کے مطابق کشمیر انگریزوں کے حوالے ہو چکا تھا ۔ اور انگریز اسے گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے، گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہا، تو نواب امام الدین مقابلے کیلئے تیار ہوگیا ۔ گلاب سنگھ اور نواب کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں، نتیجہ کچھ نہ نکلا آخر ہنری لارنس ریزیڈنٹ خود فوج لے کر جموں گیا، وہ اور گلاب سنگھ ریاسی میں ٹھہرے اور ہربرٹ ایڈورڈز کو فوج کیساتھ آگے بھیجا ۔

یہی زمانہ ہے جب ارباب بست وکشاد کو ملک فتح خاں ٹوانہ یاد آیا، جو نواب امام الدین کا گہرا دوست تھا ۔ چنانچہ اسے بلایا گیا ۔ اور وہی ہربرٹ ایڈورڈز کے مشیر خاص کی حیثیت میں ساتھ گیا ۔ ملک نے نواب امام الدین سے متعدد ملاقاتیں کیں، جن میں یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ نواب نے جو قدم اٹھایا تھا، وہ لال سنگھ وزیر کے خفیہ حکم کی بنا پر اٹھایا تھا ۔

نواب کے وہ حکم اور اس سلسلے کی پوری خط وکتابت ملک

فتح خاں کے حوالے کر دی اور ملک ہی کی کوشش سے نواب امام الدین حوالگی کیلئے تیار ہو گیا۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے خود لکھا ہے:

۱۸۴۶ء میں جب میرے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا، کہ جموں جاؤں اور کشمیر میں شیخ امام الدین کی بغاوت فرد کرنے کیلئے مہاراجہ گلاب سنگھ کی امداد کروں، تو فتح خاں ٹوانہ ہی کے ذریعے سے شیخ کے ساتھ گفت و شنید کامیابی کی منزل پر پہنچی تھی، اور بغاوت کے لئے راجا لال سنگھ کے لکھے ہوئے فرامین حکومت برطانیہ کے حوالے ہوئے تھے۔ وزیر اعظم کی غداری کے اس انکشاف کی بنا پر سکھ دربار فتح خاں کا جانی دشمن بن گیا۔ اس دشمنی میں دیوان دینا ناتھ بہ طورِ خاص پیش پیش تھا جو راجے کا دوست اور اس کا مدافع تھا[1]

دربار کا جوشِ انتقام

ملک فتح خاں کی یہ خدمت اتنی عظیم الشان تھی کہ ایک بڑی فوج بھی ایسا کارنامہ انجام نہ دے سکتی تھی۔ تمام انگریز اس پر بہت خوش ہوئے۔ لال سنگھ کے معاملے کی تحقیقات کے لئے ایک خاص عدالت مقرر ہوئی۔ میجر جنرل لٹلر، لفٹنٹ کرنل لارنس، لفٹنٹ کرنل گولڈی، مسٹر کری، جان لارنس اس کے ارکان تھے۔ دیوان دینا ناتھ لال سنگھ کا وکیل بن گیا۔ نواب امام الدین نے اصل فرمان عدالت میں پیش کر دئے، جو پورن چند درباری پروانہ نویس نے لکھے تھے۔ اور ان پر لال سنگھ کی مہریں ثبت تھیں۔ ان فرامین میں تاکیدی حکم دیا گیا تھا۔ کہ کشمیر کسی بھی حالت میں گلاب سنگھ کے حوالے نہ کیا جائے۔ لال سنگھ کا جرم ثابت

---

[1] "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد دوم صہ ۵۲۹

ہو گیا اور اسے پنجاب سے جلا وطن کر کے بنارس بھیج دیا گیا۔[1]

اب دیوان دینا ناتھ اور راجہ تیجا سنگھ اس امر کے درپے ہو گئے، کہ کسی طرح ملک فتح خاں کو نقصان پہنچائیں اور لال سنگھ کی غداری کو عالم آشکارا کرنے کا بدلہ لیں۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق ملک فتح خاں کے خلاف پرانے بقایا کا سوال پیدا کر کے اسے گرفتار کرنے کی ٹھان لی گئی۔

"تحفۂ امیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی حکومت دے دینے کا چکمادے کر نذرانے کی رقم کا تمسک لکھوا لیا گیا۔ ملک نے اپنی مہر راجا دینا ناتھ کو دے دی کہ جتنی رقم آپ مناسب سمجھیں، لکھ لیں۔ چنانچہ انہوں نے چار لاکھ کے بقایا پر بہ طورِ خود ملک کی مہر لگا دی اور وہی تحریر انگریزوں کو دکھا کر فتح خاں گرفتار کر لیا۔

ہربرٹ ایڈورڈز بنوں چلا گیا۔ گلاب سنگھ اور چتر سنگھ نے ملک کی ضمانت دینی چاہی۔ وہ منظور نہ ہوئی۔ ملک کے بیٹے فتح شیر خاں کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ بھی لاہور پہنچا۔ انگریز انسروں سے بھی ملا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ کچھ روپے ضرور داخل کر دو۔ چنانچہ انہوں نے بصد مشکل اکیس ہزار روپے جمع کر کے داخل کر دیئے۔[2]

لیپل گرفن کا بیان

لیپل گرفن کا بیان یہ ہے کہ کشمیر سے فتح خاں کی واپسی پر دیوان دینا ناتھ نے سات لاکھ کی رقم واجب الوصول نکالی تھی۔ ملک فتح خاں نے جواب دیا کہ یہ رقم جواہر سنگھ کے حکم کے مطابق پانچ ہزار سواروں کا رسالہ

---

[1] لطیف کی تاریخ پنجاب" (انگریزی) صفحہ ۵۵۵، ۵۵۶۔ [2] تحفۂ امیر" صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴۔

تیار کرنے میں خرچ ہوئی آخر رقم گھٹا کر چار لاکھ کر دی گئی۔ اور ملک کو ہنری لارنس کی منظوری سے کاہن سنگھ مان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ ساڑھے تین مہینے اس نظر بندی میں گزارے۔ پھر ملک نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں رقم ادا نہیں کر سکتا، چنانچہ اسے گوبند گڑھ کے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ اُس وقت ملک نے کہا کہ میں آٹھ دن میں دو لاکھ روپیہ ادا کر دوں گا۔ دربار نے مزید بیس روز کی مُہلت دیدی۔ جب رقم ادا نہ ہوئی تو اس کے بیٹے فتح شیر خاں کو بھی قید کر دیا گیا۔ دو ماہ کے بعد ملک نے بیٹے کی رہائی کی درخواست کی تاکہ وہ روپیہ فراہم کرے اُس نے دربار میں یہ گذارش پیش کی کہ ایک لاکھ روپے کا ذمہ دار گلاب سنگھ ہو گا۔ باقی رقم والد کی رہائی پر ادا کی جائے گی، کچھ مدّت بعد اکیس ہزار کی رقم ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے خزانے میں داخل کی گئی [۱]

اس بیان میں کئی باتیں تعجب انگیز ہیں۔

۱۔ ملک فتح خاں نے کشمیر میں گلاب سنگھ اور انگریزوں کی وہ خدمت انجام دی تھی، جس کیلئے وہ لاکھوں روپے نقد اور لاکھوں کی جاگیر بھی دے دیتے تو حق ادا نہ ہو سکتا لیکن تعجب ہے کہ خدمت نے چکنے کے بعد ملک کو ان حق ناشناسوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جو کشمیر میں فتنہ انگریزی کے براہ راست ذمہ دار تھے۔

۲۔ اگر دیوان دینا ناتھ کے قول کے مطابق رقم واقعی واجب الادا تھی تو انگریزوں اور گلاب سنگھ نے اس کا انتظام کیوں نہ کر دیا۔؟

---

[۱] "پیپل گرفن" جلد دوم صـ۱۹۹ و صـ۲۰۰۔

کیا ملک کی خدمات کے لیئے یہ رقم بہت بڑی تھی ؟

۳ - خود ملک پر تعجب ہے کہ اس نے ادائے واجبات میں لیت و لعل کیوں کی ؟ اس کی سابقہ زندگی میں ایسے کسی واقعے کی مثال نہیں ملتی -

غرض یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا - شبہہ یہی ہے کہ یہ رقم انتقاماً ملک کے ذمے لگائی گئی اور اس کے پاس روپیہ ہوتا، تو وہ واجب نہ ہونے کے باوجود رقم ضرور ادا کر دیتا اور ایسے موقع پر اسیری گوارا نہ کرتا، جب گلاب سنگھ اور انگریز دونوں اس کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کے لئے تیار تھے -

ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا ہے - کہ دینا ناتھ نے بقایا کی بھاری رقم ملک کے ذمے نکال کر اس کے بیڑیاں ڈلوا دی تھیں اور گوبند گڑھ میں قید کر دیا تھا - ملک کی والدہ اور دوسری رشتہ دار خواتین نے اپنے جواہرات بیچ کر تھوڑی سی رقم فراہم کی، جس کی بنا پر مجھے سر فریڈرک کری ریزیڈنٹ لاہور کی خدمت میں ملک کی رہائی کے لئے درخواست کا موقع ملا[1]

وصیت نامہ

غالباً اسی زمانے میں ملک فتح خاں نے اپنے فرزند فتح شیر خاں کے نام ایک وصیت نامہ فارسی میں لکھا، جس کے بعض مطالب خلاصۃً ذیل میں درج ہیں

۱ - خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھو، وہی سب کا نگہبان، روزی رساں اور کارساز ہے -

۲ - عبادت، درود اور نماز میں مشغول رہو -

---

[1] "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد دوم صہ ۵۲۹

۳ - رعایا کے ساتھ نہ حسد و کینہ رکھو، نہ اس پر ظلم و تعدی کرو۔ عدل میں کسی کا لحاظ نہ کرو، بُرے کاموں سے بچو، جو خدا اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں۔

۴ - دیوان دینا ناتھ کی دشمنی میرے لئے گردش کا باعث بنی، لیکن میں کسی کی شکایت نہیں کرنا چاہتا، میں جب کشمیر گیا۔ اور وہاں خدمات انجام دیں تو وہ خدمات راجا لال سنگھ کی دشمنی اور عداوت کا باعث بن گئیں

۵ - میرے حساب کتاب کے کاغذات ناصرالدین اور پیر زمان شاہ کے پاس ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ کارداروں سے میں نے جو کچھ وصول کیا، وہ سرکاری خزانے میں پہنچا دیا بلکہ کچھ زیادہ ہی دے دیا[1]

---

[1] "تحفہ امیر" ص ۱۲۴ - ۱۲۶

چھٹا باب

وفات

ملک کی اسیری معلوم ہوتا ہے کہ ملک فتح خاں نے خاصی مدت اسیری میں گذاری۔ وہ ۱۸۴۶ء کے اواخر میں کشمیر سے واپس آیا تھا۔ دسمبر میں لال سنگھ پر مقدمہ چلا اور اسے معزول کر کے باہر بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ملک کے ذمے بقایا نکال کر اسے گرفتار کیا گیا۔ ۱۸۴۷ء کی ابتدائی سہ ماہی تک وہ لاہور میں رہا۔ پھر اسے گوبند گڑھ بھیجدیا گیا، جہاں سے وہ ۱۸۴۸ء کے موسم بہار میں رہا ہوا، جب دیوان مول راج حاکم ملتان باغی ہو گیا، اور ہربرٹ ایڈورڈز کو ملک کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش آئی۔ یوں ملک نے سال سوا سال کی مدت اسیری میں گذاری۔

مول راج کی بغاوت دیوان مول راج اپنے والد دیوان ساون مل کے قتل کے بعد ۱۸۴۴ء میں حاکم ملتان بنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے والد نے نوّے لاکھ

روپے جمع کر رکھے تھے، جنہیں مول راج نے چپ چاپ بھائیوں میں تقسیم کر دیا، اسے اس شرط پر حاکم بنایا گیا تھا کہ تیس لاکھ روپے بہ طورِ نذرانہ پیش کرے۔ لال سنگھ نے رقم وصول کرنے کیلئے فوج بھیجی، جو دیوان کی فوج کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔ انگریز ریزیڈنٹ نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، دربار نے دیوان کی نظامت میں سے کچھ علاقہ واپس لے لیا، اور خراج کی رقم میں ایک تہائی کا اضافہ کر دیا۔ مول راج نظامت سے مستعفی ہونے کیلئے تیار ہوگیا۔ اس کی جگہ کاہن سنگھ کو ناظم بنا کر بھیجا گیا۔ دو انگریز ونیس ایگنیو اور اینڈرسن اس کے ساتھ گئے، دیوان نے چارج دے دیا۔ انگریز قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو ان پر حملہ ہوا، یہی حملہ مول راج کی بغاوت کا سبب بن گیا۔ سکھوں کا ایک مشہور مذہبی پیشوا بھائی مہاراج سنگھ بھی دیوان کے ساتھ مل گیا، جس کی وجہ سے حالات نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔

ملک کی رہائی

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہربرٹ ایڈورڈز نے ریزیڈنٹ لاہور سے کہہ کر ملک فتح خاں کو رہا کرایا تھا۔

سر فریڈرک نے اسے رہا کرتے ہی میرے پاس بھیجدیا۔ اس لئے کہ وہ بہادر اور قابل شخص تھا اور بغاوت کے فرد کرنے میں اس کی خدمات مفید ہو سکتی تھیں، لیکن میرا کیمپ ملک کے دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور قیام امن کی خاطر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے کسی دوسری جگہ

بھیج دوں ؎۱

"تحفۂ امیرؔ کا بیان" تحفۂ امیرؔ کا بیان ہے کہ ملک کی رہائی کے ساتھ ہی ۱۴ جون ۱۸۴۸ء کو دربار لاہور نے خلعت اور پروانۂ حکومت عطا کیا۔ اس کی حکومت دریائے جہلم سے بنوں تک کے علاقے پر مشتمل تھی۔ یعنی تعلقہ مٹھا ٹوانہ، تعلقہ خوشاب کچھی شیخووال، کچھی میانوالی، عیسیٰ خیل لکی مروت، بنوں وغیرہ۔ چنانچہ رام سنگھ کاردار کچھی کلاں، جمیل سنگھ کاردار مٹھا ٹوانہ و شیخووال، غلام حسن کاردار خوشاب، نیز کاردارانِ مروت و بنوں و عیسیٰ خیل کو احکام بھیج دیئے گئے کہ اپنے علاقوں کا انتظام ملک فتح خاں کے حوالے کر کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔

چنانچہ ملک فتح خاں نے مٹھا ٹوانہ سے کیتھر پہنچ کر ہربرٹ ایڈورڈز سے ملاقات کی۔ ملک کا فرزند فتح شیر خاں اور اس کا بھتیجہ ملک شیر محمد خاں اپنے سواروں اور پیادوں کے ہمراہ ہربرٹ ایڈورڈز کی فوج میں شامل تھے ؎۲

بنوں جانے کا حکم ہربرٹ ایڈورڈز کا یہ قول اوپر نقل ہو چکا ہے کہ ملک فتح خاں کو اس کے دشمنوں سے دور رکھنے کیلئے باہر بھیجنا ضروری تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہربرٹ ایڈورڈز لفٹنٹ ٹیلر کو اپنے پاس بلانا چاہتا تھا، جو بنوں میں سکھ فوج کا سالار تھا۔ اس کی تدبیر یہی تھی کہ ملک کو بنوں بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے اسے بنوں کا گورنر بناتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔

؎۱ "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد دوم" ص ۵۲۹ و ۵۳۰۔ ؎۲ "تحفۂ امیر" ص ۱۲۶۔

ملک صاحب! میرا مدعا یہ ہے کہ لفٹنٹ ٹیلر کی جان بچا لوں، اس لئے کہ مجھے یقین ہے، سکھ فوج ضرور بغاوت کرے گی۔ پھر کسی انگریز کیلئے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ قلعہ دلیپ گڑھ کی سکھ فوج کو قابو میں رکھ سکیں گے تو جایئے۔ خواہ اس فوج کو بغاوت سے باز رکھئے یا بغاوت کی صورت میں وزیریوں کے جھتے فراہم کر کے ان پر حملہ کر دیجئے، جنگ ختم ہو جائے گی تو آپ کو خدمات کے شایانِ شان معاوضہ دیا جائے گا۔[1]

ملک کی صحت قید کی وجہ سے بہت خراب ہو چکی تھی، تاہم اس نے درد بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ ملتان جاؤں، لیکن بنوں میں ضروری کام ہے۔ اس لئے میں وہاں جاؤں گا، آپ نے میری جان بچائی اور میری عزت کی حفاظت کی۔ خدا گواہ ہے کہ میں اس احسان کا بدلہ چکانے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھوں گا۔[2]

بنوں کی کیفیت

جولائی کے آغاز میں ملک فتح خاں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ بنوں کی سکھ فوج میں خاصی بے اطمینانی پھیلی ہوتی تھی۔ ملک کے تقرر سے اس میں اضافہ ہو گیا۔ اوائل اگست میں بنوں کی سکھ فوج باغی ہو گئی۔ ملک نے حسنِ تدبیر سے کچھ مدت

---

[1] شرحہ پنجاب پر ایک سال، جلد دوم صفحہ ۵۳ ۔ [2] ایضاً ایضاً۔

تک بغاوت کو دبائے رکھا۔ اس فوج کے دو سالار تھے۔ ایک کرنیل جان ہومز، دوسرا سردار رام سنگھ چھاپے والا۔ اواخر ستمبر میں ملتان سے یہ خبر بنوں پہنچی کہ راجا شیر سنگھ بھی دیوان مول راج سے مل گیا ہے۔ ساتھ ہی سکھوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا کرنیل ہومز کو قتل کر ڈالا۔ چار ہلکی توپیں ملتان بھیجی جاتے والی تھیں، انھیں قبضے میں لے لیا اور دلیپ گڑھ کے اندرونی قلعے میں ملک فتح خاں کا محاصرہ کر لیا

یہ حالت دیکھتے ہی ملک نے مسلمان قبیلوں سے اپیل کی کہ وہ ہتھیار سنبھال کر لڑائی کیلئے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ جعفر خاں، بایزید خاں، شیر خاں، اور محمد عزیز خاں، عیسیٰ خیل ملک کی دعوت پر امداد کیلئے پہنچ گئے، لیکن سکھوں نے ملک کے پرانے دشمنوں کو ساتھ ملا لیا تھا۔ اس لئے حالات میں کوئی خوشگوار تغیر نہ ہو سکا۔ سکھوں نے پہلے مشرقی حصے پر ہجوم کیا تھا۔ جب ان پر توپ کے گولے برسنے لگے تو بچاؤ کی غرض سے وہ شہر کے جنوب میں آ گئے، تاہم ان کے متفرق مورچے قائم رہے اور ملک فتح خاں کو باغیوں کی فوجی قوت نے نہیں بلکہ پانی کی تکلیف نے پریشان کیا۔

پانی کی تکلیف

ملک طویل مدت تک باغیوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ قلعے میں پانی باہر سے لایا جاتا تھا۔ سکھوں نے وہ پانی بند کر دیا تھا، اور تالاب خشک ہو گیا۔ ملک نے قلعے کے اندر کنواں کھدوانا شروع کر دیا۔ افسوس کہ رات دن کی کھدائی کے باوجود پانی

دست یاب نہ ہو سکا[1]

ان حالات میں جوانگی کے سوا چارہ نہ رہا، لیکن ملک کی جوانمردی اور غیرت عاجزانہ جوانگی پر رضا مند نہ ہوتی - جب اس نے دیکھا کہ اب جان دیئے بغیر چارہ نہیں تو دل میں پختہ فیصلہ کر لیا کہ مردانگی سے لڑتا ہوا جان دوں گا -

شہادت آخری وقت کی کیفیت ہربرٹ ایڈورڈز نے یوں بیان کی ہے -

فتح خاں نے تلوار اور ڈھال سنبھال لی - حکم دے دیا - کہ قلعے کا دروازہ کھول دیا جائے - وہ مردانہ وار باہر نکلا اور باغیوں سے پکار کر کہا، میں ملک فتح خاں ہوں - مجھے گولی سے نہ مارو - اگر تم میں سے کوئی وہ مرد ہیں جو اپنے آپ کو ایک آدمی کی ٹکر سمجھتے ہیں تو آؤ اور لڑائی کا شوق پورا کر لو -

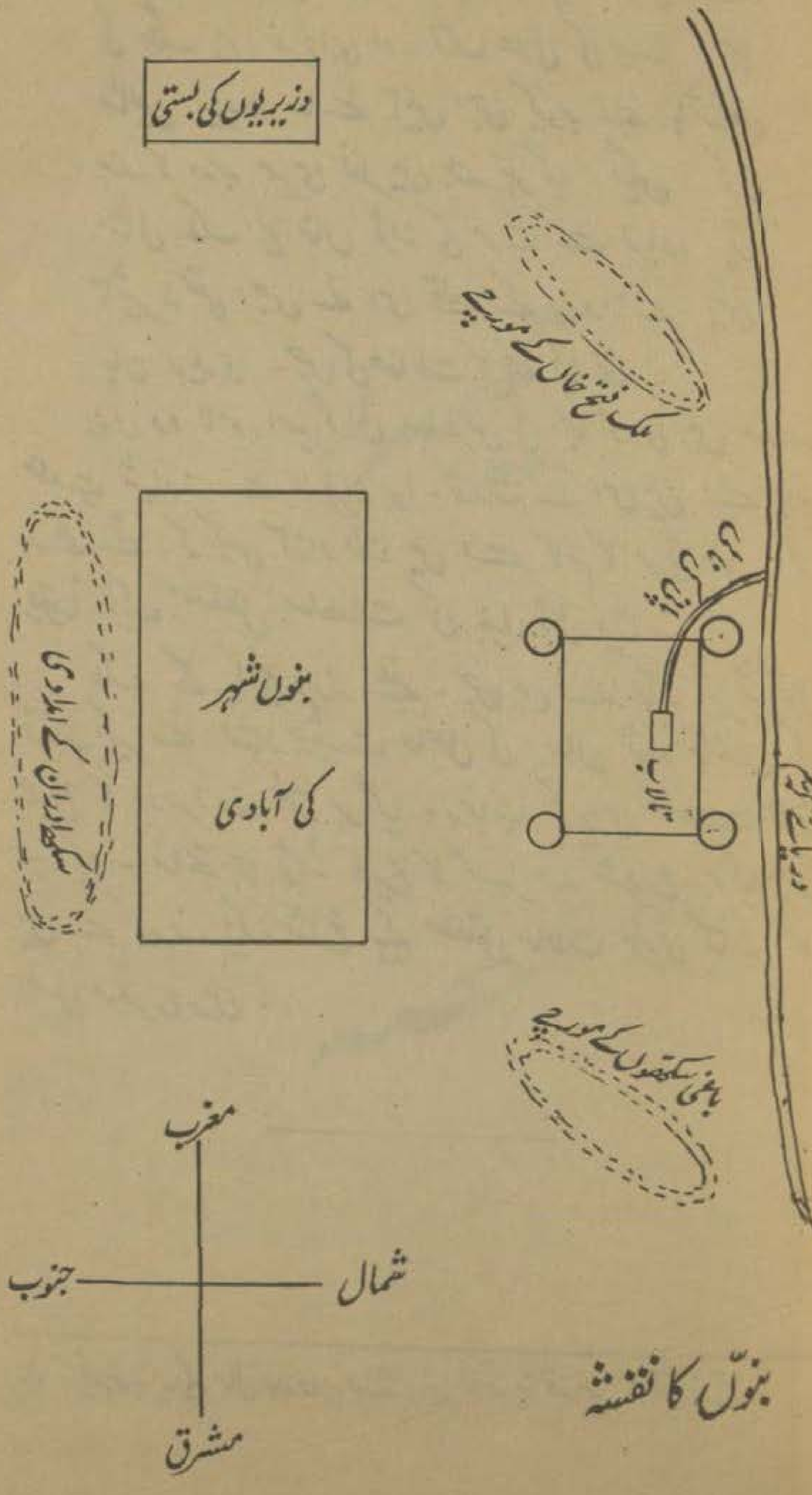
یہ سنتے ہی باغیوں میں ایک شور پیدا ہوا -

ملک فتح خاں ٹوانہ ! تو ہی ہے جس نے ہمارے کنور پشورا سنگھ کو قتل کیا تھا - ہم تجھے قتل کیئے بغیر نہ چھوڑیں گے -

اس کے ساتھ ہی سینکڑوں گولیوں کی بوچھاڑ ملک کے جسم پر پڑی اور اسے چھلنی کر گئی، اس طرح اس

---

[1] یہ حالات متفرق کتابوں سے ماخوذ ہیں - مثلاً پنجاب گریفن جلد دوم صفحہ ۲۰۰ "تحفہ امیر" صفحہ ۱۲۶-۱۳۳ - تحفہ امیر کا بیان ہے - کہ پیاسی فوج اور تشنہ جانوروں کی طاقت اور حواس نے جواب دیدیا - لودن کے تھکے ماندے بھوکے پیاسے محصورین کی بے تابی بے ہوشی اور بے حسی کے درجے پر پہنچ گئی سکھوں نے قلعہ کو گھیر رکھا تھا - اور سامان حرب ختم ہو چکا تھا -



وزیریوں کی بستی
ملک فتح خاں کے مورچے
بنوں شہر
کی آبادی
باغی سکھوں کے مورچے
مغرب
شمال
جنوب
مشرق

بنوں کا نقشہ

جوانمرد نے جان دے کر اپنا عہد پورا کر دیا ۱۸۴۸-۴۹ء
کی جنگ میں خیر خواہی اور نمک حلالی کی بہت سی
مثالیں میرے سامنے آئیں، جن کی وجہ سے باشندگانِ
ہند کا درجہ میری نظر میں بلند ہو گیا - لیکن کوئی
مثال ملک فتح خاں ٹوانہ کی موت سے زیادہ پُر
تاثیر نہ تھی، جس نے اس قلعے کے دروازے میں
جان دیدی - جس کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔[1]

یوں وہ نامور امیر گراں بہا فرض کی بجا آوری میں مردانہ وار
خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوا - قدرت نے اس میں ایسے جوہر
رکھے تھے - کہ کسی آزاد فضا میں اسے کام کا موقع ملتا تو
یقیناً ایک مستقل سلطنت کی بنیاد ڈال دیتا -

ملک کے پانچ فرزند تھے - جن میں سے ملک فتح شیر خاں
فرزند اکبر نے ممتاز حیثیت حاصل کی، یہاں ٹوانہ خانداں کی
تاریخ کا دوسرا دور ختم ہو گیا - پنجاب انگریزی سلطنت کا جزو
بن گیا - ساتھ ہی ٹوانہ تاریخ کا تیسرا دور شروع ہو گیا، جس
میں سے صرف ایک شاخ کے مفصل حالات ہماری کتاب کا
اصل موضوع ہیں -

---

[1] "سرحد پنجاب پر ایک سال" جلد دوم صفحہ ۵۳۱ - نیز ملاحظہ ہو "تحفہ امیر" صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۸ -

تیسرا

حصّہ

پہلا باب

پس منظر

ضروری گزارش ٹوانہ خاندان کے جو حالات اب تک آپ کے ملاحظے میں پیش ہوئے، ان سے واضح ہے کہ کہ سرداری کا منصب عموماً بڑے بیٹے کو ملتا تھا۔ بعض اوقات غیر معمولی قابلیت کی بنا پر چھوٹے بیٹے نے یہ منصب حاصل کرلیا، لیکن خاندان کے تمام افراد مِل جُل کر کام کرتے تھے۔ اور ذاتی کشاکشوں کے باوجود ان میں اک گونہ تعاون کی روح موجود رہی۔ خصوصاً جب کسی بیرونی دشمن سے سابقہ آپڑتا تھا۔ تو خاندان کے لوگ حفاظتِ نفس کے اصول پر اکٹھے ہوجاتے تھے۔ اب ہم اس خاندان کی تاریخ کے ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں مختلف افراد نے آزادی و استقلال کی حیثیت میں کام شروع کیا اور ہر فرد ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی اور سربلندی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی سرگذشت شروع کرنے سے پیشتر بتا دیا جائے۔ کہ کون

کون سے ممتاز افراد موجود تھے اور نئی زندگی کے میدان میں ان کی جدوجہد کا آغاز کیونکر ہوا۔ یہیں سے ٹوانہ خاندان کی اس شاخ کا عہد استقلال شروع ہوتا ہے۔ جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے

خاندان کے ممتاز افراد

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، احمد یار خاں نے ۱۸۲۹ء میں وفات پائی اور اپنے پیچھے پانچ فرزند چھوڑے، ان میں سے ملک قادر بخش اس ٹوانہ جیش کی کمانداری پر متعین ہوئے جو رنجیت سنگھ کی خاص فرمائش پر مرتب ہوا تھا۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ احمد یار خاں کا بھائی خدا یار خاں رنجیت سنگھ کے خاص اصطبل کا نگران و منتظم تھا۔ وہ ۱۸۳۶ء میں فوت ہوا اور اس کا لائق فرزند ملک فتح خاں والد کے اعزازوں کا وارث بنا۔ ملک قادر بخش نے ۱۸۴۰ء میں انتقال کیا تو اس کے حقوق و اعزازات اس کے بیٹے ملک شیر محمد خاں کے نام منتقل ہو گئے۔

ٹوانوں کا علاقہ

گوناگوں جنگی کشمکشوں میں ٹوانوں کا علاقہ کئی مرتبہ پامال ہوا اور رنجیت سنگھ نے تو اسے ہری سنگھ نلوہ کی جاگیر میں دے دیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ٹوانوں نے کسی موقعہ پر بھی اس علاقے کا قبضہ نہ چھوڑا اور عملاً یہ انہیں کے پاس رہا۔ جب دباؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ غیر آباد صحرائی علاقے میں چلے جاتے تھے۔ غنیم کوئی بڑی فوج اس علاقے میں دیر تک رکھ نہ سکتا تھا۔ جب فوج ہٹتی، ٹوانے پھر اپنی ملکیتیں سنبھال لیتے، قوت بیکار ثابت ہوئی تو رنجیت سنگھ نے نئی پالیسی اختیار کی اور ٹوانوں کیلئے خاصی رعایتوں کا بندوبست کر دیا۔ جواہر سنگھ منصب وزارت پر فائز

ہُوا تو ملک فتح خاں سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر مٹھاٹوانہ اور خوشاب کے مالیئے کا چوتھا حصّہ اس کے لیئے مقرّر کر دیا۔ اس رقم کی مقدار ساٹھ ہزار تین سو پینتالیس روپے سالانہ بتلائی گئی ہے۔ لال سنگھ وزیر بنا تو اس نے یہ رعایت واپس لے لی، لیکن ٹوانوں نے نہ پہلے اپنے علاقے کا قبضہ چھوڑا تھا اور نہ لال سنگھ کے بعد کسی کو اس پر مسلّط ہونے دیا۔ گویا ان کے اصل املاک بدستور قائم رہے۔

انگریزی دور کا آغاز

ٹوانے اپنی جنگی صلاحیتوں کی بنا پر جس طرح سکھوں سے بیشتر ممتاز چلے آتے تھے، اسی طرح سکھوں کے دورِ تسلّط میں بھی برابر ممتاز رہے۔ اس عہد میں ملک فتح خاں نے جو بلند مناصب حاصل کیئے، وہ بہت سے سکھوں کیلئے بھی قابلِ رشک تھے، تاہم ٹوانوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ سکھوں کے ماتحت کسی بھی چیز کو مستقل اور پائیدار نہیں سمجھا جا سکتا۔ خصوصاً رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جو ہمہ گیر بدنظمی پیدا ہو چکی تھی، اس نے ٹوانوں کو سکھوں سے بالکل بیزار کر دیا۔ اس وقت انگریزوں کے قدم جمتے چلے جا رہے تھے۔ اور ٹوانوں کو ان کے طریقِ نظم و نسق کی اچھائی کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان کا رحجان انگریزوں کی طرف بڑھتا گیا۔ ملک فتح خاں نے کشمیر میں انگریزوں کی گراں قدر خدمت انجام دیں۔ ملک ہی کی کوششوں سے نواب امام الدّین نے کشمیر کی حکومت سے دست برداری اختیار کی۔ پھر ملک اور اس کے اہلِ خانداں نے مول راج کی بغاوت اور سکھوں

کی دوسری جنگ میں پوری سرگرمی سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی جائیں گی۔ جب پنجاب میں امن قائم ہو گیا۔ اور سکھوں کی جگہ یہاں انگریزوں کا سکہ چلنے لگا تو ٹوانوں کی شاندار خدمات کے معاوضے کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس وقت طے ہوا کہ ٹوانوں کو اس علاقہ کا ایک چوتھائی مالیہ باقاعدہ دیا جائے۔ جس سے وہ رسماً نہ کہ عملاً لال سنگھ وزیر کے زمانے میں محروم ہوئے تھے۔ علاوہ بریں مختلف ممتاز افراد کے لئے ایسے انتظامات کر دیئے گئے کہ وہ معمول کے مطابق فوجی خدمات انجام دے سکیں۔ یعنی اپنے پاس سوار اور سپاہی تیار رکھیں، تاکہ جب ضرورت پیش آئے۔ وہ کم سے کم وقت میں جنگ پر پہنچ جائیں۔

تحفۂ امیر کا بیان

"تحفۂ امیر" میں مرقوم ہے کہ ٹوانوں کی خدمات کے معاوضے کا حکم گورنر جنرل نے ۲۱ اگست ۱۸۵۰ء کو جاری کیا تھا۔ اور بعض ممتاز افراد نے اس سلسلے میں اپنے قرابت داروں کو محروم رکھا، جس پر بعد ازاں قانونی کارروائی بھی ہوئی۔[1] ان کشمکشوں کی تفصیلات میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اور نہ انہیں ہمارے موضوع سے کوئی تعلق ہے۔ ہمارے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ پنجاب میں انگریزی حکومت کے آغاز پر ٹوانوں کی امتیازی حیثیت

---

[1] "تحفۂ امیر" صفحہ ۱۴۷۔

بحال تھی اور وہ گذشتہ زمانے کی طرح فوجی خدمات انجام دینے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند تھے، البتہ ان کے طریقِ کارکردگی میں ایک بنیادی فرق پیدا ہو چکا تھا۔ اور وہ یہ کہ اب وہ پہلے کی طرح مشترک حیثیت میں کام نہ کر رہے تھے، بلکہ ہر فرد اور شاخ نے بالاستقلال خدمات انجام دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

دوسرا باب

ملک صاحب خاں ٹوانہ

تمہید

اب تک جو کچھ لکھا گیا، اسے کتاب کا دیباچہ یا مقدمہ سمجھنا چاہیئے ۔ مقصود یہ تھا کہ جس شخصیت کے حالات لکھنا منظور ہیں، اس کے خاندان کی ابتدائی سرگذشت سرسری طور پر سامنے آجائے ۔ تاکہ پتہ چل سکے، اس نے کن روایات کی آغوش میں تربیت پائی، نیز اندازہ ہو جائے ۔ کہ فوجی کارگزاریاں کس وجہ سے اب تک ٹوانوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہیں ۔ اب ہم ملک احمد یار خاں ٹوانہ کے جامع اوصاف فرزند ملک صاحب خاں کے حالات پر پہنچ گئے ہیں، جو ملک عمر حیات خاں ٹوانہ کے والد ماجد تھے اور یہیں سے ہماری کتاب کے اصل موضوع کا آغاز ہوتا ہے ۔

جنگی سرگرمیاں اور آبادکاری

گذشتہ ابواب کے ملاحظے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو چکی

ہو گی کہ ٹوانے جب سے تاریخ کے ساتھ روشناس ہوئے ، دو شغل ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے رہے ۔ اول جنگی سرگرمیاں، دوم آباد کاری ۔ انہوں نے جب سے پنجاب میں قدم رکھا تھا اپنی فوجی صلاحیت کی بنا پر بلند حیثیت حاصل کر لی تھی ، یعنی وسیع علاقے قبضے میں لے لئے جن میں وہ اعلیٰ پیمانے پر کھیتی باڑی کراتے تھے اور حکومتِ وقت کو جب جنگی خدمات کی ضرورت پیش آتی تھی ، ان کے لئے فوجی دستے تیار رکھتے تھے ۔ مختلف اوقات میں وہ حاکموں کو خراج بھی دیتے رہے ، لیکن عملاً انہیں انتظامی خود مختاری حاصل رہی ، سکھوں کے عہد میں بھی انہوں نے اپنا یہ امتیاز قائم رکھا ۔ انگریزی حکومت کے آغاز پر بھی ٹوانوں کا مشغلہ جنگی خدمات اور زمینوں کی آباد کاری کے سوا کچھ نہ تھا ۔

ملک صاحب خاں

ملک صاحب خاں کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ، قیاس یہ ہے کہ وہ انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے[1] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وہ پانچ بھائی تھے ۔ ملک قادر بخش خاں ، اور ملک عالم خاں ایک والدہ سے ، ملک جہان خاں اور ملک فتح خاں دوسری والدہ سے ، ملک صاحب خاں تیسری والدہ سے ۔ ان کی صرف ایک بہن تھی ، بھائی کوئی نہ تھا ٹوانہ سرداروں کی رشتہ داریاں مندیالوں سے بھی چلی آ رہی تھیں ، چنانچہ ملک صاحب خاں کی والدہ مندیال خاندان ہی سے تھی ۔

ملک قادر بخش خاں چونکہ فرزند اکبر تھا اور خاندان میں سرداری

---

[1] ملک خضر حیات خاں نے مجھے بتایا کہ مختلف ذریعوں سے چھان بین کرائی گئی تو ان کا سال ولادت ۱۸۰۸ء یا ۱۸۱۰ء ثابت ہوا ۔

رواجاً فرزند اکبر ہی سے مخصوص تھی ، اس لئے والد ماجد کی زندگی میں ملک قادر بخش خاں ہی کو تمام بھائیوں پر فوقیت حاصل رہی۔ جب ٹوانوں کا الگ جیش مرتب ہوا تو ملک قادر بخش خاں ہی اس کے کماندار بنے ۔ ملک عالم خاں اُن کے ماں جائے بھائی تھے ، اس لئے وہ سرداری کے امتیازات میں شریک سمجھے جاتے تھے ، یا کم از کم انہیں زندگی میں کسی پریشانی سے سابقہ پڑنے کا کوئی وسوسہ نہ تھا ۔ لیکن باقی تین بھائیوں یعنی صاحب خاں، جہان خاں اور فتح خاں کی حیثیت مختلف تھی ۔ ان سے برابری کا برتاؤ نہ ہو سکتا تھا ۔ اور وہ اپنا مستقبل اسی صورت میں بہتر بنا سکتے تھے کہ بہ طور خود سرگرم جدوجہد جاری رکھتے ۔ صورتِ حال کی یکسانی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دو ماؤں سے ہونے کے باوجود ان بھائیوں میں گہری محبت پیدا ہو گئی ۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ملک صاحب خاں نے مستقل کارکردگی میں نمایاں حیثیت پیدا کی تو اپنے دونوں سوتیلے بھائیوں کو برابر اپنے ساتھ رکھا۔

فتح خاں کا عہدِ اقتدار

ہم بتا چکے ہیں کہ سکھوں کی حکومت میں بھی ٹوانے فی الجملہ مشترکہ حیثیت میں کام کرتے تھے ۔ اور خاندان میں جس شخصیت کو نمایاں حیثیت حاصل ہو جاتی تھی ۔ دوسرے افراد اسی سے وابستہ رہتے تھے ۔ اور اسی کے کاروبار میں امداد دیتے تھے ۔ چنانچہ جب احمد یار خاں کو قبیلے میں رئیس و سردار کی حیثیت حاصل تھی تو سب اسی کے ہمراہ تھے۔ جب اس کے بھتیجے ملک فتح خاں کے عروج کا آغاز ہوا تو سارا خاندان اس کا معاون بنا رہا ، ملک فتح خاں کو کسی علاقے کی حکمرانی کا منصب مل جاتا تھا ۔ تو وہ خاندان کے تمام افراد کو اپنے

ماتحت کاردار بنا لیتا تھا۔ تحفۂ امیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۲ء میں اسے منصب حکومت ملا تو اس نے دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کے علاوہ ملک صاحب خان کو بھی لکی مروت کا ناظم بنا دیا[1]۔ جب جواہر سنگھ نے ملک فتح خاں کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی گورنری پر مامور کیا تو اس وقت بھی ملک صاحب خان کو لکی مروت ہی کا نظم و نسق سپرد کیا گیا[2]۔

ملک صاحب خان کی علیحدگی

خاندانی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک صاحب خان نے نیز بعض دوسرے عزیزوں نے انجام کار ملک فتح خاں سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ خاصی چھان بین کے بعد اس علیحدگی کے دو سبب معلوم ہو سکے۔

۱۔ ملک فتح خاں نے بعض ایسے اصحاب کو مشیر و مختار بنا لیا تھا جو اہل خاندان کے نزدیک اعتماد کے لائق نہ تھے۔ چونکہ ملک فتح خاں تمام معاملات میں انہیں لوگوں کی رائے پر چلتا تھا۔ اس لئے بعض اہل خاندان کو دست کشی ہی مناسب معلوم ہوئی۔ ان میں ملک صاحب خان پیش پیش تھے۔

۲۔ ملک فتح خاں بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ لیکن اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ مثلاً وہ خاندان کے کسی ایسے فرد کو پسند نہ کرتا تھا، جو خدا داد قابلیت و صلاحیت کی بنا پر ترقی کرتے کرتے خود اس کا رقیب بن سکے۔ ایسے آدمیوں کو قتل کرا دینے میں بھی اسے تامل نہ ہوتا تھا، ملک صاحب خان چونکہ جنگی اور انتظامی صلاحیتوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا، لہذا اسے ملک فتح خاں سے وابستہ رہنا

---

[1] "تحفۂ امیر" صد ۱۰۳ [2] ایضاً صد ۱۱۹

قرینِ احتیاط معلوم نہ ہوا

بہ ہر حال ملک صاحب خاں نے فتح خاں کے ماتحت کارداری کی خدمت کے ترک کا فیصلہ کر لیا۔ جب فتح خاں اجازت دینے پر راضی نہ ہوا۔ تو ملک صاحب خاں سب کچھ لکی مروت میں چھوڑ کر یکہ و تنہا خالی ہاتھ نکلا اور منڈیالوں کے پاس ہڈالی پہنچ گیا، جہاں اس کی ننھال تھی۔ انہیں سے صلاح مشورہ کے بعد طے کیا کہ آزادانہ ملازمت کر لی جائے، اگرچہ وہ کتنی ہی معمولی ہو۔

مستقل ملازمت

مستقل ملازمت کے متعلق خاندانی روایات نہایت دلچسپ ہیں۔ ملک صاحب خاں کے پاس جو کچھ تھا۔ اسے لکی مروت چھوڑ آیا تھا۔ ننھال سے ایک گھوڑا لیا۔ والدہ نے ملک چراغ خاں کی تلوار دی جو ملک احمد یار خاں کا بھائی تھا۔ اس تلوار کے متعلق عام شہرت یہ تھی کہ اگر سانڈنی سوار کے سر پہ ماری جاتی تو سوار اور سانڈنی دونوں کو کاٹ کر رکھ دیتی۔ یوں ملک صاحب خاں مستقل ملازمت کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں سکھوں کا ایک لشکر ملا۔ اس کے سالار سے نوکری کی درخواست کی۔ اس نے پوچھا، کیسی نوکری چاہتے ہو؟ جواب دیا، جیسی مل جائے، سالار بولا، میرے پاس تو بے قاعدہ فوج میں سات روپے کی اسامی خالی ہے۔ ملک صاحب خاں نے وہی قبول کر لی، سکھ سالار حیران ہوا کہ چہرے مہرے سے معزز آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ معمولی سی ملازمت پر راضی ہو گیا ہے؟

پہلی ہی لڑائی میں ملک صاحب خاں کے جوہر کھلے تو اسے باقاعدہ فوج میں لے لیا گیا۔ مزید دو ہفتے گزرنے پر ایک اونچا عہدہ دے دیا گیا۔ چند روز بعد ایک سخت لڑائی پیش آئی، جس میں سپہ سالار

دشمنوں کے درمیان گھر گیا۔ ملک صاحب خاں نے اپنے ہاتھ سے بہت سے آدمی قتل کر کے سالار کو بچایا۔ یہ کارنامہ دیکھ کر سالار نے ملک صاحب خان کو کمانڈر کے منصب پر مقرر کر دیا۔ ملک صاحب خاں نے اپنے دونوں بھائیوں، جہان خاں اور فتح خاں کو بھی پاس بلا لیا، اور جب تک ان کے لئے مستقل جائیدادوں کا انتظام نہ کر دیا، الگ نہ کیا۔ نظر بظاہر یہ واقعہ ملک فتح خاں کی نظامت ڈیرہ کے آخر دور کا ہے؛

لوگ ملازمتوں کیلئے سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ اپنی خاندانی حیثیت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، تاکہ ابتداء ہی میں اچھا عہدہ مل جائے۔ لیکن ملک صاحب خان نے اللہ کے فضل کے بعد صرف ذاتی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا اور کسی سہارے یا امداد کے بغیر تھوڑی ہی مدت میں وہ اس اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے، تاہم غور کیجئے کہ جب ان کی ملازمت کا آغاز ہوا تھا تو کیا کسی شخص کے قیاس میں بھی یہ بات آ سکتی تھی۔ کہ وہ اسقدر جلد اعلیٰ منصب حاصل کر لیں گے؟ اس واقعہ سے ملک صاحب خان کی سیرت اور ذاتی اوصاف ومحاسن پر نہایت تیز روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے کسی بھی دور میں سہاروں کی تلاش نہ کی، ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کے اونچے مدارج پر پہنچ گئے۔

ملک عمر حیات خاں کا بیان

ملک عمر حیات خاں نے خود نوشت سوانح عمری میں اپنے والد ماجد کے اس دور کے حالات اختصاراً یوں بیان کئے ہیں

جب میرے والد نے دیکھا کہ جائیداد اور کرسی (درباری اعزاز) قدرتاً بڑے بھائی کو جاتی ہے، جس طرح ولایت میں

بھی خصوصاً لارڈز میں بھی ہوتا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی ..... جب انہوں نے اپنا کیریر شروع کیا تو سکھوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے - پہلی ہی لڑائی میں اپنے سکھ سردار کے سامنے بہادری سے لڑے - جب سکھ سردار گھر گیا تو تیس آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے مارا اور سردار کی جان بچائی ، اس خدمت کے صلے میں اسی دن انہیں افسر بنا دیا گیا - اسی طرح روز بروز ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ افسر بن گئے -

بسال پر سکھوں نے دو دفعہ فوج کشی کی، اور ناکام رہے۔ آخر ایک فوج میرے والد کے ماتحت روانہ ہوئی، جس میں توپ خانے کے اعلیٰ افسر کرنیل سکندر خاں تھے[1] توپیں گولے برسا چکیں تو میرے والد نے فوج کو حملے میں لیڈ کیا اور مورچہ فتح کر لیا - وہ مروت میں بھی حاکم رہے، جہاں ان کے نام کے کوئیں ہیں -

---

[1] - کرنیل سکندر خاں جرنیل الٰہی بخش خاں کے فرزند تھے، جنہیں رنجیت سنگھ کی فوج میں توپ خانے کا اعلیٰ افسر ہونے کے لحاظ سے خاص شہرت حاصل تھی ان کی اولاد موجود ہے - ملک صاحب خان اور جرنیل الٰہی بخش خاں کے خاندان میں جو گہرا تعلق پیدا ہوا تھا - وہ پشتیں گزر جانے کے باوجود اب تک بدستور استوار ہے -

تیسرا باب

پنجاب میں انقلاب

(۱)

سکھ اور انگریز

اب ہم پنجاب کی سرگزشت کے اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں، جب سکھوں اور انگریزوں کی پہلی جنگ نے سکھ حکومت کی بنیادی کمزوری کے تمام پہلو عالم آشکارا کر دیئے اور یہاں انگریزوں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ سکھوں کی حکومت رنجیت سنگھ کی زندگی تک خاصی مضبوط و مستحکم نظر آتی تھی، اگرچہ اس کی عام حیثیت ایک عارضی فوجی غلبے سے زیادہ کچھ نہ تھی، رنجیت سنگھ کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہاں یکے بعد دیگرے جو انقلابات آئے، انہوں نے استحکام کا نمائشی پردہ بھی تار تار کر کے رکھ دیا۔ پنجاب کی کثیر آبادی سکھوں کے غیر مناسب طرزِ عمل سے نالاں تھی، انگریزوں کی آمد کے بعد سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی تھی کہ اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو کم از کم سکھوں کے مقابلے میں انگریز ترجیح کے مستحق

ہیں، اس لئے کہ ملک کا انتظام درست کر دیں گے۔ بے اطمینانی اور بے یقینی کی وہ حالت باقی نہ رہے گی، جو سکھوں کے آخری دور کا خاصہ بن گئی تھی، اُس وقت تک سکھوں کی حکومت بظاہر قائم تھی۔ دلیپ سنگھ مسند حکومت پر بیٹھا تھا، چند افراد کی انتظامی کونسل بن گئی تھی جو انگریز ریذیڈنٹ کے مشورے سے نظم و نسق کا کاروبار چلا رہی تھی۔ متعدد انگریز کارکُن مختلف حصّوں کے انتظام پر مامور ہو چکے تھے۔

ساتھ ساتھ مختلف سکھ کارداروں، مذہبی پیشواؤں اور فوجیوں میں بے چینی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اگرچہ انتظامی سطح ساکن تھی، لیکن اس کی تہہ میں بغاوت اور سرکشی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، اس موقعہ پر ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر عام آبادی کی خواہش یہی تھی کہ اس قوت کو تقویت پہنچائی جائے، جو بدنظمی اور افراتفری کو ختم کر سکے، اور عوام کیلئے اطمینان و دل جمعی کا سانس لینے کا موقع بہم پہنچا سکے۔

بغاوت کے شعلے

دیوان مول راج ناظم ملتان کی بغاوت نے سکھوں کے بے چین عناصر کے لئے کھُل کھیلنے کا سامان فراہم کر دیا، چنانچہ پنجاب میں جگہ جگہ ہنگامے بپا ہو گئے، بدامنی کے ان شعلوں کو فرو کرنے کیلئے سکھ دربار اور انگریز ریذیڈنٹ مشترکہ حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ ٹوانہ سرداروں نے بھی دربار سے وابستگی کی بنا پر اپنی خدمات انگریزوں کے سامنے پیش کر دیں، چنانچہ وہ پہلے جنرل ڈھیلر[1] کی فوج میں شامل رہے، پھر انہیں مختلف حصّوں میں بغاوتیں فرو کرنے کے لئے مقرر

---

[1] General Wheeler -

کر دیا گیا - بعض مقامات پر وہ اپنے بھائیوں اور ملازموں کو ساتھ لے کر لڑے بعض مقامات پر انہوں نے لنگہ خاں ساکن ساہیوال کے اشتراک سے اہم کارنامے انجام دیئے - ان میں سے رجوعہ اور چاچڑاں کی لڑائیاں بہ طور خاص اہم ہیں - سب سے آخر میں وہ چلیاں والا اور گجرات کی لڑائیوں میں شریک رہے - بڑے بڑے انگریز افسروں اور خود سکھ دربار نے ان کی شاندار خدمات کا اعتراف نہایت تحسین آمیز الفاظ میں کیا،

بھائی مہاراج سنگھ

بھائی مہاراج سنگھ سکھوں کا مذہبی پیشوا تھا - مول راج کی بغاوت کے بعد اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہبی فرض قرار دیکر سکھوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور کچھ پیشیں گوئیاں بھی کیں کہ بہت جلد سکھوں کو فتح حاصل ہوگی - ملک صاحب خاں کا پہلا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے بھائی مہاراج سنگھ کا تعاقب کیا اور اس کے ساتھیوں کو مار مار کر منتشر کر دیا - چنانچہ پیپل گرفن نے لکھا ہے - کہ ملک صاحب خاں اور لنگہ خاں (رئیس ساہی وال) طویل تعاقب کے بعد سب سے پہلے جھنگ پہنچے اور بھائی مہاراج سنگھ پر حملہ کیا - ملک صاحب خاں نے شخصاً بھائی مہاراج سنگھ کے متعدد ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا [1]

غالباً اسی لڑائی میں بھائی مہاراج سنگھ نے دریا میں کود کر جان بچائی تھی اور کچھ مدت تک سمجھا جاتا رہا کہ وہ دریا میں ڈوب گیا - حالانکہ وہ بچ نکلا تھا - تاہم بعد ازاں وہ کچھ نہ کر سکا - اگر بر وقت اس کی سرکوبی نہ ہوتی تو اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے ہنگامہ دور دور تک پھیل جاتا -

---

[1] پیپل گرفن: جلد دوم ص ۲۰

دربار کا نامۂ خوشنودی اس کارنامے کے سلسلے میں دربار لاہور نے ۱۰ جون ۱۸۴۸ء کو ملک صاحب خاں کے نام جو نامۂ خوشنودی جاری کیا وہ بجنسہ ذیل میں درج ہے

تہور و شجاعت دستگاہ صاحب خاں ٹوانہ حفظہ۔

ایشاں در اندفاع مفسدۂ بھائی
مہاراج سنگھ مفرور از وفور مردانگی
و ہمت جانفشانیہائے شائستہ
و تردّدات بائستہ در خدمت
مہاراجہ صاحب مشفق و مہربان
مہاراجہ دلیپ سنگھ بہادر ہنگام
مقابلہ و محاربہ بہ بھائی مذکور
نمودند و حق نمک ادا کردند
ایں چنیں مردانگی و نمک حلالی
از ایشاں واسطۂ خوشنودی خاطر
حضور و لائق احسنت و آفرین
بودہ است، لہذا پروانۂ ہذا
بہ طور خوش نامی قلمی گشتہ و
بعد رسیدن فہرست اسامی
شاملان مقتولاں و مجروحاں
خلعت و انعام بہ ہر یک
دادہ خواہد شد۔

بھائی مہاراج سنگھ مفرور کے
فتنے کی روک تھام اور اس
سے لڑائی کے وقت آپ
نے انتہائی ہمت و مردانگی
سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی
خدمت کے سلسلے میں نمایاں
جانفشانی اور کوششیں کیں
گویا حق نمک ادا کر دیا۔ ایسی
مردانگی ہمت اور نمک حلالی
حضور کے لئے خوشنودی قلب
کا باعث ہوئی اور یہ آفرین
کی مستحق ہے۔ لہذا آپ کی
نیک نامی کے لئے یہ پروانہ
لکھا جاتا ہے۔ جب آپ کی
فوج میں شامل ہونے والے
لوگوں نیز مقتولوں اور مجروحوں
کی فہرست موصول ہو جائے گی
تو ہر ایک کو خلعت و انعام دیا جائے گا۔

اس نامۂ خوشنودی پر ریزیڈنسی کے میر منشی سید رجب علی

کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ جنھیں ارسطو جاہ کا خطاب حاصل تھا۔

انگریز ریزیڈنٹ کا اعتراف خدمات

اس زمانے میں دربار لاہور کا مستقل انگریز ریزیڈنٹ ہنری لارنس[1] رخصت پر تھا اور فریڈرک[2] کری ریزیڈنٹ کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس نے ملک صاحب کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ۱۸ر جون ۱۸۴۸ء کو جو خط لکھا، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

صاحب خاں ٹوانہ نے بھائی مہاراج سنگھ کے تعاقب اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے سلسلے میں نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ وہ اور لنگر خاں طویل تعاقب کے بعد سب سے پہلے جھنگ پہنچے۔ بھائی مذکور پر اولیں حملے کے وقت موجود تھے اور اس میں شریک رہے اس حملے میں صاحب خاں نے بھائی مذکور کے متعدد باغی ساتھیوں سے جنگ کی اور انھیں اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ مہاراجہ کی حکومت کی جانب سے بہ ہمہ وجوہ قدر شناسی کے مستحق ہیں اور انھیں ضرور موزوں معاوضہ ملنا چاہیے

فارسی کے پرانے خطوط و مراسلات

حسن اتفاق سے ۱۸۴۸-۴۹ء کے بعض فارسی خطوط و مراسلات کا ایک مجموعہ ہاتھ آگیا۔ جن سے اس دور کے حالات اور ملک صاحب خاں کی شاندار سرگرمیوں پر مزید روشنی پڑتی ہے: چونکہ اس زمانے میں ملک صاحب خاں

ٹوانہ اور لنگر خاں ساہی والیہ مختلف لڑائیوں میں مشترکہ طریق پر کام کرتے رہے تھے۔ اس لیئے متعدد خطوط دونوں کے نام لکھے گئے۔ مثلاً

۱۔ ۲۰ نومبر ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں مرقوم ہے کہ آپ حضرات (ملک صاحب خاں اور لنگر خاں) کے گھیانہ پہنچنے اور جھنگ کا محاصرہ کر لینے کے حالات معلوم ہوئے۔ ان جانفشانیوں سے آپ کی ہمت، جوانمردی، نمک حلالی اور خیر خواہی احسن طریق پر آشکارا ہو گئی۔

۲۔ دسمبر ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں مرقوم ہے کہ ملک صاحب خاں نے نرائن سنگھ مفسد کا تعاقب چنیوٹ تک کیا اور چنیوٹ کو محصور بھی کر لیا۔

۳۔ ایک مکتوب میں جس پر سمت ۱۹۰۵ء ثبت ہے، یہ بتایا گیا ہے کہ ملک صاحب خاں نے ایک سکھ سردار کو شکست فاش دی۔ اس کے خیمے اور اسلحہ لوٹے اور اس کے ساتھیوں کو دریا میں غرق کیا۔ خط کے آخر میں ان واقعات پر خوشنودی کا اظہار کیا گیا ہے۔

۴۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب شیخ امام الدین سابق ناظم کشمیر نے ملک صاحب خاں ٹوانہ اور لنگر خاں کی شجاعت و خدمت گذاری کی تفصیلات فراہم کر کے حکومت کے بڑے بڑے کارکنوں اور انگریز حاکموں تک پہنچائیں۔

چوتھا باب

پنجاب میں انقلاب

(۲)

جنگ رجوعہ اس دور کا ایک اہم کارنامہ رجوعہ کی لڑائی ہے جس کی کوئی تفصیل تاریخوں میں نہیں ملتی، تاہم مقامی شاعروں نے اس جنگ کے واقعات بڑے اہتمام سے نظم کیئے۔ جنھیں پنجاب کی اصطلاح میں "بار" کہتے ہیں اور کم و بیش ایک سو سال سے یہ "بار" بڑے بڑے مجمعوں میں سنائی جاتی ہے۔

رجوعہ ضلع جھنگ میں سیّدوں کا ایک مشہور گاؤں ہے۔ ۱۸۴۸ء میں سیّد نوبہار شاہ وہاں کے ایک ممتاز فرد تھے۔ سکھوں نے ان کے گاؤں کے ارد گرد مورچے بنالیے۔ پھر معمول کے مطابق سیّد نوبہار شاہ کو پیغام بھیجا کہ بہت بڑی رقم ہمارے حوالے کی جائے ورنہ ہم گاؤں کو تباہ کر ڈالیں گے۔

سید نوبہار شاہ کے پاس اتنی رقم نہ تھی، لہذا انھوں نے

تھوڑی سی مہلت مانگی ۔ اس اثناء میں ملک صاحب خاں کو پیغام بھیجا کہ اگر اس موقع پر میری مدد نہ کی گئی تو میرے اہل و عیال اور رجوعہ کے مسلمانوں کی عزت و آبرو برباد ہو جائے گی ۔ میں آل رسولؐ ہوں اور زیادہ سے زیادہ امداد کا حق دار ہوں ۔

ملک صاحب خاں فوراً امداد کے لیے تیار ہو گئے ۔ اپنے بھائیوں ملک جہان خاں اور ملک فتح خاں کو بھی ساتھ لے لیا ۔ صرف تین سو سوار لے کر رجوعہ پہنچ گئے ۔

ملک صاحب وقت کے مشہور سردار تھے ۔ ان کی آمد کی خبر سن کر سکھوں پر ہراس طاری ہو گیا ۔ لیکن وہ رقم وصول کیے بغیر رجوعہ کا محاصرہ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ آخر لڑائی ہوئی جس میں سکھوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے ۔ سید نوبہار شاہ نے ملک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انھیں دعائیں دیں ۔ ارد گرد سے جو لوگ سادات کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے تھے انہوں نے ملک صاحب کو پھولوں کے ہار پہنائے ۔ اس جنگ میں دشمن کا جو مال اسباب ملک صاحب کو ملا آپ نے وہ بھی سید نوبہار شاہ کے حوالے کر دیا ۔ اس واقعہ سے سادات رجوعہ اور ٹوانوں میں گہرے دوستانہ روابط کی ابتدا ہوئی ۔

ان علاقوں میں سادات کو اب بھی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۔ آج سے سو سال پیشتر سادات کا احترام بدرجہا زیادہ بڑھا ہوا تھا ۔ ملک صاحب خاں اکثر کہا کرتے تھے کہ رجوعہ کی لڑائی میں میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ آلِ رسولؐ

کی عزت و حرمت محفوظ رکھنے میں جان بھی چلی جائے تو دریغ نہ کروں گا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ میری اس خدمت کو قبول کرے اور میری عاقبت بخیر ہو۔

رجوعہ سے جو سکھ بھاگے تھے وہ چنیوٹ اور اس کے آس پاس کی پہاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ مقامی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک صاحب خاں نے ان کا تعاقب کیا اور سکھوں سے لڑائی اس مقام پر ہوئی، جہاں آج کل ربوہ کی نو آبادی قائم ہوئی ہے۔

جنگ چاچڑاں

ملک صاحب خاں نے سکھوں کا تعاقب نہ چھوڑا۔ جہاں انھیں کسی چھوٹے بڑے اجتماع کی خبر ملتی، وہاں بجلی کی تیزی سے پہنچ جاتے۔ انھیں ایک بہت بڑی لڑائی چاچڑاں میں پیش آئی، جو جھاوریاں کے قریب واقع ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ سکھ جھاوریاں میں جمع ہو رہے ہیں تو وہ اپنی چھوٹی سی جمیعت لے کر ادھر روانہ ہو گئے۔ سکھوں کو ملک صاحب کی آمد کا حال معلوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئے اور چاچڑاں کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ "تحفہ امیر" کا بیان ہے، ملک صاحب اس لڑائی میں اتنی دیر تک تلوار چلاتے رہے کہ ان کا ہاتھ قبضے میں سوج گیا اور جنگ کے خاتمے پر قبضہ کاٹ کر تلوار ان کے ہاتھ سے الگ کی گئی[1]

---

[1] "تحفہ امیر" صفحہ ۱۴۰

اسسٹنٹ انگریز ریزیڈنٹ کاکس کے ایک مراسلے سے واضح ہوتا ہے کہ ملک صاحب خاں نے بمقام چاچڑاں تین سو سواروں کے ساتھ دشمن کے ایک گروہ پر حملہ کیا جو تعداد میں چار گنا تھا اور شدید خونریزی کے بعد اسے شکست دی۔

"تاریخ جہاں نما" کا بیان زیادہ تفصیلات کا حامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھ جمعیت کم و بیش ایک ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی اور اس کے ساتھ آٹھ زنبورے تھے۔ ملک صاحب نے یہ کیفیت معلوم کرنیکے بعد فیصلہ کیا کہ حملے میں پیش دستی کی جائے۔ بھائیوں میں قرار پایا کہ سب سے پہلے خود ملک صاحب خاں حملہ کریں، پھر ملک جہان خاں کا حملہ ہو اور آخر میں ملک فتح خاں سکھوں پر ضرب لگائیں۔ سکھ زنبوروں کی گولہ باری نے ٹوانہ فوج کو بہت پریشان کیا۔ لیکن ان بہادروں کے پے درپے حملوں نے سکھوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ ملک صاحبان کے علاوہ مردان علی شاہ اور پہلوان علی شاہ ساکنان بدیال نے اس جنگ میں بڑی بہادری دکھائی۔ اوّل الذکر کی پنڈلی میں گولی لگی۔ ملک صاحب خاں نے ایک خوبصورت گھوڑی اور نقد رقم انعام میں دی۔ اس لڑائی میں تقریباً پان سو سکھ مارے گئے [۱]

کاکس اور لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں ملک صاحب نے سکھوں کے چار زنبورے قبضے میں لے لیے۔ "تحفہ امیر" میں دو توپوں پر بھی قبضے کا ذکر ہے۔ فارسی خطوط و مراسلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے سکھوں سے پانچ زنبورے چھینے تھے۔

چیلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیاں

دیوان مول راج نے محاصرے کے بعد ہتھیار ڈال دیے تھے، لیکن سکھوں سے انگریزوں کو دو بڑی لڑائیاں پیش آئیں۔ پہلی چیلیانوالہ میں جو جنوری ۱۸۴۹ء میں ہوئی اور دوسری گجرات میں جو پہلی لڑائی سے تقریباً ایک ماہ بعد پیش آئی۔ دونوں لڑائیوں میں سکھوں نے شکست فاش کھائی۔ "تحفہ امیر" کا بیان ہے کہ چیلیانوالہ کی لڑائی میں ملک صاحب خاں اور ان کے ہمراہیوں نے بہت سے سکھ مارے۔ رام سنگھ چھاپے والے کے کیمپ پر عقب سے ایسا شدید حملہ کیا کہ سکھ لشکر درہم برہم ہوگیا۔ ملک صاحب نے اپنے ہاتھ سے رام سنگھ کا سر کاٹا۔ انھیں کے حملے نے باقی رؤسائے پنجاب کی فوجوں کے حوصلے بھی بڑھائے[2]۔

ادائے فرائض کے علاوہ ملک صاحب کو ایک ذاتی رنج بھی تھا اور وہ یہ کہ سکھوں نے ان کے چچیرے بھائی ملک فتح خاں موتیاں والا کو بنوں میں بیدردی سے شہید کیا تھا۔

ملک صاحب کی سیر چشمی

جنگ گجرات کے بعد انگریزوں نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے ان تمام سرداروں کو انعامات اور جاگیریں دیں، جو بدامنی کے دور میں ان کے ساتھ رہے تھے۔ ملک صاحب خاں ان میں سے کسی چیز کے پیچھے نہ پڑے اور پہلے کی طرح اطمینان سے کھیتی باڑی کرانے میں مصروف ہو گئے۔

---

[1] "تاریخ جہاں نما" صفحہ ۶۱۰ ؛ [2] "تحفہ امیر" صفحہ ۱۴۲ ؛

وہ سالہا سال تک ایک اچھی فوج کے سالار رہے تھے اور ان کے پاس خاصے ہتھیار جمع ہو گئے تھے۔ یہ ہتھیار انہوں نے ایک محفوظ مقام پر دفن کرا دیے۔

غالباً اسی زمانے میں میگھا ان کے حوالے کیا گیا۔ یہ دریائے جہلم کا ایک مشہور گھاٹ تھا۔ لیکن یہاں متواتر ڈاکے پڑتے رہتے تھے۔ جب حکومت کو قیامِ امن اور حفاظتِ رعایا کی کوئی اچھی صورت نظر نہ آئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک صاحب خاں کو اس مقام کا انتظام سونپ دیا جائے، چنانچہ انھوں نے ڈکیتی کی وارداتوں کا بھی انسداد کیا اور افتادہ زمینیں آباد کرا کے کھیتی باڑی کا انتظام بھی کر لیا۔ لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ ملک صاحب خاں کو زمینوں کی آبادکاری کے علاوہ گھوڑے پالنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے مقامی گھوڑوں کی نسل بہتر بنانے کے لیے خاص کوششیں کیں۔ ملک شیر محمد خاں اور ملک فتح شیر خاں ٹوانہ خاندان کے بڑے سردار مانے جاتے تھے۔ ان کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے۔ لیکن ملک صاحب خاں ان جھگڑوں سے بالکل الگ رہے۔ راست بازی عدل اور دیانت میں انھوں نے بہت ممتاز حیثیت حاصل کر لی[1]

---

[1] لیپل گرفن جلد دوم ص ۲۰۴-۲۰۵

پانچواں باب

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ

— ۱ —

ہنگامہ

انگریز ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قابض ہوئے تھے۔ چھ سات سال اطمینان سے گزر گئے۔ اس اثنا میں ملک صاحب خاں کی توجہ تمام تر زمینوں کی آبادکاری پر مبذول رہی۔ حکام دوسرے ممتاز اصحاب کی طرح انھیں بھی اعزازی طور پر عدالتی اختیارات دینا چاہتے تھے، لیکن ملک صاحب نے یہ اعزاز قبول نہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں یکایک اس ہنگامے کا آغاز ہو گیا، جسے انگریز "غدر" سے تعبیر کرتے رہے۔ حال میں اہلِ ملک نے اسے آزادی کی پہلی جنگ یا انقلاب کی پہلی کوشش قرار دیا۔

اس کے اسباب مدت سے پیدا ہو چکے تھے، جن میں بعض انگریز حاکموں کی کوتاہ اندیشی کے باعث برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے ہنگامہ شروع ہوا۔ وہاں کی فوج انگریز افسروں کو قتل کر کے دہلی پہنچ گئی اور آخری تاجدار سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ثانی کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی کی آگ بھڑک اٹھی۔

اس ہنگامے کے مقاصد اور ان کے متعلق نقطۂ نگاہ کے

اختلاف بہر بحث پیش نظر موضوع سے خارج ہے، لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں آج تک کسی کو بھی تامل نہ ہوا کہ نہ یہ تحریک ایسی تنظیم کے ماتحت شروع ہوئی تھی جو کامیابی کے لیے لازم ہوتی ہے اور نہ ہنگامے میں حصّہ لینے والوں نے جوش کی حالت میں نیک و بد یا جائز و ناجائز کے حدود ملحوظ رکھے۔ بالکل یہی طرزِ عمل کامیابی کے فوراً بعد انگریز حاکموں نے اختیار کیا جس پر انجام کار اہل ملک اور انگریز دونوں کو افسوس ہوتا رہا۔

پنجاب کے خاص حالات

اس سلسلے میں پنجاب کے حالات ملک کے باقی حصّوں سے بالکل جداگانہ تھے۔ یہاں عالمگیر کی وفات کے کچھ ہی دیر بعد سکھوں کے چھاپے شروع ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے اہل پنجاب انتہائی مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔ ۱۷۶۵ء میں تین سکھ سرداروں نے لاہور میں مشترکہ حکومت قائم کر لی، جن کی دراز دستیوں سے تنگ آکر اہلِ لاہور نے ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ کو خفیہ دعوت دے کر بلایا اور لاہور پر قبضہ کرا دیا۔ انھیں امید تھی کہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امن کا سانس لینا نصیب ہوگا۔ اگرچہ انتظام میں کسی قدر بہتری پیدا ہوئی، لیکن پنجاب کی عام آبادی بڑی خوفناک مصیبتوں کا شکار رہی۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جو دور شروع ہوا تھا، وہ تو حقیقتاً یہاں کے باشندوں کے لیے ایک عذاب الیم تھا۔ انگریزوں نے اس عذاب الیم سے لوگوں کو نجات دلائی،

لہذا وہ انگریزی حکومت کے متعلق اس رائے کے حامی نہ ہو سکتے تھے، جس پر ملک کے دوسرے حصوں کی بعض آبادیوں نے عمل کیا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پنجاب میں جہاں جہاں ہنگامے بپا ہوئے، وہ پنجابیوں نے نہیں بلکہ ہندوستانیوں نے بپا کیے تھے۔ پنجابیوں نے تو ایک سے زیادہ موقعوں پر درخواست کی تھی کہ انھیں ہندوستانی فوجیوں سے الگ رکھا جائے۔

پنجاب کے اکثر رئیسوں اور خود ٹوانوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوال یہ تھا کہ آیا وہ فوج میں مدراسیوں اور پوربیوں کی برتری کو گوارا کریں؟ اگر وہ اس موقع پر حکومت کا ساتھ نہ دیتے۔تو یقیناً فوج میں ان کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ ایک قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ سکھ جن کے ہاتھ سے پنجاب کی حکومت چھنی تھی، اس موقع پر اجتماعی حیثیت میں حکومت کے ساتھ ہو گئے تھے اور اہلِ پنجاب کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا جنگ کے بعد وہی فوجی امتیازات کے مالک بن جائیں اور اہلِ پنجاب ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے تک جن آفتوں اور پریشانیوں کا ہدف بنے رہے تھے، وہ نئی شکل میں دوبارہ ان پر مسلّط ہو جائیں۔ یہ حالات و اسباب تھے، جن کی بنا پر ٹوانوں نے آگے بڑھ کر حکومت کی اعانت کی۔ یہی اقدام انگریزی فوج میں پنجابی عنصر کی برتری کا موجب بنا اور آج پاکستان جس فوج پر نازاں ہے، اس کا بنیادی پتھر ۱۸۵۷ء ہی میں رکھا گیا تھا۔ غرض دوسرے رئیسوں اور ٹوانہ سرداروں کی طرح ملک صاحب خاں نے بھی اس موقع پر حکومت کا ہاتھ بٹانے میں کوشش

کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔

ملک صاحب خاں کا واقعہ

خاندانی روایت کے مطابق امداد کے بیٹے ملک صاحب خاں کے تیار ہونے کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے ۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بعض غرض مندوں نے خفیہ شکایتیں کی تھیں کہ ملک صاحب موصوف نے بہت سے اسلحہ کسی محفوظ مقام پر دبا رکھے ہیں ۔ انگریز حاکم اس قسم کی کسی حرکت کے روادار نہ ہو سکتے تھے ۔ انھوں نے بہتیری چھان بین کرائی، لیکن ان ہتھیاروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا ۔ "غدر" بپا ہوا تو ایک سرکاری ہرکارہ ڈپٹی کمشنر کا خط لے کر ملک صاحب کے پاس پہنچا کہ ایک نہایت ضروری کام در پیش ہے۔ فوراً آ کر ملیے ۔

انھیں "غدر" کے متعلق کوئی علم نہ تھا ۔ فوری طلبی کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ پھر کسی نے ہتھیاروں کے متعلق شکایت کر دی ہے ۔ کچھ عجب نہیں کہ گرفتاری عمل میں آئے، لہذا اپنے چند خاص جانباز رفیق طلب کر لیے، جن میں سے چودھری ہوتا خاں بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ انہیں تاکید کر دی کہ اگر ڈپٹی کمشنر مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کرے تو ایک دم حملہ کر کے گرفتار کرنے والوں کو قتل کر دینا ۔ پھر ہم بھاگ کر آزاد علاقے میں پہنچ جائیں گے ۔ خزانے میں ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ جمع تھا ۔ وہ اپنے ایک خاص آدمی کے حوالے

کرتے ہوئے حکم دے دیا کہ جب ہمارے فرار کی خبر ملے ۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ ، تو روپیہ ہمارے آدمیوں میں تقسیم کر دینا اور ناموس کی حفاظت کے لئے مستورات کو موت کے گھاٹ اتار دینا ۔

ڈپٹی کمشنر سے ملاقات

ان انتظامات کے بعد وہ اپنے جانباز رفیقوں کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچے ۔ اطلاع ہوتے ہی اس نے فوراً تنہا ملک صاحب کو اندر بلا لیا ۔ اور دروازہ بند کرا دیا ۔ ڈپٹی کمشنر کی غرض یہ تھی کہ ملک صاحب کو ہنگامے کی اطلاع علیحدگی میں دے ، ملک صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ سب گرفتاری کے مقدمات ہیں ۔ ان کے جانباز ساتھی چودھری ہوتا خاں کی قیادت میں باہر تیار کھڑے تھے کہ موقعہ پاتے ہی ہلہ بول دیں ، ادھر دروازہ بند کراتے ہی ڈپٹی کمشنر نے ملک صاحب کو بتایا کہ میرٹھ میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی ہے ، اور اس موقعہ پر سرکار آپ سے مدد کی طلبگار ہے ۔ وہ کچھ تفصیلات بتانا چاہتا تھا ، ملک صاحب کی نظر دروازے پر جمی ہوئی تھی اور انہیں یہ خدشہ پریشان کر رہا تھا ۔ کہ دو چار لمحے اور گذر گئے تو ممکن ہے ، ساتھی حملہ کر دیں ۔ ڈپٹی کمشنر ملک صاحب کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے ساتھیوں کو اطمینان دلائیں ، پھر صاحب کی بات سنیں ، آخر انہوں نے بیتاب ہو کر ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ مجھے ایک منٹ کی اجازت دیجئے ۔ دروازہ کھول کر اپنے آدمیوں سے کہا کہ سب حالات ٹھیک ہیں ۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ ۔ میں ابھی بات کر کے آتا ہوں ۔

امداد پر آمادگی

ملک صاحب نے ہر ممکن امداد پر آمادگی ۔۔۔ ظاہر کی ۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ ہتھیار ہمارے

پاس ہیں نہیں، البتہ روپیہ جتنا درکار ہو، خزانے سے لے لیجئے۔ ملک صاحب نے جواب دیا کہ روپے کی ضرورت نہیں، ہتھیار میں نے ایسے ہی نازک موقعوں کے لئے سنبھال رکھے تھے، اجازت ہو تو نکال لوں۔ ڈپٹی کمشنر نے اجازت دیدی

اس طرح ملک صاحب نے تین سو سواروں کا جیش تیار کیا، جو کم دبیش دو سال وطن سے باہر نہایت اہم فوجی خدمات انجام دیتا رہا۔

ملک عمر حیات خاں نے خود نوشت سوانح عمری میں تفصیلات بیان نہیں کیں، صرف اتنا بتانے پر اکتفا کی کہ ڈپٹی کمشنر نے میرے والد سے امداد کے لئے کہا تو انہوں نے روپیہ بھی پیش کیا، اور یہ بھی فرمایا کہ میرے پاس ہتھیار ہیں، جو محفوظ مقام پر دفن ہیں، اجازت ہو تو وہ بھی نکال لوں۔ اجازت مل گئی۔ انہوں نے ایک رسالہ بھرتی کیا اور جہلم پہنچ گئے

اس سلسلہ میں دو انگریزوں کے بیانات بھی ملاحظہ فرما لینے چاہئیں۔ مسٹر گوراوسلے[1] ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ملک صاحب خاں نے طلب امداد پر کہا: میرا سر اور تیس ہزار روپے حاضر ہیں۔ یہ حکومت کے کام آسکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

ملک صاحب خاں کی وفات سے سات آٹھ برس کے بعد سر جیمس ولسن شاہ پور کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہو کر آیا تھا۔ اس کی بیوی لیڈی ولسن نے قیام شاہ پور کے دوران میں جو خطوط اپنے عزیزوں کو بھیجے تھے، ان میں ضمناً ضلع کے حالات بھی درج کئے تھے، وہ ملک صاحب خان کی آمادگیٔ امداد کے متعلق رقم طراز ہے کہ

---

[1] Gore ouseley

ملک صاحب خاں مٹھا ٹوانہ سے شاہ پور (جو اس زمانے میں ضلع کا صدر مقام تھا) آئے۔

مسٹر اوسلے کے سامنے کھڑے ہو کر سلام کیا، اپنی تلوار کا قبضہ اوسلے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے نوک اپنے جسم کی طرف رکھی اور کہا! میرے پاس پچاس سوار ہیں اور تین سو سوار مہیا کر سکتا ہوں۔ ان کے لباس اور خوراک کا ذمہ خود اٹھاتا ہوں۔ اگر پرسش نہ کی جائے تو انہیں ہتھیار بھی دلا سکتا ہوں۔ وہ اور خود میری زندگی آپ کی نذر ہیں۔[۱]

یہ بیانات اس غرض سے درج کئے گئے ہیں کہ واضح ہو جائے، ملک صاحب خاں کی آمادگی امداد کسی ذاتی غرض پر مبنی نہ تھی، صحیح روئداد وہی ہے، جو ہم نے خاندانی روایات کی بنا پر پیش کی۔ ڈپٹی کمشنر کے بتانے سے پیشتر ملک صاحب خاں یا کسی دوسرے شخص کو ہنگامۂ "غدر" کے آغاز کا علم ہی نہ تھا۔

جہلم کی مہم

ملک عمر حیات خاں کا بیان درج ہو چکا ہے کہ رسالہ بھرتی کرنے کے ساتھ ہی ملک صاحب خاں جہلم پہنچ گئے۔ لیپل گرفن نے بھی لکھا ہے۔ کہ وہ ۱۴ پیادہ فوج کے باغیوں سے لڑنے کے لئے جہلم میں موجود تھے۔[۲] یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے۔ ذمہ دار افسروں نے جہلم کی ۱۴ پیادہ فوج اور راولپنڈی کی ۱۸ پیادہ فوج میں بے چینی کے آثار دیکھے تو دونوں سے بیک وقت ہتھیار لے لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ملک صاحب خاں کو جہلم جانے کا حکم ملا۔ ۷ جولائی

---

[۱] The letters of Lady Wilson - (لیڈی ولسن کے خطوط) صفحہ ۱۲۸ - [۲] لیپل گرفن جلد دوم صفحہ ۲۰۴

۱۸۵۷ء کو ۱۴ پیادہ فوج سے ہتھیار رکھوا لینے کی تیاری کی گئی، تو ان لوگوں نے بندوقیں سنبھال لیں اور گولیاں چلانے لگے۔ شدید جنگ کے بعد وہ پاس کے ایک گاؤں میں چلے گئے۔ وہاں بھی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر انہوں نے کشتیوں میں سوار ہو کر دریا سے گذرنے کی کوشش کی۔ کچھ مارے گئے۔ بہت سے دریا میں ڈوب گئے، پچاس آدمی کشمیر پہنچے اور وہاں گرفتار ہو گئے[۱] اس موقعہ پر ملک صاحب خاں اپنے رسالے کے ساتھ موجود تھے۔

واقعہ اجنالہ

جہلم کے بعد ملک صاحب خاں کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بمقام اجنالہ ضلع امرتسر ایک بڑی جمعیت کو زیر کرنے میں مدد دی، لیپل گرفن کے بیان کے مطابق "ملک موصوف ہی کے مشورے اور حسنِ تدبیر کی بدولت تقریباً دو سو باغی گولی چلائے بغیر گرفتار ہوئے" اسی کارنامے کے متعلق، لیڈی ولسن اپنے ایک مکتوب میں لکھتی ہیں۔ کہ ملک صاحب خان کو:

> فنونِ جنگ میں درجہ کمال حاصل تھا۔ پرانی مہموں میں ان کی شجاعت و مردانگی کے افسانے اب تک سنے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک بھی گولی چلائے بغیر تقریباً دو سو باغیوں کو گرفتار کر لیا۔[۲]

یہ جمعیت لاہور سے اپنے افسروں کو قتل کر کے روانہ ہوئی تھی۔ یہ لوگ دریائے راوی کو عبور کر کے سیالکوٹ پہنچنا چاہتے تھے۔ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو یہ دودیال کے قریب پہنچے، اور سلطان خاں

---

۱ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو Punjab Govt Records Vol. VII — I پنجاب گورنمنٹ ریکارڈز جلد ۷، حصہ اول، ص ۱۹۶ تا ۱۹۸۔ ۲ لیڈی ولسن کے مکاتیب انگریزی ص ۱۲۹۔

چوکیدار سے گھاٹ کا پتا لینا چاہا ۔ چوکیدار نے جواب دیا کہ مجھے تو معلوم نہیں ۔ میرا بیٹا آپ لوگوں کو گھاٹ پر پہنچا دیگا ۔ چنانچہ بیٹے کو ان لوگوں کا رہنما بنا کر سلطان خاں ۸ بجے صبح روانہ ہوا ، اور ۱۰ بجے پیدل اجنالہ پہنچ کر دیوان پریم ناتھ تحصیل دار کو اطلاع دیدی ۔ ساتھ ہی کہہ دیا کہ وہ لوگ باغی ہیں ، جو کچھ ہو سکتا ہے کریجئے ۔

تحصیل دار پولیس والوں کو لے کر خود ان لوگوں کے تعاقب میں چلا گیا اور ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے سے فریڈرک کوپر ڈپٹی کمشنر امرت سر کو خبر بھیج دی ۔ ملک صاحب خان اپنی جمعیت کے ساتھ اس وقت امرت سر پہنچے ہوئے تھے ۔ فریڈرک کوپر نے انہیں ساتھ لیا ، اور تقریباً چھہتر سوار لے کر چلا ، جن میں چوالیس سوار ملک صاحب خاں کی جمعیت کے تھے ۔ راستے میں سردار پرتاب سنگھ رئیس ساہنسی بھی ہمراہ ہوگیا ۔ یہ لوگ ۵ بجے کے قریب موقع پر پہنچے ۔ اس سے پیشتر باغی دریا کے اندر ایک خشک قطعہ زمین میں جمع ہو چکے تھے ، جو دو سو گز لمبا اور ستّر گز چوڑا تھا ۔

فریڈرک کوپر اور ملک صاحب خاں بندوقچیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ کشتیوں میں سوار ہو کر ان کی طرف روانہ ہوئے ۔ یہ دیکھتے ہی ان میں سے تیس چالیس دریا میں کود پڑے ۔ ملک صاحب خاں کے مشورے کے مطابق اُن میں سے کسی پر گولی نہ چلائی گئی ۔ یہ کیفیت دیکھ کر باقی باغیوں نے سمجھ لیا کہ انہیں ضرر نہ پہنچایا جائے گا ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمے چلیں گے اور معمولی سزائیں دیکر انہیں گھروں میں بھیج دیا جائے گا

فریڈرک کوپر نے خود لکھا ہے کہ ساٹھ باغیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے کنارے پر بھیج دیا گیا اور میں خود اس کشتی میں گیا ۔ ٹوانہ

جمعیت کے آدمی باقی باغیوں کی نگرانی میں خشک خطۂ زمین میں ٹھہرے رہے - دوسرے پھیرے میں انہیں بھی کنارے پرلے آئے - یہ کُل دو سو بیاسی آدمی تھے ، [۱]

فریڈرک کوپر نے سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس مہم میں نصف کامیابی کا سہرا ملک صاحب خاں کے دلی تعاون اور ان کی نہایت عمدہ تجاویز کے سر ہے[۲] موصوف نے ایک اور تحریر میں بیان کیا کہ اس موقعہ پر ملک صاحب خاں کا تعاون میرے نزدیک انتہائی دل جمعی کا باعث ہوا :-

> باغی جزیرے میں بیٹھے تھے - ان کی گرفتاری کے نازک اور مشکل کام میں صاحب موصوف کی رائے اور سرگرم امداد سب سے بڑھ کر نمایاں رہی - یہ لوگ ایک بھی گولی چلائے بغیر گرفتار ہوئے ، حالانکہ ہماری طرف سے صرف چالیس آدمی دو کشتیوں میں بھیجے گئے تھے ، باغیوں میں سے ایک بھی شخص قتل یا زخمی نہ ہوا - ملک صاحب خاں کے آدمیوں نے انتہائی مستعدی اور سرگرمی دکھائی - وہ درحقیقت اپنے سردار کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے -

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ ملک صاحب جہلم سے

---

[۱] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو The Indian Mutiny (بغاوتِ ہند) مرتبہ Holmes اشاعت سوم صفحہ ۳۴۸ و Punjab Govt. Records Vol VII part I صفحہ ۳۸۹ ، ۳۹۳ :: [۲] ایضاً ایضاً ۳۹۵

لاہور ہوتے ہوئے امرت سر گئے ۔ اغلب ہے، وہ جنرل نکلسن کے ساتھ دہلی روانہ ہوتے ہوں، لیکن ضروری کاموں کے سلسلے میں کچھ دیر رکنا پڑا ۔ بہرحال اوائل اگست تک وہ امرت سر ہی میں تھے ۔

امرت سر میں ملک صاحب خاں نے جو خدمت انجام دی تھیں، ان کے متعلق چیف کمشنر پنجاب کے ملٹری سیکرٹری لفٹنٹ جے، ڈی میکفرسن[1] نے اعتراف کیا :-

> ملک صاحب خاں کے سواروں اور تحصیلدار پریم ناتھ کے سواروں کی روش و کردار کو ائیف کو پہ نے بے حد قابلِ ستائش قرار دیا ۔[2]

---

[1] J. D. Macpherson [2] ملاحظہ ہو اخبار لاہور کرانیکل مورخہ ۲ اگست ۱۸۵۷ء

چھٹا باب

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ

۲

لیپل گرفن اور جان اینجلو

کچھ معلوم نہیں کہ ملک صاحب خاں امرت سر سے کب دہلی پہنچے، لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ تسخیرِ دہلی کے موقعہ پر موجود تھے۔ کچھ مدت تک باولی سرائے میں بھی مقیم رہے اور دہلی میں انھوں نے ایک نکاح بھی کیا تھا، جس کا مفصل ذکر موقع پر آئے گا۔ لیپل گرفن نے ملک صاحب کی خدمات کے سلسلے میں چار واقعات کا ذکر بہ طور خاص کیا ہے جو تسخیرِ دہلی کے بعد پیش آئے۔

۱۔ ملک صاحب کے رسالے کو کان پور کے نواح میں قیامِ امن کا کام سونپا گیا، جہاں لوگوں میں خاصی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

۲ - کالپی میں اس رسالے نے مناسب مقامات پر توپیں نصب کرنے والے جتھوں کی حفاظت کا فرض احسن طریق پر انجام دیا اور اس کی شجاعت و جوانمردی کی بے حد ستائش کی گئی

۳ - اس رسالے نے جمنا کے پل کی حفاظت میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا -

۴ - پھر یہ رسالہ وسط ہند کی مہمات میں جنرل نیپیئر کی فوج کے ساتھ ہو لیا، اور خاص طور پر قابل توجہ امر یہ ہے کہ جہاں کہیں لڑائی کا موقع آتا یہ رسالہ سب سے آگے رہتا[۱]

ایک اور فوجی افسر جان اینجلو[۲] نے جہلم اور اجنالہ کے واقعات کے علاوہ ملک صاحب خاں کے مندرجہ ذیل کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے:-

۱ - ملک صاحب کا رسالہ کالپی کی جنگ میں موجود تھا -

۲ - ملک صاحب نے شہزادہ فیروز شاہ کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا اور ایک توپ قبضے میں کر لی -

۳ - گوالیار میں ملک صاحب خاں نے جنرل نیپیئر کے زیر قیادت اہم خدمات انجام دیں اور یہ خدمات جنرل موصوف کے جنگی مراسلوں میں مذکور ہیں -

۴ - ملک صاحب نے اپنے ساتھیوں کو وردیاں پہننے پر راضی کرنے میں ہماری قابل قدر امداد کی[۳]

واقعات پر تفصیلی روشنی تفصیلات بیان کئے بغیر ان واقعات کی اہمیت واضح نہیں ہو سکتی - کان پور، ڈھونڈو پنتھ عرف نانا صاحب کا مرکز تھا اور نانا ممتاز ترین مرہٹہ باغیوں

---

[۱] پیسل گرفن جلد دوم ص ۲۰۶ - [۲] John Angelo [۳] ملک صاحب کے نام جان اینجلو کا مکتوب (انگریزی)

میں شمار ہوتا تھا - انگریزوں کی طرف سے جنرل ونڈھم[ٹ] کو کان پور کی حفاظت کا کام سونپا گیا تھا - اس کے پاس فوج کم تھی، اس اثنا میں مشہور مرہٹہ جرنیل تانتیا توپی پچیس ہزار کی جمعیت سے کان پور پر حملہ آور ہوا - ونڈھم نے بڑی جانفشانی سے حملہ آور کا مقابلہ کیا - اسے بڑی مشکلات پیش آئیں - اس اثنا میں کالن کیمپ بیل[ٹ] امداد کے لئے پہنچ گیا اور تانتیا توپی مراجعت پر مجبوراً ہوا - سمجھنا چاہیے کہ اس زمانے میں ملک صاحب خاں کا رسالہ کان پور کے گرد و نواح میں خدمات انجام دے رہا تھا -

باغیوں میں سب سے بڑھ کر ممتاز شخصیت لکشمی بائی رانی جھانسی کی تھی - اس نے پہلے جھانسی میں انگریزی فوج کا مقابلہ کیا - جنرل سر ہیو روز[ٹ] نے جھانسی کو فتح کر لیا - رانی قلعے سے بچ کر نکلی اور کالپی پہنچ گئی، جہاں نانا صاحب کا بھتیجا راؤ صاحب موجود تھا - یہ مقام بھی باغیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا -

جنرل ہیوروز نے کالپی پر پیش قدمی کی تو ملک صاحب خاں بھی اپنی جمعیت کے ساتھ کان پور سے کالپی آ گئے - یہ اپریل ۱۸۵۸ء کے واقعات ہیں - ان کی تفصیلات ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کی مفصل تاریخوں میں دیکھنی چاہئیں

کالپی کی تسخیر

رانی جھانسی نے کالپی پہنچتے ہی راؤ صاحب سے درخواست کی کہ مجھے ایک فوج دیجئے تاکہ انگریزوں سے جنگ کروں - راو صاحب کے حکم کے مطابق تانتیا توپی بھاری فوج لے کر ہیوروز کے مقابلے پر نکلا - کونچ کے مقام پر مقابلہ ہوا جو جھانسی اور کالپی کے درمیان آخرالذکر مقام سے تقریباً بیالیس میل کے فاصلے پر ہے تانتیا توپی نے یہاں بھی شکست کھائی - شکست کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستانی فوج

ٹ - Charles Windham. ٹ - Sir Colin Campbell

ٹ - Sir Hugh Rose

براہِ راست حملے کی عادی تھی - ہیوروز نے اطراف سے حملے کئے جن کے باعث تانتیا توپی کی فوج بکھر گئی - بعد ازاں اس حصے میں کالپی باغیوں کا بڑا مرکز رہ گیا -

کالپی کا موقع اور محل دفاعی جنگ کے لئے بہت موزوں تھا - اس کے ارد گرد کئی نالے تھے، اور باغیوں نے ایسے مقامات پر مورچے بنائے تھے کہ شہر پر براہِ راست حملہ بہت مشکل ہو گیا تھا -

ایک فوج میکسویل کی سرکردگی میں ہیوروز کی کمک کے لئے بھیجی گئی تھی اور وہ دریائے جمنا کے پار گلولی نام مقام کے سامنے پہنچ چکی تھی باغی اس کمک کو روکنا چاہتے تھے - ہیوروز نے گلولی کے مقام پر انہیں شکست دی - اس طرح میکسویل کے لئے دریا عبور کرنے کا موقع بہم پہنچایا - غالباً اسی سلسلے میں ملک صاحب خاں نے جمنا کی حفاظت کی اور میکسویل کو بہ خیر و عافیت عبور دریا میں سہولتیں بہم پہنچائیں - پھر کالپی پر گولہ باری کے لئے مختلف مقامات پر توپیں نصب کرنے کا نقشہ خاصی پریشانی کا باعث تھا - اس لئے کہ کالپی کے اندر سے بارش کی طرح گولے برس رہے تھے - اس نازک موقعہ پر ملک صاحب خاں کے رسالے نے جا بجا توپیں نصب کرائیں ۲۱ مئی ۱۸۵۸ء کو شہر پر گولہ باری ہوئی - کالپی انگریزوں کے قبضے میں آگیا - رانی جھانسی، راؤ صاحب اور تانتیا توپی گوالیار چلے گئے -

رانی کی موت

گوالیار کے مہاراجہ سندھیا نے باغیوں کا مقابلہ کیا، لیکن عین میدانِ جنگ میں اس کی فوج باغیوں سے مل گئی اور وہ بمشکل جان بچا کر آگرہ پہنچا - باغی گوالیار پر قابض ہو گئے ہیوروز تیزی سے گوالیار پر بڑھا - اب جنرل رابرٹ نیپیئر بھی اس کے ساتھ شامل ہو چکا تھا - پہلی جنگ مرار میں ہوئی اور دوسری کوٹہ کی

سرائے میں - اس آخری جنگ میں ۱۷ جون کو رانی جھانسی لڑتی ہوئی ماری گئی، انگریزی فوج آگے بڑھی تو تانتیا ٹوپی نے خاص گوالیار میں اس کا مقابلہ کیا اور وہ شکست کھا کر راجپوتانہ کی طرف بھاگ گیا۔

کالپی، مرار، کوٹہ کی سرائے اور گوالیار کی لڑائیاں ہنگامہ "غدر" کی بہت بڑی لڑائیاں ہیں - ان تمام میں ملک صاحب خاں شریک رہے اور انہوں نے قابلِ ستائش خدمات انجام دیں - اس موقعہ پر ہیوروز کو عساکر بمبئی کی کمان سنبھالنے کا حکم مل گیا اور جنرل رابرٹ نیپیر، تانتیا ٹوپی کے تعاقب پر مامور ہوا - اس وقت سے ملک صاحب خاں کی جمعیت رابرٹ نیپیر کی فوج میں شامل ہو گئی - ملک عمر حیات خاں کا بیان ہے کہ جنرل نیپیر نے میرے والد کے رسالے کو باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔

ٹوانہ لانسرز کی سرگذشت

جنگ مرار کے بعد جنرل نیپیر نے فیصلہ کیا تھا کہ باغیوں کے تعاقب اور قیام امن کے لئے ایک خاص رسالہ تیار کیا جائے جسکا نام ابتدا میں ۲ مرہٹہ ہارس رکھا گیا بعد ازاں اس رسالے کو صرف مرہٹوں تک محدود رکھنا خلاف مصلحت سمجھا گیا اور بلند شہر سے جاٹوں کی ایک جمعیت بھی اس میں شامل کر دی گئی، ملک صاحب خاں کی جمعیت ٹوانہ ہارس کہلاتی تھی اور ملک موصوف کے ممیرے بھائی ملک جہان خاں اس کے سالار قرار پائے تھے، اس لئے کہ ملک صاحب خاں اعزازی خدمات تو انجام دینے کے لئے تیار تھے، لیکن باقاعدہ ملازمت پر راضی نہ تھے۔

"یہی ٹوانہ ہارس" آگے چل کر ۱۸ ٹوانہ لانسرز بنی، پھر اس کا نام "کنگ جارج اون لانسرز" رکھا گیا - آج کل اسے "۱۹ لانسرز" کہتے ہیں - ملک عمر حیات خاں مرحوم اس رسالے کے بانیٔ اوّل ملک صاحب خاں کے فرزند ارجمند تھے، اس لئے انہیں رسالے میں آنریری کرنل کا

عہدہ حاصل تھا اور ملک خضر حیات بھی اس اعزاز کے حامل رہے۔

شہزادہ فیروز شاہ

تانتیا توپی گوالیار سے بھاگا تو جنرل نیپیئر نے اس کے تعاقب میں ایک فوج بھیج دی۔ اس فوج سے تانتیا توپی کی پہلی لڑائی ۲۲ - جون ۱۸۵۸ء کو جوڑا علی پور میں ہوئی، جس میں مرہٹہ جرنیل کے تین چار سو ساتھی مارے گئے لیکن وہ خود بچ نکلا۔

اسی زمانے میں ایک اور بڑی شخصیت نمودار ہوئی جس کی وجہ سے انگریزوں پر خاصی پریشانی طاری رہی۔ یہ شہزادہ فیروز شاہ تھا جو شاہ عالم ثانی بادشاہ ہند کے فرزند شہزادہ ناظم بخت کا بیٹا اور اکبر شاہ ثانی کا بھتیجا تھا۔ اس کی والدہ فرخ سیر کی صاحب زادی تھی، گویا یہ شہزادہ نجیب الطرفین تھا، وہ ۱۸۵۶ء میں بہ قصد حج حجاز گیا واپسی پر اندور پہنچا تو غدر شروع ہو گیا۔ جون ۱۸۵۷ء میں سندھیا کی باغی فوجیں مندسور پر قابض ہو گئیں۔ ان فوجوں نے شہزادے کو اپنا سالار بنا لیا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء تک شہزادے کی جمعیت سترہ اٹھارہ ہزار تک پہنچ چکی تھی، تاہم بدنظمی کے باعث یہ جمعیت کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ نومبر میں اس جمعیت نے ایک انگریزی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی اور منتشر ہو گئی۔

شہزادہ ساتھیوں کی پراگندگی کے بعد بندھیل کھنڈ پہنچا اور یہاں کی متفرق قوتوں کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسے تانتیا توپی کی سرگرمیوں کے متعلق مبالغہ آمیز اطلاعات ملیں، لہٰذا اس نے وسط ہند کا قصد کر لیا، تاکہ تانتیا توپی سے مل کر منظم جنگی قوت کا انتظام کرے۔ چنانچہ وہ اٹاوہ ہوتا ہوا رانود کی طرف بڑھا جو ریاست گوالیار کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جنرل نیپیئر کو شہزادے کی نقل و حرکت کے

متعلق دم بہ دم اطلاعیں مل رہی تھیں اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ شہزادے سے پہلے رانود پہنچ کر دفاعی انتظامات کرے۔

رانود کی جنگ جنرل نیپیئر چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ ۱۷ دسمبر کو رانود پہنچ گیا۔ ملک صاحب خان اُسی وقت اپنی جمعیت سے الگ ہو چکے تھے، جب ان کی جمعیت کو باقاعدہ انگریزی فوج میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ملازمت پر کسی حالت میں بھی آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے اپنے ممیرے بھائی ملک جہاں خاں کو جمعیت کا جمعدار بنوا دیا تھا۔ جنرل نیپیئر رانود کیلئے تیار ہوا تو حسن اتفاق سے ملک صاحب خاں اپنی جمعیت کے آدمیوں سے ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کر دیں، جنہیں نیپیئر نے انتہائی خوشی سے منظور کر لیا، چنانچہ رانود کی جنگ میں ٹوانہ جمعیت کے ساٹھ جوانمردوں کے ساتھ ملک صاحب خان بھی شریک تھے۔

شہزادے کو یہ علم نہ ہو سکا کہ جنرل نیپیئر نے رانود پہنچ کر دفاعی مورچے بنائے ہیں، ایک مقامی آدمی کی رہبری میں شہزادے نے رانود پر حملہ کیا، وہ شہر کے قریب پہنچا تو انگریزی فوج نے اچانک ایسی باڑیں پے در پے ماریں کہ شہزادے کی فوج تھوڑی ہی دیر میں منتشر ہو گئی۔ اس کے ڈیڑھ سو آدمی رانود میں مارے گئے۔ مزید تین سو آدمی بھاگتے ہوئے موت کے گھاٹ اترے۔ انگریزی فوج کے صرف سولہ آدمیوں کو زخم لگے۔ ان میں سے ایک کے زخم مہلک ثابت ہوئے۔

وسطِ ہند میں "غدر" کی سرکاری رپورٹ مظہر ہے کہ جنرل نیپیئر نے جنگ رانود کے متعلق جو مراسلہ بھیجا، اس میں ملک صاحب خاں کی خدمات کا بہ طورِ خاص ذکر کیا، جو ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے اور اعزازی طور پر جنگ میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ نیز جمعدار جہاں خاں کی تحسین

کی جو تنہا متعدد دشمنوں سے لڑتا رہا - ان میں سے ایک کو قتل اور دوسرے کو زخمی کیا اور خود چھ زخم کھائے [۱]

تانتیا توپی کا انجام

تانتیا توپی جوڑا علی پور سے فرار کے بعد کم وبیش دس مہینے تک جے پور، ٹونک، بیکانیر، جودھ پور، اندور، بانس واڑہ، بڑودہ، چھوٹا اودھے پور، ناگ پور، گوالیار وغیرہ کے جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا - شہزادہ فیروز شاہ بھی اس سے جا ملا تھا - بالآخر دونوں کی مشترکہ فوج نے سیکر (ریاست جے پور) میں شکست کھائی اور الگ الگ ہو گئے، تانتیا توپی گوالیار کے ایک باغی سردار مان سنگھ کے پاس چلا گیا - انگریزوں نے مان سنگھ کے ذریعے سے اسے ۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو گرفتار کیا - ۱۵ اپریل کو فوجی عدالت نے اسے موت کی سزا سنائی - ۱۸ اپریل کو شام کے وقت اسے پھانسی دے دی گئی - ڈھونڈو پنتھ عرف نانا صاحب نیپال چلا گیا - اس کا بھتیجا راؤ صاحب ۱۸۶۲ء میں پکڑا گیا اور پھانسی پائی - شہزادہ فیروز شاہ کربلائے معلّی ہوتا ہوا مکۂ معظمہ پہنچ گیا اور ۱۸۹۵ء میں وہیں انتقال کیا - قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک صاحب خاں اگرچہ ملازمت کیلئے تیار نہ ہوئے تھے، لیکن غالباً تانتیا توپی کی گرفتاری کے بعد وہ وطن واپس آئے - کم از کم رانود کی جنگ تک جو دسمبر ۱۸۵۸ء میں ہوئی، ان کا وسط ہند میں رہنا یقینی اور قطعی ہے -

جنرل نیپیئر کا اعتراف

جنرل رابرٹ نیپیئر نے ۲۰ مئی ۱۸۵۹ء کو ملک صاحب خاں کی خدمات کے

---

[۱] The Revolt in cantral India
(وسط ہند میں بغاوت) مرتبہ محکمۂ اطلاعات فوج ص۲۲۷

اعتراف میں جو مکتوب بھیجا، اس میں کانپور، کالپی وغیرہ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مرقوم ہے۔

> میں شخصاً ملک موصوف کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے آدمی، اپنے بھائی، جمعدار جہاں خاں کی سالاری میں میری حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے۔ یہ آدمی وسط ہند کی پوری مہم میں میرے ساتھ رہے۔ راتود اور نہرگ پور کی لڑائیوں میں بھی میرے ساتھ تھے۔ تمام مواقع پر انہوں نے بڑا کام دیا۔ ہر لڑائی میں وہ سب سے آگے رہتے تھے .... جس حد تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے، میں ملک صاحب خاں کے عمل و روش کی جتنی بھی ستائش کر دوں، وہ عین حق بجانب ہو گی۔

مکتوب میں نہرگ پور سے غالباً ناہر گڑھ مراد ہے، جو ریاست کوٹہ میں واقع ہے، انگریز افسروں نے اس قصبے سے رسد مانگی تھی اہل قصبہ بے وجہ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ ۲۱ جنوری ١٨٥٩ء کو چھوٹی سی انگریزی فوج نے اس پر قبضہ جما لیا، نیپیئر ۲۳۔ جنوری کو یہاں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی فوج کے بہادرانہ کارنامے کی بے حد تعریف کی[۲]

اعزازات جنرل نیپیئر کو ملک صاحب خاں سے اتنا گہرا تعلق پیدا ہو چکا تھا کہ جب وہ وطن واپس آنے لگے تو نیپیئر نے اپنی خاص تلوار اور ایک قیمتی سنہری گھڑی بہ طور یادگار ملک صاحب کو دی۔

---

۲ The Revolt in Central India (وسط ہند میں بغاوت) ص ۲۰۳

یہ چیزیں اب تک ان کے خاندان میں محفوظ ہیں ۔ ۱۸۶۷-۶۸ء میں جنرل نیپیئر حبشہ (ابی سینیا) کی مہم پر گیا ۔ میگڈالہ کے مقام پر اس نے فیصلہ کن فتح حاصل کی اور لارڈ نیپیئر آف میگڈالہ کا خطاب پایا ۔ پھر وہ افواج ہند کا سپہ سالار اعظم بن گیا ۔ ملک صاحب خان سے اس کے دوستانہ و محبانہ تعلقات بدستور قائم رہے ۔ اس نے اپنے ایک گھوڑے کا نام میگڈالہ رکھا تھا ۔ ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت وہ گھوڑا بھی ملک صاحب خاں کو دیدیا تاکہ دورانِ "غدر" میں دوستی رفاقت اور تعاون کی یاد تازہ رہے ۔

حکومت نے ملک صاحب خاں کو بہادر کا خطاب اور "ستارہ ہند" کا اعزاز دیا ۔ واضح رہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں یہ خطاب و اعزاز اتنے ارزاں نہ تھے، جتنے ہمارے زمانے میں ہو گئے ۔ ملک صاحب موصوف خدمات سے فارغ ہو کر وطن آ گئے تو پہلے کی طرح زمینوں کی آباد کاری میں مصروف ہو گئے ۔ پھر انہیں زندگی میں کوئی جنگی مہم پیش نہ آئی ۔

ساتواں باب

نہریں اور آبادکاری

ایک مثالی زندگی ملک صاحب خاں واپس آئے تو پھر پہلے کی طرح زمینوں کی دیکھ بھال اور آبادکاری میں مشغول ہو گئے۔
ان کی زندگی مختلف وجوہ سے مثالی حیثیت کی حامل ہے۔ مثلاً:

۱۔ تمام خاندانی وسائل سے کنارہ کش ہو کر صرف ہمت و مردانگی کے بل پر اپنے لئے زندگی کا مستقل راستہ پیدا کیا۔

۲۔ لڑائیاں پیش آئیں تو ایک جوانمرد سالار کی طرح ان میں شریک ہوتے۔ اور ہر میدان میں عزت و ناموری کا درجہ حاصل کیا۔

۳۔ اعزازی خدمات میں پیش پیش رہے۔ ملازمت قبول نہ کی، حالانکہ انہیں اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ اونچا عہدہ مل سکتا تھا۔

۴۔ امن کا دور آیا تو آبادکاری کے جوہر چمک اٹھے اور اپنے آپ

کو انہیں مشاغل کے لئے وقف کر دیا، جو خود ان کے لئے مفید تھے۔ اور اہل ملک کے لئے بھی ایک نیک اور قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے تھے۔

آج اس قسم کی جامع الاوصاف شخصیتیں کہاں ملتی ہیں؟ ملک عمر حیات خاں نے اپنے اہل خاندان کے متعلق لکھا ہے۔

> وہ سپاہی بھی تھے۔ حکومت چلانے کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ حکمرانوں سے راہ و رسم کے باعث انہیں سیاسیات میں بھی حصّہ لینا پڑا۔ گویا وہ بیک وقت سولجر پالیٹیشن یا سولجر سٹیٹسمین تھے اور یہ جوہر ان کی گھٹی میں رچے ہوئے تھے۔

ملک صاحب خاں یقیناً ان اوصاف کا ایک بلند "عملی نمونہ" تھے۔

کالرا کا حصول

ملک صاحب خاں میگھا کے علاقے کی آبادکاری درجہ کمال پر پہنچا چکے تھے۔ یہ علاقہ مدّت سے بنجر تھا۔ اگرچہ اس مقام پر ایک مشہور گھاٹ تھا، لیکن وہاں مسلسل ڈاکے پڑتے رہتے تھے اور آبادی کی کوئی صورت نہ بنتی تھی۔ ملک صاحب موصوف نے تھوڑی ہی مدت میں تمام جرائم کا انسداد کر دیا اور اعلیٰ پیمانے پر وہاں کھیتی باڑی شروع ہو گئی۔ اب حکومت کو یہ ضرورت پیش آئی کہ مختلف جنگلی علاقے آباد کرائے، جو حقیقتاً ڈاکوؤں اور مجرموں کی پناہ گاہیں بنے ہوئے تھے۔ ان میں وہ علاقہ بھی شامل تھا، جو رکھ کالرا کے نام سے مشہور تھا اور آج پنجاب میں آبادکاری کا ایک مثالی خطّہ مانا جاتا ہے۔

۱۸۶۰ء میں حکومت نے رکھ کالرا ملک صاحب خاں کو دیتے وقت امید ظاہر کی کہ وہ اس کی آبادکاری کا انتظام کریں گے اور

ایسی نہریں نکال دیں گے، جو نہ محض اس رکھ کی زمینیں سیراب کریں بلکہ آس پاس کے دیہات بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ افتادہ اور بنجر زمینوں کی آبادکاری اس طرح ہو سکتی تھی کہ کوئی ذی وسائل منتظم اور ہمت ور رئیس کھیتی باڑی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔

اس زمانے میں پنجاب نہروں کے اس وسیع نظام سے بالکل ناآشنا تھا جس نے ہمارے زمانے میں اسے زراعت کا بہت بڑا مرکز بنا دیا۔ نہروں کے انجینئر بھی موجود نہ تھے اور نہ نمونے کی کوئی نہر سامنے تھی، جسے دیکھ کر نئی نہریں کھدوائی جا سکتیں۔ خاندانی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک صاحب خاں گھوڑے پر سوار ہو جاتے اور دریا کے کنارے کنارے پھر کر ایسی جگہیں انتخاب فرماتے، جہاں سے بہ آسانی اچھی نہریں نکالی جا سکتیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک سال میں رکھ کالرا کیلئے نہر تیار کر لی۔ حکومت نے جولائی ۱۸۶۲ء میں نہر کی تعمیر اور علاقے کی آبادی پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کا نام صاحب خاں والی نہر ہے۔ وسطی اور شمالی و مغربی پنجاب میں یہ پہلی نہر تھی، جو ملک صاحب خاں نے تیار کرائی۔

کامیاب آبادکاری

وقت کے فنانشل کمشنر نے ملک صاحب خاں کی مساعیٔ آبادکاری کے اعتراف میں حکم دیا کہ حکومت کی طرف سے ایک پروانہ ملک صاحب موصوف کے نام بھیجا جائے، جس کا مضمون یہ ہو۔

> ملک صاحب کے اپنے فائدے اور دوسرے
> مالکانِ اراضی کی خوش حالی کا تقاضا ہے کہ موصوف
> اس رکھ (رکھ کالرا) کی آبادی کے لئے زیادہ سے

زیادہ کوششیں عمل میں لائیں تاکہ عوام کی حوصلہ
افزائی ہو اور ان کی حالت بہتر ہو جائے۔ ملک
صاحب کو چاہیئے کہ عوام کو آباد کاری کے فوائد
سے آگاہ کریں۔

یقیناً یہ ایک بہت بڑی رفاہی خدمت تھی جو ملک صاحب خاں نے انجام دی۔ آبپاری کے مناسب انتظام نے عام لوگوں کو کھیتی باڑی پر متوجہ کیا۔ خود ملک صاحب انہیں تلقین بھی کرتے تھے اور ان کے اپنے علاقے سب کے لئے ایک قابلِ تقلید عملی نمونہ بھی تھے۔ اکثر لوگ کھیتی باڑی کو ایک منفعت بخش پیشہ سمجھ کر زمینوں پر آباد ہونے لگے۔ بنجر خطے شاداب ہو گئے۔ ملک کی پیداوار بڑھی۔ سرکاری مالئے میں اضافہ ہوا۔ بے روزگاروں کیلئے مستقل روزگار کا انتظام ہو گیا۔ اگر ملک صاحب خاں کو کسی علاقے کی حکومت سونپ دی جاتی تو یقیناً اس کی آبادکاری کا انتظام انہیں اصول پر کرتے۔ یہی کام انہوں نے بہ حالتِ امن انجام دیا۔ اس کے بعد جتنی نہریں نکلیں، وہ ملک صاحب خاں کی پیش کردہ مثال کی نقل تھیں۔

پیراں والا نالہ اور چہارمی والا نالہ

رکھ کالرا کی آبادکاری سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد ملک صاحب خاں نے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں دو مزید نہریں کھدوائیں، جن میں سے ایک کا نام پیراں والا نالا تھا اور دوسری کا چہارمی والا نالہ۔ اول الذکر نہر ملک صاحب موصوف نے اپنے عزیز دوست پیر حیدر شاہ کی شرکت سے نکالی تھی اور اس کا نام احتراماً پیراں والا نالہ رکھا ۱۸۹۲ء میں اس کا نصف حصہ ملک عمر حیات خاں نے حکومت کی منظوری سے خرید لیا تھا۔ آخر الذکر نہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی درخواست پر ملک صاحب

نے اپنے خرچ سے صرف عوام کے فائدے اور بھلائی کے لئے کھدائی تھی، نہر کی کھدائی کے وقت اس پر ملک صاحب کی کوئی زمین نہ تھی۔ اسے چہارمی والہ نالا اس لئے کہنے لگے کہ اس کے پانی سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار کا چوتھائی حصّہ ملک صاحب لیتے تھے۔ اس کی درستی، صفائی اور زمینوں کو پانی پہنچانے کا انتظام ملک صاحب کے ذمے تھا۔ ان نہروں سے ضلع سرگودھا میں کھیتی باڑی بہت ترقی کر گئی اور اسی مثال کو سامنے رکھ کر بعض دوسرے مالکانِ اراضی نے بھی بعد ازاں نہروں کا انتظام کیا۔

روئی بیلنے کی مشین

ملک صاحب خاں واقعی غیر معمولی دل ودماغ کے مالک تھے۔ انہوں نے انجینئری کی کوئی تعلیم نہ پائی تھی، تاہم ایسی نہریں تعمیر کرادیں جو کم وبیش ایک سو سال تک وسیع علاقے کی آبیاری کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ وہ چابک دست فن کار بھی تھے۔ ملک عمر حیات خاں نے خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:-

> زمینیں خوب آباد ہوگئیں تو میگھا اور کالرا میں بے اندازہ کپاس پیدا ہونے لگی۔ پورے علاقے کے دستی بیلن جمع کر لینے کے باوجود کپاس بیلی نہ جاسکتی تھی۔ روئی بیلنے کے جو کارخانے آج کل جا بجا قائم ہیں، ان کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ اس مشکل کے حل کیلئے میرے والد نے ایک مشین تیار کرائی، جس میں نئی ساخت کے کئی بیلن کام کرتے تھے۔ جس طرح رہٹ بیلوں کے ذریعے سے چلتے ہیں۔ اسی طرح یہ مشین بھی بیلوں ہی کے ذریعے سے چلتی تھی۔

اس سے یہ فائدہ ہوا کہ روئی بہ آسانی بیلی جانے لگی۔ ملک عمر حیات

خاں فرماتے ہیں کہ میں نے بچپن میں یہ مشین چلتے ہوئے دیکھی تھی اور افسوس کہ کم عمری کے باعث اس کی تفصیلات یاد نہ رکھ سکا - اور نہ وہ مشین باقی رہی کہ اسے دیکھ کر نئی مشینیں تیار کرائی جا سکتیں - جب انجن اور بجلی سے چلنے والے کارخانے تیار ہو گئے تو اس مشین کی ضرورت بھی نہ رہی -

روئی کی برآمد کا انتظام

ملک صاحب خاں کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روئی کی برآمد کا انتظام بہت عمدہ کر رکھا تھا - وہ روئی کے گٹھے بندھواتے اور کشتیوں میں بھر کر دریا کے راستے سکھر پہنچا دیتے، جہاں سے تاجر خرید کر کراچی لے جاتے - اغلب ہے، دوسری فالتو جنسیں مثلاً گندم، چنا وغیرہ بھی اسی ذریعے سے باہر بھیجی جاتی ہوں - گویا انہوں نے نہ محض زمینیں آباد کرائیں، نہ صرف پیداوار بڑھائی بلکہ اس پیداوار کو اچھے نرخ پر فروخت کرنے کا بھی اعلیٰ انتظام کر دیا - یہی حسنِ انتظام تھا، جس نے کھیتی باڑی کی نفع بخشی کا یقین عام لوگوں کو دلایا اور وہ سرگرمی سے زمینوں کی آبادکاری پر متوجہ ہوئے -

قابلِ توجہ خصوصیتیں

"غدر" کے بعد ملک صاحب خاں نے تقریباً بیس سال زمینوں کی آبادکاری، کھیتی باڑی کی ترقی اور گھوڑوں کی اصلاحِ نسل میں گزار دیئے - اسی زمانے میں ان کی تعمیری صلاحیتوں کے جوہر بخوبی آشکارا ہوئے - ان کے خاندان میں سرداری کے لئے جھگڑے شروع ہو گئے تھے، جنہوں نے نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی - ملک صاحب موصوف ان جھگڑوں سے بالکل الگ تھلگ رہے - اپنے حسنِ عمل سے نیک نامی اور عظمت کا نقش ہر قلب پر بٹھا دیا -

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ ضرورت کے وقت حکومت کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار رہے، لیکن ملازمت قبول نہ کی، حالانکہ انہیں اونچے سے اونچا منصب مل سکتا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنی زندگی کے چند اصول بنائے تھے۔ جن پر مدت العمر کاربند رہے۔ مثلاً

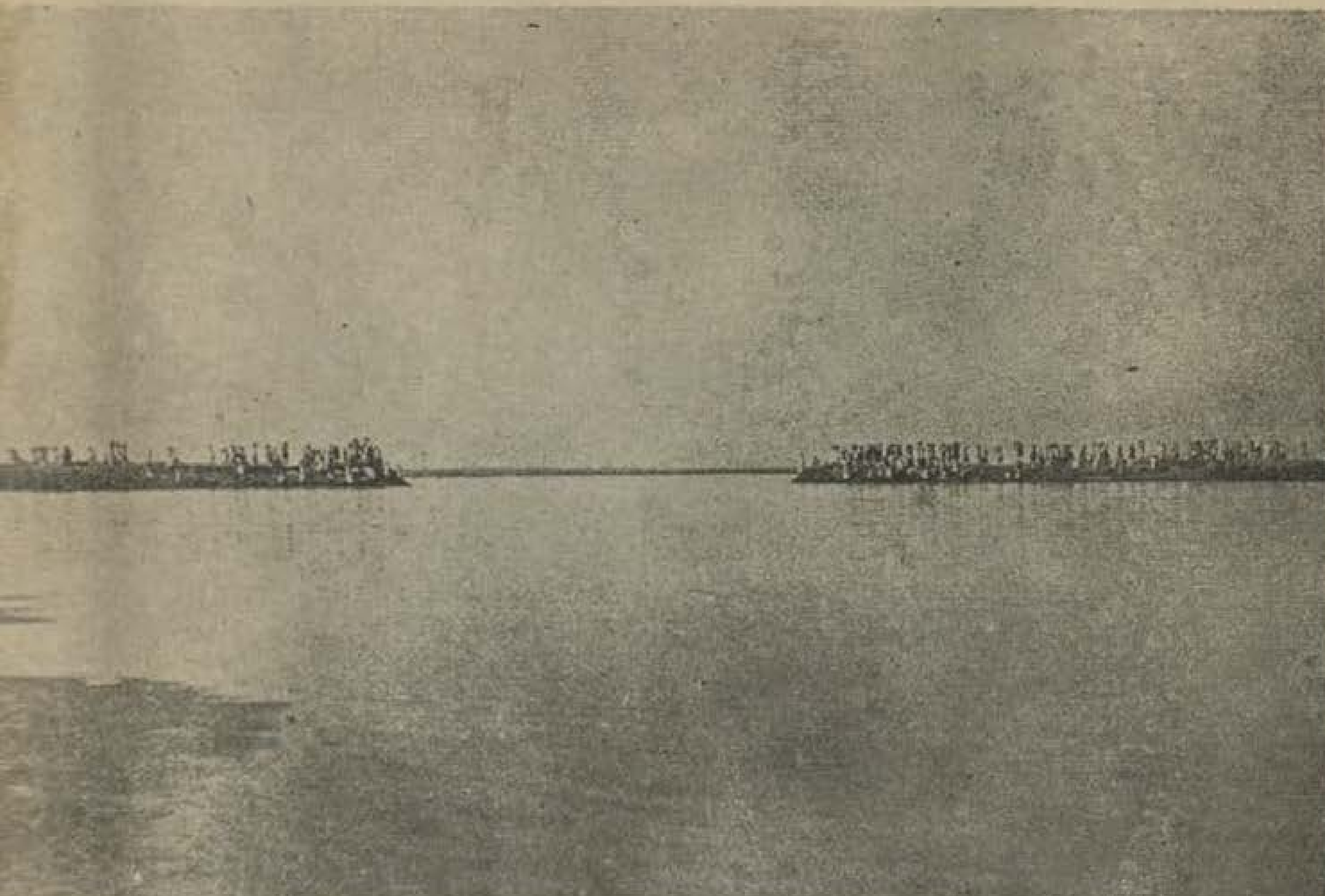
۱۔ حکومت کی طرف سے بار بار انہیں مجسٹریٹ بنانے کی پیشکش ہوئی، لیکن ملک صاحب موصوف نے یہ پیش کش زندگی بھر قبول نہ کی۔

۲۔ انہوں نے جن علاقوں کو اپنی محنت اور حسن انتظام سے آباد کرایا تھا، ان کے سوا کبھی کوئی زمین نہ خریدی، حالانکہ وہ وہ بہت بڑے دولت مند آدمی تھے اور چاہتے تو اردگرد کی تمام زمینیں خرید سکتے تھے، ایک موقع پر اپنے کم سن فرزند ملک عمر حیات خاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں چاہتا تو لاہور تک اپنی زمین کی حدیں پہنچا دیتا، لیکن میں نے یہ طریقہ کبھی پسند نہ کیا۔

۳۔ خاندانی جھگڑوں سے کامل علیحدگی ایسی خصوصیت ہے۔ جس کی ستائش ہر شخص نے کی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا۔

۴۔ راست بازی اور راست گوئی میں ان کا درجہ اتنا بلند تھا۔ کہ اپنے بیگانے کسی کو بھی ان کے متعلق کبھی شبہ نہ ہوا

اس آخری خصوصیت کے سلسلے میں ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، ایک موقع پر ان کی زمین کی حد کے متعلق ایک گاؤں والوں سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ حاکم نے موقع پر پہنچ کر اس اختلاف کا فیصلہ کرانا چاہا اور ثالثی کی تجویز پیش کی۔ اختلاف





نہری نظام میں دریاؤں کے پختہ دہانوں (ویر) سے پہلے دریائے جہلم پر
ریت کی بوریوں کے بند لگا کر اس کا پانی ملکیتی نہروں میں
ڈالنے کا انتظام کیا جاتا تھا ۔ اوپر کی تصویر میں بند لگایا جا رہا ہے ۔
نیچے کی تصویر میں بند مکمل ہو گیا ہے ۔

کرنے والوں نے کہا کہ اگر معاملہ ثالثی پر موقوف ہے تو ہماری طرف سے ملک صاحب خاں ہی کو ثالث بنا دیا جائے ۔ ملک صاحب موصوف نے کہا کہ میرے بھائیوں نے مجھ پر جو اعتماد کیا ، اس کی بنا پر میں انھیں کی مقرّر کی ہوئی حد کو تسلیم کرتا ہوں ۔ وہ بولے کہ ہمیں وہ حد منظور ہے، جو ملک صاحب کے اندازے کے مطابق درست ہے ، چنانچہ اس طرح چند لمحوں میں فیصلہ ہو گیا

اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ ملک صاحب خاں کی رائے سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو بھی کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ وہ حق و انصاف کے راستے سے اِدھر اُدھر ہوں گے ۔

آٹھواں باب

ازواج و اولاد اور وفات

متعدد شادیاں ملک صاحب خاں نے متعدد شادیاں کیں، جن کی مختصر سی کیفیت ذیل میں درج ہے۔

۱ - ان کی پہلی شادی حقیقی ماموں کے گھر ہڈالی میں ہوئی۔ یہ خاتون ملک غلام حسین خاں کی صاحبزادی، سردار بہادر ملک جہان خاں کی ہمشیرہ اور نواب ملک مبارز خاں و نواب ممتاز خاں کی پھوپھی تھیں۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

۲ - دوسری شادی جویا قوم میں کی۔ اس خاتون کو "مائی جویانی" کہتے تھے اور یہ موضع روڈا کی رہنے والی تھیں، جو مٹھا ٹوانہ سے قریب ہے۔ ان سے صرف ایک صاحبزادہ ہوا، جس کا نام "مظفر خاں" رکھا گیا۔ یہ صاحبزادہ نو مہینے کی عمر میں فوت ہو گیا۔ پھر ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

۳ - تیسری شادی لاہور میں کی - اس بیگم کا نام "مائی عالم خاتون" تھا - ان سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی - ان کی قبر کالرا میں ہے -

۴ - ایک خاتون نومسلمہ تھیں - یہ برہمن خاندان سے تھیں اور ان کا ابتدائی نام "اودماں" تھا - مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام مائی فتح خاتون رکھا گیا، یہ ملتان کے سفر میں بھی ملک صاحب کے ساتھ تھیں اور ہندوستان کے سفر میں بھی ملک صاحب کے ساتھ رہیں بعد وفات کالرا میں دفن ہوئیں، ان سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی -

۵ - ایک شادی دہلی میں کی تھی جب ملک صاحب ہندوستان میں جنگی خدمات انجام دے رہے تھے، ان سے چار لڑکے ہوئے - وہ سب بچپن ہی میں فوت ہو گئے ان کا نام معلوم نہیں - عام طور پہ "مائی ہندوستانن" مشہور تھیں -

۶ - ایک شادی مستیال قبیلے میں کی - اس خاتون کو عموماً مائی مستیال کہا جاتا تھا - یہ ملک میرباز خاں کی صاحبزادی اور ملک سکندر خاں ذیلدار نیز کپتان احمد یار خاں کی پھوپھی ہیں ان سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی [1]

اولاد کی آرزو

ملک صاحب کی جائیداد بہت زیادہ تھی اور وہ پنجاب کے بہت بڑے سرداروں میں شمار ہوتے تھے - اولاد نہ ہونے کا خیال انہیں بہت پریشان رکھتا تھا - ایک مرتبہ چوہا سیدن شاہ گئے، جو پیری کی مشہور گدّی تھی - وہاں خواب دیکھا کہ خدا نے انہیں دو خوبصورت فرزند عطا کئے ہیں [2] اسکے بعد پھر شادی

---

[1] یہ تمام حالات خاندانی روایات پر مبنی ہیں - [2] ملک صاحب موصوف کے صرف ایک بیٹا ہوا یعنی ملک عمر حیات خاں مرحوم و مغفور، جب ملک عمر حیات خاں کو خدا نے خضر حیات خاں عطا کیا تو چونکہ وہ ملک عمر حیات خاں کا زیادہ سے زیادہ ہم شکل تھا اس لئے سمجھا گیا کہ ملک صاحب خاں کو خواب میں دو بیٹوں کی جو بشارت دی گئی تھی اس سے مراد ایک بیٹا اور پوتا تھا

کا خیال آیا - ان کے رفیقانِ خاص میں سے چودھری ہوتا خاں بہت نامور تھے - وہ ذات کے راجپوت قوم گوندل میں سے تھے، اور وقت کے ممتاز جوانمردوں میں گنے جاتے تھے - تمام جنگوں میں ملک صاحب کے ساتھ رہے - ہمیشہ صفِ اوّل میں لڑتے تھے، اس وجہ سے بہت زخم کھائے اور زخموں کے نشان ان کے جسم میں جا بجا موجود تھے - آخری شادی ان کی بیٹی سے کی جن کا نام "صاحبزادی" تھا اس وقت ملک صاحب کی عمر پینسٹھ سے تجاوز کر چکی تھی - ملک سر عمر حیات خاں مرحوم اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں

میرے والد نے کئی شادیاں کیں چند لڑکے پیدا ہوئے مگر عالم طفولیت ہی میں مر گئے - جب اتنی بڑی جائداد بن گئی تو پھر شادی کا خیال آیا کہ کوئی وارث ہونا چاہیے - اس واسطے انہوں نے چودھری ہوتا خاں، میرے نانا کی لڑکی سے شادی کی، جو اس وقت نوعمر تھیں، نہایت خوبصورت اور نہایت لائق -

اس شادی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ وارث عطا کیا جو نہ محض ان کے بلکہ پورے خاندان کو چار چاند لگانے والا تھا - اس وارث کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، جب ملک صاحب خاں کو خدا کی طرف سے بلاوا آگیا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے -

وفات

کہا جاتا ہے کہ ملک صاحب کو تپ محرقہ ہو گئی تھی، جس نے ابتداء ہی سے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ زندگی سے مایوسی ہو گئی - چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ میرا بچہ چھوٹا ہے، اس لئے ڈسٹرکٹ جج کو بلا کر پوری جائداد کورٹ آف وارڈز کے حوالے کر دی جائے، اس ارشاد پر عمل نہ ہو سکا اور ملک صاحب بیہوش ہو گئے خاندان کے بعض افراد کورٹ آف وارڈز کے خلاف تھے، لہذا ملک صاحب

کا یہ ارشاد تعطل میں پڑ گیا۔ بیمار ہونے سے بارہ روز بعد جاں بحق ہوئے۔ چونکہ بہت بڑے اور نامور سردار تھے، لہذا سرکار نے خود کورٹ آف وارڈز کا انتظام کر دیا۔

ملک عمر حیات خاں اپنے والد کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے، تاہم انہیں مرض الموت کے کچھ واقعات یاد تھے۔ مثلاً یہ کہ بہت سے آدمی بیمار پرسی کے لئے آتے رہتے تھے۔ وہ خود والد کے پاس جاتے اور کھانا کھلانے کے لئے بہ ضد ہوتے تو ملک صاحب خاں جگر بند کو خوش کرنے کی غرض سے نوالہ منہ میں ڈال لیتے۔ پھر نوالے کو پوشیدہ طور پر رومال میں لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیتے۔ اسلئے کہ وہ بیماری کے دنوں میں غذا نہ کھا سکتے تھے۔ اسی حالت میں وفات پائی۔

ملک عمر حیات خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ والد کی وفات پر گھر میں کہرام مچ گیا تو اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی، لوگ روتے پیٹتے اور مجھے غصہ آتا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ میں نے جب پوچھا کہ ابا جان کہاں ہیں تو والدہ اور دوسرے عزیزوں نے بتایا کہ انہیں پیر صاحب نے بلا بھیجا ہے۔ چنانچہ جب کوئی مجھ سے والد کے متعلق پوچھتا، تو میں یہی جواب دیتا کہ وہ پیر صاحب کے پاس گئے ہوئے ہیں۔

نواں باب

ملک صاحب خاں کی شخصیت

نمایاں اوصاف ملک عمر حیات خاں اپنے والد ماجد کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا قد تقریباً چھ فٹ نصف انچ تھا اور رنگ سفید - اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بڑے وجیہہ اور خوبصورت آدمی تھے - شہسواری میں ان کے کارنامے ضرب المثل مانے جاتے تھے۔ ان کے عہد میں دور دور تک ان سے بہتر سوار کا نشان نہ ملتا تھا۔ آخری عمر تک انہیں گھوڑے پالنے کا شوق رہا، وہ بہت تیز دوڑتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹھ آدمی قطار میں کھڑے کر کے خود ایک سرے پر کھڑے ہو جاتے - یہ دوڑتے اور سب آدمی ساتھ ہی دوڑ پڑتے، لیکن یہ سب سے آگے نکل جاتے - اگرچہ دوڑ کے آغاز میں ان کے اور قطار کے آخری آدمی کے درمیان اُنسٹھ آدمیوں کا فیصلہ ہوتا جسے کم از کم تیس بتیس گز کا فاصلہ سمجھنا چاہیے -

دیانت، راست بازی اور توازن

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ملک صاحب خاں کو دیانتداری، راست بازی اور صاف گوئی میں ممتاز شہرت حاصل تھی۔ وہ خاندانی جھگڑوں سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ جو کچھ پیدا کیا، اللہ کے فضل کے بعد قوتِ بازو سے پیدا کیا۔ خدا داد صلاحیتوں کی بنا پر عزت میں بھی بلند مرتبہ پایا اور جائیداد کی ترقی بھی کمال تک پہنچا دی۔ ملک عمر حیات خاں نے لکھا ہے کہ میرے والد نے اپنی زمینیں خوب آباد کر لیں تو حسنِ انتظام کے باعث ان کی آمدنی بہت بڑھ گئی، وہ جائز ضرورتوں پر کشادہ دلی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ فضول مشغلے کبھی پسند نہ کیے، کفایت شعاری ان کی سیرت کا خاص جوہر تھی۔ اس وجہ سے ان کے پاس بہت زیادہ روپیہ جمع ہوگیا تھا۔

خاندانی جھگڑوں سے علیحدگی

خاندانی جھگڑوں سے علیحدگی کا ذکر لیپل گرفن نے بھی بہ طور خاص کیا ہے۔[1] مختلف انگریز افسروں نے بھی جنھیں ملک صاحب خاں سے تعلق پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اس خصوصیت کا بہ طورخاص اعتراف کیا۔ گویا ملک صاحب خان کی سیرت میں یہ پہلو انہیں بہت ابھرا ہوا نظر آتا تھا۔ حق یہ ہے کہ جس بلند ہمت شخصیت نے زندگی کے آغاز میں خاندانی اعزازات سے بالکل الگ ہو کر عزت اور دولت پیدا کی۔ وہ کامیابی کے درجہ عروج پر پہنچ کر چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں پڑنا کیونکر گوارا کر سکتا تھا؟

اب آپ مختلف ذمہ دار افسروں کی شہادتیں ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ گور اوسلے ڈپٹی کمشنر شاہ پور:۔

---

[1] لیپل گرفن جلد دوم صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۶ ۔ [2] Gore Ouseley.

ملک صاحب خاں ان چھوٹے چھوٹے خاندانی جھگڑوں سے بالکل بے تعلق رہتے ہیں جن کے باعث ٹوانوں نے اپنی عزت کا دامن آلودہ کر لیا۔

۲ - سر فریڈرک رچرڈ پولک کمشنر راولپنڈی

ملک صاحب خاں ان خاندانی جھگڑوں سے بالکل بے تعلق رہے جنہوں نے ٹوانہ رئیسوں کو رسوا کر دیا ہے۔ ٹوانوں نے میدان جنگ میں جو بلند شہرت حاصل کی تھی، ان جھگڑوں نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔

۳ - ولیم جارج ڈیویس ڈپٹی کمشنر (بالآخر فنانشل کمشنر ممبر لیجسلیٹو کونسل وغیرہ) -

ملک صاحب خاں اپنی برادری کی کشمکشوں سے بالکل بے تعلق رہے، جو جہلم پار رہتی ہے۔

۴ - کرنل پیری نسبٹ ڈپٹی کمشنر :-

ملک صاحب خاں ٹوانہ خاندانی جھگڑوں اور رقابتوں سے الگ تھلگ رہے۔ اس بنا پر ان کے ساتھ میل جول سہل اور خوشگوار ہے۔

۵ - کرنل فیرنگٹن کمشنر راولپنڈی :-

ملک صاحب خاں مٹھا ٹوانہ ضلع شاہ پور کے رشتہ داروں کے تنازعوں سے بالکل الگ رہتے ہیں

یہ شہادتیں اس غرض سے جمع کر دی گئیں کہ ملک صاحب خاں کی سلامت روی اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے علیحدگی ہر انگریز افسر کو ایک غیر معمولی خصوصیت نظر آتی تھی۔

William George Sir Frederick Richard Pollock
Parry Nisbet - Davies.
Farrington. -

آباد کاری اور جانور پالنا

ملک صاحب خاں کی شانِ آباد کاری اسی سے ظاہر ہے کہ نہریں نکال کر اپنی زمینیں بھی آباد کیں اور عام لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا۔ ان خصوصیتوں کا ذکر بھی مختلف انگریز افسروں نے تحسین آمیز انداز میں کیا۔ مثلاً:

۱۔ کپتان کاربن[۱] ڈپٹی کمشنر:

ملک صاحب خاں نے ضلع میں ایک نہایت عمدہ نہر کا انتظام کیا ہے۔ جانور پالنے سے بھی انھیں بہت دلچسپی ہے اور عام اصلاحات پر بھی ان کی خاص توجہ ہے۔

۲۔ کرنل پیری نسبٹ[۲]:

ملک صاحب خاں کھیتی باڑی اور دیہاتی مقاصد میں بہت کامیاب ہیں۔ گھوڑے پالنے میں ان کے شوق اور اپنے گھوڑوں پر حسنِ توجہ اور اہتمام کے باعث ضلع میں گھوڑوں کی نسل بہت اصلاح پا گئی ہے۔ اور ملک صاحب اس سلسلے میں خاص ستائش کے مستحق ہیں۔

۳۔ جانسٹن ڈپٹی کمشنر[۳]:

ملک صاحب خاں کھیتی باڑی کرانے نیز گھوڑے اور دوسرے جانور پالنے میں جو دلچسپی لے رہے ہیں، اسے ایک فالِ نیک کی حیثیت حاصل ہے۔

بریگیڈیر جنرل بڈلف[۴] کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے

۱۔ Corbyn ۲۔ Parry Nisbet

۳۔ Johnstone ۴۔ Biddulph

کہ ۱۸۷۵ء کے میلے میں ملک صاحب کے پالے ہوئے گھوڑوں نے انعامات حاصل کیے تھے۔ جنرل موصوف نے ایک مکتوب میں ملک صاحب خاں کو لکھا ہے۔

گھوڑے پالنے کے سلسلے میں آپ نے جو کوششیں کیں، وہ کسی دوسرے دیسی آدمی سے بن نہ پڑیں۔ آپ کی کامیابی دوسروں کے لیے ایک مثال ہے۔

تقریباً اسی قسم کے الفاظ کرنل فیرنگٹن کمشنر نے ملک صاحب خاں کے متعلق استعمال کئے۔

جامع اوصاف

ملک صاحب خاں کی شجاعت، مستعدی، فرض شناسی، تنظیم پسندی اور دانشمندی کی شہادتیں بہ کثرت اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ سر ہربرٹ ایڈورڈز[۱] نے لکھا ہے کہ ملک صاحب خاں نمود و نمائش سے بالکل پاک ہیں۔ حد درجہ جفاکش ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے سپاہی بھی ہیں۔ تمام افسروں نے ان کی راست بازی کی تعریف کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ موصوف سے کوئی بات پوچھی جائے۔ وہ غلط بیانی کے دھبّے سے بالکل مبرّا ہوتی ہے گوراوسلے کا بیان ہے کہ ملک صاحب موصوف روشن خیال اور مردانہ، اوصاف کے آدمی ہیں۔ میں نے دیسی باشندوں میں ان جیسا کوئی نہ دیکھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں!

---

[۱] Herbert Edwardes

میں ان کے کسی بیان میں آج تک ایک بھی خلاف حقیقت بات کا پتہ نہ لگا سکا۔ یہ یقیناً بہت بڑی تعریف ہے۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ اس دیسی باشندے کے متعلق ہے، جس کے ساتھ مجھے چھ سال سے شناسائی حاصل ہے [1]

بالکل اسی قسم کے خیالات کا اظہار ولیم جارج ڈبولیس نے کیا ہے۔ سر ایڈورڈ کلائو بیلی [2] (جو مختلف اونچے عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ کم و بیش دس سال حکومت کے ہوم سیکرٹری رہے) لکھتے ہیں کہ میں نے مدّت کے بعد ملک صاحب خاں سے شناسائی کی تجدید کی!

اس اثنا میں ملک صاحب موصوف نے بہادری، وفا شعاری، اعلیٰ درجے کی دیانت اور راست بازی میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جو انگلستان کے بھی بڑے سے بڑے آدمی کے لیے باعثِ فخر ہوگا۔ انھوں نے نیک نامی میں جو شہرت پائی ہے، میری کوئی ستائش اس میں اضافہ نہیں کر سکتی اور وہ بعد از آں جو کچھ کریں گے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ان کی شہرت میں ہرگز کمی نہ آئے گی۔

یہ تعریفات کسی تبصرے کی محتاج نہیں اور یہ سب کچھ اس شخصیت کے متعلق کہا گیا، جس نے موقعے حاصل ہونے کے باوجود

---

[1] گورادسلے کا مطلب یہ ہے کہ چھ سال کی طویل مدّت میں کسی دیسی باشندے کے بیانات کے متعلق خلاف حقیقت بات کا پتہ نہ لگا سکنا بڑی تعریف ہے۔ ابتدائی دور میں دیسیوں کے باب میں انگریزوں کی رائے اچھی نہ تھی۔ ممکن ہے انہیں متواتر ناگوار تجربات سے سابقہ پڑا ہو۔ بہ ہر حال ملک صاحب خاں انہیں بالکل غیر معمولی شخص معلوم ہوتے تھے۔

[2] Eedward Clive Bayley

انگریزوں کے ماتحت کوئی ملازمت اور کسی نوع کی مشغولیت اپنے لیے پسند نہ کی۔

سب سے آخر میں لیڈی ولسن کے مکاتیب میں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ موصوفہ ملک صاحب خاں کا ذکر کرتی ہوئی لکھتی ہیں کہ شمالی ہند میں غدر فرو ہو جانے کے بعد ملک صاحب موصوف وسط ہند میں جنرل نیپیرؔ کے ساتھ پھرتے رہے :

سب سے بڑھ کر یہ کہ امن کے زمانے میں ان کی زندگی سب سے بہتر رہی۔ اس وجہ سے وہ خاندان بھر میں ممتاز ہو گئے جو باہمی جھگڑوں کے باعث اچھی شہرت کا مالک نہیں۔ خوبیوں کی فراوانی ہی کے باعث ملک موصوف کو "ستارہ ہند" کا تمغہ ملا[۱]

ایک قابل ذکر واقعہ

حکیم نورالدین صاحب نے جو میرزا غلام احمد قادیانی کے جانشین بن گئے تھے، ملک صاحب خاں کے متعلق ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے۔ ملک صاحب موصوف ایک مرتبہ کسی انگریز سے ملنے کے لیے گئے۔ اس نے پوچھا: سردار صاحب! بتائیے۔ کیا محمد رسول اللہ (صلعم) سچے رسول تھے؟ انھوں نے معاً جواب دیا کہ میں اور تو کچھ نہیں جانتا، البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی

---

[۱] لیڈی ولسن کے خطوط صـ ۱۲۹

کوٹھی میں آکر محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سچّے رسول ہی معلوم ہوتے ہیں ۔ انگریز نے پوچھا ، کیسے ؟ ملک صاحب نے کہا !

میرے پاس تین لاکھ روپیہ جمع ہے ۔ اسّی برس کی عمر ہے ۔ اولاد کوئی نہیں [1] پھر بھی تمہاری کوٹھی میں آکر یہی جی چاہتا ہے کہ کچھ زمین مل جائے، کرسی کا درجہ بڑھ جائے [2] وغیرہ ۔ دنیا میں دولت، عورت وغیرہ لطف کی چیزیں ہیں لیکن حضرت محمد (صلعم) نے فرمایا : دُنیا سے محبّت نہ کرو ۔ کسی کا مال نہ لو ۔ کسی کی عورت کو مت دیکھو ۔ زنا نہ کرو ۔ پھر یہ کہ اپنی اولاد کے لئے بھی آمدنی کی کوئی کرمقرر نہیں کی ۔ سادات کو زکوٰۃ لینے سے بھی منع کیا ۔ بس اب یہ بتاؤ کہ پیغمبری سے انھوں نے کیا فائدہ اٹھایا اور کیا آرام حاصل کیا ... یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے زبردستی ہی پیغمبری کا دعویٰ کرایا ہوگا یعنی خدا تعالیٰ ہی نے پیغمبر بنایا ہوگا

انیسویں صدی میں انگریزوں کا اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کی کسی بات کا دوبدو جواب دینا آسان نہ تھا، تاہم ملک صاحب خاں نے اپنے مذہبی عقیدے کے متعلّق خفیف سی

---

[1] ملک صاحب خاں کی عمر اس وقت ستر سال کے قریب تھی اور ملک عمر حیات خاں ابھی پیدا نہ ہوئے تھے ۔ [2] اس سے مراد ہے کہ دربار کے موقع پر بیٹھنے کے لئے بلند درجہ ملے ۔

مداہنت بھی گوارا نہ کی۔ حکیم نورالدین صاحب کہتے ہیں۔ یہ حقائق سُن کر میں نے کہا کہ اب ملک صاحب خاں کے ضرور لڑکا پیدا ہو گا[۱] چنانچہ خدا نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔

"تحفہ امیر" کا بیان

"تحفہ امیر" میں مرقوم ہے کہ ملک صاحب خاں بہت عقلمند آدمی تھے اور اچھے پڑھے لکھے تھے۔ ملک فتح خاں نے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے خزانے کا انتظام ملک موصوف کے سپرد کر رکھا تھا اور انھوں نے انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے[۲]

یہ ملک صاحب خاں تھے، جو اپنے غیر معمولی اوصاف کی بنا پر نہ صرف خاندان میں بلکہ اس دور کے اکثر افراد میں بالکل بے مثال تھے۔

اُس زمانے میں شاہ پور ضلع کا صدر مقام تھا اور وہاں لوگ بہ کثرت آتے رہتے تھے، لیکن ان کے ٹھہرنے کے لیے مناسب جگہ کوئی نہ تھی۔ ملک صاحب خاں نے ذاتی خرچ سے ایک وسیع اور عالیشان سرائے بنوائی، جس کا ذکر کپتان ولیم جارج ڈیویس ڈپٹی کمشنر نے ۹ر دسمبر ۱۸۶۴ء کے ایک مکتوب میں ایک اہم رفاہی کارنامے کے طور پر کیا ہے۔

---

[۱] "مرقات الیقین فی حیات نور الدین" طبع اوّل ص ۲۴۷-۲۴۸۔
[۲] "تحفہ امیر" ص ۱۱۶

چوتھا حصّہ

پہلا باب

ملک عمر حیات خاں کا بچپن

پیدائش جنرل عمر حیات خاں ۵ اکتوبر ۱۸۷۴ء (مطابق ۲۳ شعبان ۱۲۹۱ھ) کو پیر کے دن صبح کے وقت میگھا[1] ہی میں پیدا ہوئے۔ وہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ اس وقت:

> میرے والد بھیرہ میں بیمار تھے۔ میری پیدائش کے وقت والدہ کو ایسی تکلیف ہوئی کہ والدہ اور بچہ کی موت قریب تھی، مگر میری نانی صاحبہ نے ایک سوار ایک خدا رسیدہ پیر صاحب کی خدمت میں روانہ کیا کہ وہ خدائی کلام کا تعویذ لے آئے۔ یہ سوار تعویذ لے آیا۔ اس کے بعد

---

[1] - میگھا کالرا اسٹیٹ میں دریائے جہلم کے کنارے ایک خوشگوار مقام ہے۔ شروع میں اسی کو اسٹیٹ کے اندر مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ پھر کالرا مرکز قرار پایا اب میگھا میں نہایت عمدہ عمارتیں بن گئی ہیں۔

میری پیدائش ہوئی۔[1]

ملک صاحب خاں کی عمر اس وقت پینسٹھ اور ستر کے درمیان تھی۔ وہ بہت بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ آخری عمر میں خدا نے انہیں بچہ دیا تو ان کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔؟ بھیرہ میں انہیں یہ خوشخبری ملی تو فوراً روانگی کا انتظام کر لیا۔ تاکہ لختِ جگر کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ اُس زمانے میں موٹریں تو کیا، گاڑیاں اور یکے بھی نہ ملتے تھے۔ بیل گاڑی کے سوا پہیے کی سواری نہ تھی۔ عموماً گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ ملک صاحب خاں بھیرہ سے کشتی پر سوار ہوئے اور اسی سواری میں میگھا پہنچے جو بھیرہ کی طرح دریائے جہلم کے بائیں کنارے واقع ہے۔ اور اس زمانے میں دریا ہی آسان ترین ذریعہ تھا۔

جشنِ شادمانی

میگھا پہنچے تو بچے کی خوشی میں بہت روپیہ تقسیم کیا اور بڑی خوشیاں منائیں، جنرل صاحب لکھتے ہیں کہ میرے والد کو راگ کا بڑا شوق تھا۔ ہمیشہ گویے اور کلاونت ان کے پاس رہتے تھے، وہ خود بھی طنبورے کے ساتھ بہت اچھا گاتے تھے۔ انہوں نے شاہ پور میں ایک بہت بڑی سرائے لوگوں کے آرام کے لئے بنوائی تھی کیونکہ شاہ پور ہی اس زمانے میں ضلع کا صدر مقام

---

[1] جنرل سر عمر حیات کی خود نوشت سوانح عمری قلمی نسخہ صنا۔ ۵؍اکتوبر ۱۸۷۸ء کی تاریخ، خود ملک صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے ۱۹۳۵ء والدہ ماجدہ کی تاریخ وفات کے ساتھ اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۷۶ء لکھی ہے۔

دونوں تاریخوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ سمجھ لیا جائے، پیدائش اکتوبر ۱۸۷۶ء میں ہوئی، تاریخ ۵؍اکتوبر مانی جائے۔ یا ۲۱؍اکتوبر۔

تھا۔ جب میگھا میں خوشیاں منائی جاچکیں تو شاہ پور پہنچ کر ضلع بھر کے آدمیوں کے لئے پُرتکلف دعوت اور جلسے کا انتظام کیا گیا۔ سنا جاتا ہے کہ بہت سے آدمیوں نے ان سے بھی گانا سنانے کی درخواست کی، چنانچہ انہوں نے یہ درخواست بھی قبول کرلی اور گانا سنایا۔ غرض بچے کی پیدائش پر شادمانی کے جشنوں کا سلسلہ چھ مہینے تک جاری رہا۔

اخترِ اقبال کا طلوع

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ملک صاحب خاں نے رکھ کالرا کی افتادہ زمینیں لی تھیں تو حکومت نے یہ شرط عائد کی تھی کہ دریا سے نہر نکال کر اس علاقے کی آبیاری کا بندوبست کیا جائے، جس سے رکھ کی زمینوں کے علاوہ گردونواح کے دیہات بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس سے ملک صاحب کی ناموری میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے نہر کا انتظام کرلیا اور رکھ کالرا کی زمین کے پٹے کی تجدید وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، جنرل صاحب کی پیدائش کے بعد ملک صاحب خاں کو خیال ہوا کہ اب اس زمین کی ملکیت کے حقوق حاصل کرلینے چاہئیں۔ جنرل صاحب خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۷۶ء میں میرے والد نے حقوق ملکیت حاصل کرنے کے لئے شملہ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں متحدہ پنجاب کی حکومت کا گرمائی صدر مقام تھا۔ اور چلتے وقت میرا نام لے کر فرمایا کہ اس کی قسمت آزمائی کیلئے جارہا ہوں۔ اگر کالرا کے حقوقِ ملکیت مل گئے۔ تو میں سمجھوں گا کہ میرا بچہّ بڑا خوش نصیب ہوگا۔ چنانچہ اس سفر میں ان کی آرزو پوری ہوگئی۔ اور حکومت نے کالرا کے حقوقِ ملکیت دے دیئے۔ یہ نومولود کے اخترِ اقبال کی ابتدائی نور افشانی تھی۔ ملک صاحب خاں خود گوناگوں اعزازات حاصل کرچکے تھے، لیکن کالرا کی ملکیت کو وہ اپنے بچے ہی کی

بلند اقبالی کا کرشمہ سمجھتے تھے ۔ ستمبر ۱۸۷۶ء میں کمشنر نے رکھ کالرا کے متعلق آخری حکم جاری کر دیا، اور یہ زمینیں مستقل طور پر ملک صاحب نے حاصل کر لیں ۔ انہوں نے جس اہتمام سے اس زمین کو آباد کیا تھا، اس کی کوئی مثال اُس وقت گرد و نواح میں موجود نہ تھی ۔ پھر انہوں نے حکومت کی خواہش کے مطابق مستقل نہر کا انتظام کر دیا جو شمالی و مغربی پنجاب میں اپنی نوعیت کی پہلی نہر تھی ۔ اس سے علاقے کی زرخیزی پیداوار نیز حکومت کے مالیئے میں بہت اضافہ ہوا ۔

بعض دلچسپ واقعات

جنرل صاحب کا حافظہ غیر معمولی تھا، انہیں بچپن کے بہت سے دلچسپ واقعات یاد تھے، جن میں سے بعض خود نوشت سوانح عمری میں بھی درج کئے ۔ مثلاً لکھتے ہیں ۔

۱ ۔ ایک مرتبہ پیٹ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی اور بخار آگیا ۔ اس بیماری نے ذرا خطرناک صورت اختیار کر لی تو والد ماجد نے غلّے کے ایک بہت بڑے ذخیرے کا منہ کھلوا دیا اور تمام غریبوں میں اعلان کرا دیا کہ ہر شخص جتنا غلّہ چاہے، اٹھا لے جائے ۔ چنانچہ بہت سے لوگ گٹھڑیاں باندھ باندھ کر غلّہ اٹھا لے گئے، کچھ بھینسیں سیدوں کے گھر بھیجدیں ۔ اس لئے کہ ان کی خدمت میں کوئی چیز پیش کرنا باعث برکت سمجھا جاتا تھا، بہت سے بیل غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیئے ۔ نقد روپیہ بھی بانٹا ۔ بچے کی صحت کے لئے خیرات کے علاوہ دعائیں بھی کرتے رہے ۔ خدا نے فضل کیا ۔ بچے کا بخار اُتر گیا اور ملک صاحب کو اطمینان حاصل ہوا ۔

۲ ۔ ملک صاحب خاں نے اپنے لئے کالرا میں مکان تعمیر

کرائے تو اہل و عیال میگھا سے کالرا میں منتقل ہو گئے۔ جنرل صاحب اس وقت چھوٹے ہی تھے، وہ نئے مکانوں میں پھرتے پھرتے ایسی جگہ پہنچے، جہاں ایک پنکھا دیوار میں لگا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی انہیں خیال آیا کہ آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے یہ جگہ بہت موزون ہے، چنانچہ وہ پنکھے کے پیچھے چھپ گئے۔ والد اور نوکروں چاکروں نے تلاش شروع کر دی۔ کسی کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ پنکھے کی آڑ میں ہوں گے، والدہ نے انہیں سنہری زیور پہنا رکھے تھے۔ شبہہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی بد معاش زیور کے لالچ میں بچے کو لے گیا ہے۔ زیور اتار لے گا۔ اور بچے کو خدا جانے کہاں پھینک دے، چنانچہ سوار اور پیدل ہر طرف دوڑا دیئے گئے۔ اس اثنا میں جنرل صاحب چھپنے کا شوق پورا کر کے آڑ سے باہر نکلے۔ وہ فرماتے ہیں کہ والد نے سخت تنبیہہ کی۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ میں تو آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اس پر تنبیہہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس سے ظاہر ہے کہ جنرل صاحب اُس زمانے میں بہت چھوٹے تھے۔ انہیں قطعاً اندازہ نہ ہو سکا کہ گم شدگی نے والدین اور دوسرے عزیزوں کو کتنی تشویش کا تختۂ مشق بنایا۔

۳۔ ان کے ہاں مشرقی پنجاب کا ایک آدمی ملازم تھا، جو کسی واسطے کو "کہو" کہتا تھا، لہٰذا اس نام سے مشہور ہو گیا، وہ جنرل صاحب کا کھلاوا تھا۔ ایک مرتبہ ایک موٹے چیونٹے نے جنرل صاحب کو کاٹا "کہو" نے اسے پکڑ کر الگ کرنا چاہا تو وہ بیچ میں ٹوٹ گیا۔ بڑی مشکل سے الگ کیا۔ جنرل صاحب فرماتے ہیں، اس وقت سے مجھے کیڑے سے ایسا ڈر پیدا ہو گیا کہ وہ میرے قریب بھی آجائے تو بے چین ہو جاتا ہوں۔

۴ - والد کے مرض الموت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ والدہ مجھے بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں - اچھے کپڑے پہناتی تھیں - والد کا مزاج پوچھنے کے لئے بہت لوگ آتے تھے - ایک مرتبہ خان بہادر ملک حاکم خاں آئے جو ٹوانوں میں بہت بڑے آدمی مانے جاتے تھے - انہوں نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ اسے اتنا صاف ستھرا نہ رکھنا چاہیے اور چہرے پر ایک کالا نشان ضرور بنا دیا جائے نیز کپڑے میلے رکھے جائیں -

جنرل صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے ملک حاکم خاں بہت معزز معلوم ہوئے ، اس لئے یہی مناسب نظر آیا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں جلد پورا ہو جانا چاہیے - چنانچہ میں گھر میں گیا ، توا ڈھونڈ کر اپنا چہرہ کالا کر لیا اور کپڑوں پر راکھ مل لی - لوگوں نے دیکھتے ہی پوچھا یہ کس کا فعل ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ خود میں نے کیا ہے ، اس لئے کہ ملک حاکم خاں نے یہی کہا تھا - غرض اس کے بعد ملازموں نے مجھے نہلا کر اندر بھیج دیا کہ نئے کپڑے پہنا دیئے جائیں۔

تربیت کا قابلِ قدر نمونہ

جنرل صاحب نے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ ایسا بھی لکھا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک صاحب خاں اپنے فرزند ارجمند کی تربیت میں کس قدر احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیتے تھے -

اہل و عیال ابھی میگھا ہی میں تھے - جنرل صاحب کی عمر تین چار سال کی ہو گی کہ ایک مرتبہ قلندر بندر لے کر آئے - جنرل صاحب نے بندروں کا تماشا کبھی نہ دیکھا تھا - اور دیکھنا چاہتے تھے - لیکن ملک صاحب خاں نے بندروں کے تماشے غیر مناسب سمجھ کر حکم دے دیا کہ قلندر میگھا سے نکل جائیں - جنرل صاحب کے دل

میں شوق حسرت بن کر رہ گیا تاہم یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ میں تماشہ دیکھنا چاہتا ہوں

قلندروں کے جانے کے بعد بچے نے کہا : ابا! اب تو بندر کھگے والی[1] بیری کے پاس پہنچ گئے ہوں گے ۔ دو تین مرتبہ پھر اسی قسم کے کلمات دھرائے ۔ یہ سن کر والد کو خیال آیا کہ بچے نے تماشا نہیں دیکھا اور یہ حسرت اس کے دل میں باقی رہ گئی۔ چنانچہ فوراً سوار کو قلندروں کے پیچھے دوڑایا ۔ وہ انہیں واپس لایا ۔ پھر سارا دن تماشہ ہوتا رہا اور حکم دے دیا کہ جب تک بچہ تماشے سے سیر نہ ہو جائے ، یہ سلسلہ بند نہ کیا جائے ۔

جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اپنے فرزند ملک خضر حیات خاں کے متعلق ایک مرتبہ یہی طریقہ اختیار کیا ۔

اسے سؤر کے شکار کا شوق پیدا ہو گیا تھا ۔ اور یہ شوق خطرناک تھا ۔ اس میں کئی گھوڑے زخمی ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرے لختِ جگر کو بھی گزند نہ پہنچے۔ یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں نے اسے حکماً روکا تو دل میں شوق باقی رہے گا ، لہذا ایک مرتبہ میں نے سخت گرمی کے دنوں میں کہا کہ اس وقت سؤر کا شکار ہونا چاہیے ۔ میں خود گرمی برداشت کرنے کا عادی تھا اور دیر تک سواری کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہ کرتا تھا ۔ لہذا گرمی میں اپنے بیٹے کو خوب تھکا کر واپس لایا ۔ پھر کہا کہ ابھی شکار سے

---

[1] ۔ یہ بیری میگھا سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے ۔

طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ کل صبح پھر چلیں گے۔ چنانچہ دوسرے اور تیسرے دن بھی یہ سلسلہ برابر جاری رکھا۔ چوتھے دن خضر حیات خاں نے عذر کیا۔ کہ میں تھک گیا ہوں۔ آج نہیں جانا چاہتا۔ اس کے بعد اس کا شوق بھی کم ہو گیا۔

دوسرا باب

تعلیم و تربیت

بسم اللہ جب جنرل صاحب کی عمر چار سال چار مہینے اور چار دن کی ہوئی تو رواج عام کے مطابق ان کی بسم اللہ کا انتظام بڑے اونچے پیمانے پر کیا گیا۔ محض بلند مرتبہ اور امیر گھرانوں ہی کا نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کا دستور بھی یہ تھا کہ وہ بچوں کی تعلیم کا آغاز ایسے لوگوں سے کراتے تھے، جو علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ اور عبادت گذاری میں بھی مشہور ہوتے تھے۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ ایسے بزرگ بسم اللہ پڑھا دیں گے تو ان کے تقدس اور دعا کی برکت سے بچوں کو علم کا شوق پیدا ہو گا اور وہ بہت بڑے عالم بن جائیں گے۔

جنرل صاحب کے خاندان میں پشتوں سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ ہر بچے کی بسم اللہ چاچڑاں شریف کے ایک بزرگ خاندان سے متعلق تھی، جسے گرد و نواح میں تقدس کا اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ جنرل صاحب کے بچپن میں علامہ مولوی فضل دین اس خاندان کے سرخیل تھے۔ وہ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ سیال شریف کے مشہور پیرِ طریقت حضرت خواجہ شمس الدین رح کے خلیفہ تھے۔ جنرل صاحب لکھتے ہیں۔

انہیں بلایا گیا اور انہیں نے مجھے الف بے پڑھانی شروع کی۔ وہ نہایت مشہور باخدا بزرگ تھے۔ اور ان کے روحانی کمالات کی بہت سی کہانیاں لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ انہوں نے فرمایا: یہ لڑکا امتحانات تو کم پاس کرے گا مگر جہاں لائق سے لائق آدمی موجود ہوں گے، وہاں بھی اسے ممتاز درجہ حاصل ہو گا[1]

ڈاکٹر فتح محمد

علامہ مولوی فضل دین صاحب ساکن چاچڑ[2] سے تعلیم کا آغاز محض بہ طور تبرک ہوا تھا چنانچہ وہ چند روز پڑھانے کے بعد اپنے وطن تشریف لے گئے اور جنرل صاحب ڈاکٹر فتح محمد کے پاس پڑھنے لگے جو قریشی علی مردان کے والد ماجد قریشی غلام بنی کے عزیز شاگرد تھے اور انہوں نے فضیلت کی سند داسو آستانہ ضلع جھنگ کی درسگاہ سے حاصل کی تھی جو انگریزی دور کا نظام تعلیم رائج ہونے سے پیشتر مغربی پنجاب کی بہت ممتاز درسگاہ مانی جاتی تھی۔ بلکہ اسے ایک لحاظ سے یونیورسٹی کا درجہ حاصل تھا ڈاکٹر صاحب کا طریقِ تعلیم جنرل صاحب کے بیان کے مطابق بہت پسندیدہ

---

[1] جنرل صاحب کی خود نوشت سوانح عمری صفحہ ۲ ۔ [2] چاچڑ میگھا سے چار میل ہے

تھا - چنانچہ انہوں نے ابتدائی کتابیں بڑے شوق سے پڑھیں۔ بعد میں انہیں زندگی کے گوناگوں مشاغل میں کتاب بینی کا موقع زیادہ نہ مل سکا - فارسی کی جو علمی کتابیں ہمارے ہاں عام طور پر رائج رہیں اور پرانے زمانے کے لوگ انہیں بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے، ان کے شعر جنرل صاحب کی زبان پر عموماً جاری رہتے تھے - یہ سب ابتدائی تعلیم ہی کی برکت تھی -

جنرل صاحب کے اپنے بیانات

جنرل صاحب نے جو یادداشتیں مختلف اوقات میں مرتب کیں، ان میں ابتدائی تعلیمی دور کے حالات بھی لکھے، جو اصلاً بھی بڑے دلچسپ ہیں اور آج اُن کا مطالعہ دلچسپ تر ہوگیا ہے - فرماتے ہیں :

١ - میں ہر طرح پڑھائی میں ترقی کرتا گیا - تین سال تک موسم گرما میں مجھے سون سکیسر لے جاتے رہے - پہلے سال ہم سپرنٹنڈنٹ پولیس اوکونر کی کوٹھی میں ٹھہرے - میری خبر گیری اور تعلیم کے لئے پہلے سال ڈاکٹر فتح محمد بھی ہمراہ گئے - اس وقت کاربن[1] صاحب ڈپٹی کمشنر تھے، جو پادری مزاج آدمی تھے - ان سے میرے اتالیق (ڈاکٹر فتح محمد) کی گہری دوستی تھی - اسی زمانے میں مجھے پہاڑ پر چڑھنے کا شوق ہوا - دوسرے سال ہم کوٹھی میانوالی میں ٹھہرے[2] - جو باد‌ا کے مکان کے قریب تھی - بادا کی گائیں بہت عمدہ تھیں -

٢ - میں نے اسی زمانے میں نوشہرہ، سوڈھی وغیرہ مقامات دیکھے

---

[1] - E.C. Corbyn. - یہ تین مرتبہ سرگودھا کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا تھا -
[2] - سرگودھا اور میانوالی کے انگریز افسروں نے اپنے لئے سون سکیسر میں کوٹھیاں بنوالی تھیں جہاں وہ خود موسم گرما گزارتے یا ان کے بال بچے رہتے - سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی الگ تھی، میانوالی کی الگ -

اور پیدل چلنے کی مشق کی ۔

۳ ۔ اسی زمانے میں ایک دربار بہ مقام لاہور منعقد ہوا ۔ میرا اتالیق مجھے ساتھ لاہور لے گیا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرایا ۔

۴ ۔ میرے کپڑوں میں سے کوئی بھی دربار میں پہننے کے لائق نہ تھا اس لئے دو جوڑے کمخاب کے تیار ہوئے ۔

۵ ۔ اس زمانے میں لارڈ ڈفرن[1] وائسرائے تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونچی ٹوپی پہنتا تھا ۔ ایک دربار دن کو ہوا اور ایک رات کو ہوا ۔ میں رات کے وقت لارنس ہال کے دربار میں شریک ہوا تھا ۔ ہم ایک گاڑی ساتھ لے گئے تھے ۔ دو ملازم وردی پہنے ہوئے ہماری گاڑی کے پیچھے سوار تھے ۔

۶ ۔ اس وقت کی میری پہلی تصویر ہے ، جو موجود ہے ۔

۷ ۔ اسی زمانے میں میرے لئے ایک بندوق منگوائی گئی ۔ اس سے پیشتر میں بندوق وری ماچھی (سقا) کے کندھے پر رکھ کر چلایا کرتا تھا ۔ ملک محمد خان مستیال مان کے والا میں ہمارا کاردار تھا ۔ وہ بھی مجھے بندوق چلانے کی مشق کراتا تھا ، مگر بندوق کو خود تھامے رکھتا اور میں صرف لبلبی دباتا ۔ اس طرح بندوق کی آواز کا عادی ہو گیا ۔ نئی بندوق میں نے خود چلائی اور چکور کا شکار کیا ۔ اس سے ایسا دھچکا لگا کہ کئی روز تک میرے شانے میں درد رہا ۔

قریشی صاحب اور مولوی بہادر علی

اسی زمانے میں قریشی علی مردان شاہ جنرل جب

---

[1] ڈفرن ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۸ء تک وائسرائے رہا ۔ جنرل صاحب جس دربار کا ذکر کر رہے ہیں ، وہ غالباً ۱۸۸۵ء میں ہوا تھا ۔ کیونکہ اسی سال ڈفرن امیر عبدالرحمن سے ملاقات کے لئے راولپنڈی پہنچا تھا اور وہاں بھی ایک دربار منعقد کیا تھا ۔

کی دینی تعلیم کے لئے مقرر ہو گئے۔ پھر جنرل صاحب نے انہیں اپنا مستقل رفیق و مشیر بنا لیا اور ان کی زندگی کے اوقات جنرل صاحب ہی کی معیت میں بسر ہوتے۔ قریشی صاحب کے خاندان سے اب تک ملک خضر حیات خاں کا برتاؤ وہی ہے، جو جنرل صاحب مرحوم کے زمانے میں تھا۔

دینیات کے علاوہ دوسرے مضامین کے لئے مولوی بہادر علی مقرر ہوئے جو ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ جب ملک صاحب چیفس کالج میں داخل ہوئے تو ان کے تینوں اساتذہ خود چیفس کالج میں ملازم ہو گئے۔ ان میں سے قریشی صاحب نے جنرل صاحب کی تعلیم ختم ہونے کے ساتھ ہی ملازمت چھوڑ دی اور ان کی معیت میں کالرا چلے گئے۔

مسٹر کرتی سنگھ جنرل صاحب اس گھرانے کے چشم و چراغ تھے، جو جائیداد کے لحاظ سے پنجاب کے چند بڑے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ جائیداد جنرل صاحب کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کے زیر انتظام آ چکی تھی۔ اس زمانے کے انگریز افسروں کی توجہ اور احساس ذمہ داری کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ انہوں نے جنرل صاحب کی تعلیم کے اہتمام میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ مشرقی علوم کے لئے اساتذہ مقرر تھے، لیکن مغربی علوم کے بغیر تعلیم مکمل نہ ہو سکتی تھی، اس غرض سے ایک ایسے اتالیق کی تلاش شروع ہوئی، جو انگریزی زبان اور علوم کا بہت بڑا ماہر ہو۔ بہ ایں ہمہ ہندوستانی ہوتا کہ اسے ملکی طور طریقوں کے مطابق عمل پیرا رہنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور جنرل صاجب کی تعلیم کا مقصد بہتر طریقے پر

پورا ہو سکے ۔ چنانچہ بڑے غور و فکر اور جد و جہد کے بعد ایک ایسا شخص مل گیا، جس کا نام کرتی سنگھ تھا ۔ کرتی سنگھ کا والد سکھ دربار میں ملازم تھا ۔ جب سکھوں کا آخری فرمانروا مہاراجہ دلیپ سنگھ حکومت سے الگ ہو کر ولایت گیا تو وہ کرتی سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا ۔ وہیں اس کی تعلیم مکمل ہوئی ۔ اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے اس نے فضیلت کی آخری سند حاصل کی۔

لیڈی ولسن کی شہادت

کرتی سنگھ کے اتالیق مقرر ہونے پر جنرل صاحب کالرا کے بجائے زیادہ تر شاہ پور میں رہتے تھے اور ان کا بنگلہ ولسن ڈپٹی کمشنر کے بنگلے سے قریب تھا جو بعد ازآں سر جیمز ولسن بنے ۔ ان کی اہلیہ لیڈی ولسن نے قیام ہندوستان کے زمانے میں بہت سے خطوط اپنے عزیزوں کو انگلستان میں لکھے تھے، جو بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہو گئے ۔ ۱۸۹۳ء کے ایک خط میں موصوفہ نے جنرل صاحب اور کرتی سنگھ کا بھی ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتی ہیں کہ امیروں کے بچے عنفوانِ شباب ہی میں خوشامدیوں سے گھر جاتے ہیں، جو انہیں بار بار اکسا کر غلط راہ پر لگا دیتے ہیں ۔

ہمیں ملک عمر حیات خاں کے متعلق ایسا کوئی اندیشہ نہیں ۔ اس میں انفرادیت ہمت، عقل و دانش اور حوصلہ مندی کے ایسے جوہر موجود ہیں کہ اس قسم کی ترغیبات سے متاثر ہونا بہ ظاہر بہت مشکل ہے

ملک عمر حیات خاں کی ایک خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے ایک غیر معمولی اتالیق مل گیا یعنی کرتی سنگھ ۔ کرتی سنگھ کا والد مہاراجہ دلیپ سنگھ کی والدہ کا "گرودیا" تھا ۔ مہاراجہ لڑکپن

میں کرتی سنگھ کو تعلیم کی غرض سے انگلستان لے گیا۔ اسے ایک موہوم سا خیال یہ بھی تھا کہ اپنا معاملہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے۔۔ یہ خیال ترک کر دیا گیا اور کرتی سنگھ نہایت اعلیٰ تعلیم پا کر ہندوستان آیا۔ اس میں اپنی قومیت کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہی تھی، اور ہندوستانی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا۔ جب وہ پہلے پہل ملک صاحب کا اتالیق بنا اور استاد شاگرد دونوں شاہ پور کے ایک بنگلے میں تنہا رہنے لگے تو کرتی سنگھ اپنے اوقاتِ فرصت دو اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز عورتوں کے ساتھ دانتے اور فاؤسٹ پڑھنے میں گزارا کرتا تھا جو اس وقت شاہ پور میں مقیم تھیں۔۔ ۔۔۔۔ ظاہری وضع قطع دیکھکر اس کی روح کی عظمت و برتری کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم چوڑا چکلا تھا۔ نظر بہ ظاہر وہ عالم کے بجائے پہلوان معلوم ہوتا تھا۔

استاد اور شاگرد کے متعلق مذکورۂ بالا تاثرات ایک ایسی خاتون کے ہیں، جو ضلع کے حاکم کی بیوی تھی اور جس کے متعلق قطعاً شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنے تاثر کے اظہار میں مبالغے سے کام لیا ہو گا۔ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ جس زمانے میں یہ خط لکھا گیا تھا، اس کے چھپنے اور منظرِ عام پر آنے کا کوئی امکان نہ تھا

تعلیم کی عام کیفیت | اساتذہ کے متعلق جو تفصیلات بیان ہو چکی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ جنرل صاحب

ل - لیڈی لین کے خطوط صہ ۱۱۴ صہ ۱۱۶ -

کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا گیا، مشرقی اور مغربی علوم کے علاوہ دینی تعلیم کو بھی بطورِ خاص پیش نظر رکھا گیا، تاہم صرف اچھے اسباب مہیا کر دینے سے کچھ نہیں بن سکتا، جب تک طالب علم میں ان اسباب سے فائدہ اٹھانے کے حقیقی جوہر موجود نہ ہوں - پھر تحصیل علم کیلئے توجہ اور محنت ضروری ہے - خدا کے فضل سے جنرل صاحب میں اچھے جوہر بھی موجود تھے اور وہ ابتدا ہی سے خاصے محنتی اور جفاکش تھے - قدرت نے انہیں اعلیٰ درجے کا حافظہ عطا کیا تھا، یہاں تک کہ اس دور کے حالات و واقعات بھی اُن کے ذہن میں آخری زمانے تک تازہ رہے، جب عام بچے پورے طور پر ہوش بھی نہیں سنبھالتے اور واقعات کے اخذ و فہم کی صلاحیت بھی ان میں پیدا نہیں ہوتی، انہوں نے ان انتظامات سے پورا فائدہ اٹھایا - اگرچہ وہ اصطلاحی معنی میں بڑے عالم نہ تھے - لیکن زندگی کے مختلف دوائر میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کیلئے جن دماغی صلاحیتوں اور علمی دسیلوں کی ضرورت ہے، ان سے وہ بہ وجہِ احسن بہرہ مند ہوئے اور ان مدارج پر پہنچے جو اجنبی حکومت کے ماتحت بہت کم اصحاب کو نصیب ہوئے -

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ انگریزی طریق کے ماہر کو اتالیقی کے لئے اس خیال سے منتخب کیا گیا تھا کہ جنرل صاحب کی تعلیم اسی طریقہ پر ہو جو انگلستان کے پبلک سکولوں میں رائج تھا - یعنی طالب علم کو دورانِ تعلیم میں ایسی زندگی بسر کرنے کی تربیت دی جاتی تھی کہ وہ کسی بھی دائرے میں دوسرے کا محتاج نہ رہے - وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرے اور جفاکشی کا زیادہ سے زیادہ عادی ہو جائے - چنانچہ اس زمانے میں جنرل صاحب

زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، انگریز طالب علموں کے لئے ایسے موقعے پیدا کئے جاتے تھے کہ وہ پہاڑی علاقوں میں پیدل چلیں - جنرل صاحب کی عمر تیرہ سال کی تھی، جب انہیں بھی مری سے کشمیر تک پیدل سفر کرنے کا موقعہ ملا - یہ ان کی تربیت کا اہم حصّہ تھا - اس سفر میں وہ کشمیر کی بلند چوٹیوں پر بھی چڑھے جو ہرامکھ[ل] کے قریب واقع ہیں اور یہ چوٹیاں مونٹ بلنک[ع] سے زیادہ بلند ہیں، نیز انہوں نے امرناتھ[ع] اور بعض دوسرے دور افتادہ مقامات کی سیر کی، جہاں پہنچنا بہت دشوار تھا - آج کل ان مقامات کے راستے نسبتاً اچھے بن گئے ہیں، لیکن جنرل صاحب نے تقریباً ستّر سال پیشتر یہ سفر کئے تھے، جب وہاں کسی قسم کی سہولت نہ تھی

جنرل صاحب کا بیان

جنرل صاحب نے کشمیر کی سیر و سیاحت کے متعلق بھی ایک دلچسپ بیان اپنی یادداشت میں چھوڑا - فرماتے ہیں -

۱ - تین سال کی تعلیم کے بعد میں اس لائق ہو گیا کہ مجھے کشمیر لے گئے - میں نے مری سے کشمیر تک پورا سفر پیدل طے کیا -

---

ل - ہرامکھ وادی کشمیر کا ایک مشہور پہاڑ ہے - جو وادی کی شمالی و مشرقی سمت میں اور سری نگر کے عین شمال میں واقع ہے - اس کی بلندی سولہ ہزار نو سو تین فٹ ہے

ع - یہ کوہ ایلپس کے اس حصّے کی ایک چوٹی ہے جو اٹلی اور فرانس کی سرحد پر واقع ہے - اگر کوہ قفقاز کو الگ رکھا جائے تو مونٹ بلینک یورپ کی سب سے بلند چوٹی ہے - ع امرناتھ شمالی و مشرقی سمت میں کشمیر کی حد کے قریب واقع ہے اور ہندؤں کا مشہور تیرتھ ہے، جہاں لوگ بڑی مشقتیں اٹھا کر پہنچتے ہیں اور اس تیرتھ کی بلندی سولہ ہزار چار سو بیالیس فٹ ہے اور اس کی چوٹی سترہ ہزار تین سو اکیس فٹ سے کم نہ ہوگی -

کشمیر میں امرناتھ کے گپھا اور ہرا مکھ پر چڑھا، گلمرگ، تاگمرگ وغیرہ دیکھے۔ ویری ناگ اور اچھابل تک سارا سفر عموماً پیدل طے کیا۔ اُس وقت کوئی تانگہ وغیرہ نہ تھا۔

۲ ہمارے ساتھ ایک جرمن بھی تھا، جس نے ملکہ وکٹوریہ کے لئے کشمیر کے نہایت عمدہ مناظر کی تصویریں لیں۔ یہ یہ تصویریں مجھے بھی دکھائیں۔ اُس مصوّر نے میری بھی ایک دستی تصویر کھینچی، جو میرے پاس موجود ہے۔

یہاں اور اس سے پیشتر جنرل صاحب کی یادداشتوں سے جو اقتباسات پیش کئے گئے، ان سے ممدوح کی طبیعت اور طریق تعلیم و تربیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں جفاکشی اور مشقت پسندی اُس وقت بھی موجود تھی۔ خود شوق سے پیدل چلنے کی مشق بہم پہنچائی۔ یہ اختیاری مشقتیں آئندہ زندگی میں ان کے لئے بڑی کار آمد ثابت ہوئیں، چنانچہ وہ امارت و ثروت کی فراوانی کے باوجود جانبازی کے مرحلوں میں بے تکلف پہنچتے رہے۔ وہ دنیوی معاملات میں فارغ البالی کو خدا کی رحمت سمجھتے تھے، ہمیشہ اس کے شکر گذار رہے، تاہم یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ خدا داد جوہروں سے کام نہ لیا جائے اور وہ سب کچھ نہ کیا جائے، جو ایک انسان کے قومی، ملکی اور انسانی فرائض میں داخل ہے۔



جرمنی کا شہرہ آفاق مصور Swabda کشمیر میں آیا ہوا تھا
جہاں اس نے ملک عمر حیات (عمر ۱۳ سال)
کی یہ تصویر بنائی۔



نو عمر ملک صاحب کی پہلی تصویر اس زمانے کے لباس میں

تیسرا باب

چیفس کالج کا دور

چیفس کالج میں داخلہ

۱۸۸۸ء میں جنرل صاحب چیفس کالج میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال کے قریب تھی چیفس کالج میں انہوں نے تقریباً پانچ سال گذارے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کالج کی بنا کا حال اختصاراً بیان کر دیا جائے۔

انگریزی حکومت کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط ہو گئیں تو بعض ہمدرد انگریز افسروں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ عوام کی تعلیم کے انتظامات تو شروع ہو گئے، لیکن امیروں اور رئیسوں کے بچوں یا رشتہ داروں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں۔ وہ وقت کے خاص حالات کے مطابق عام درسگاہوں میں شریک

ہونا گوارا نہیں کرتے اور سب کی حیثیت ایسی نہیں کہ وہ اپنے لئے اعلیٰ درجے کے وسائلِ تعلیم بہ طور خود مہیا کر سکیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طفلی ہی کے زمانے سے خود غرض خوشامدی ان کے گرد وپیش جمع ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگیوں کو غلط راہوں پر لگا دیتے ہیں - چنانچہ کیپٹن[1] والٹر پولیٹیکل ایجنٹ بھرت پور کی تجویز کے مطابق امیروں اور رئیسوں کے بچوں کے لئے دو عالیشان درسگاہیں بن گئیں - ایک اجمیر کا میو کالج، دوسرا کاٹھیاواڑ گجرات کا راجکمار کالج۔

وارڈز سکول انبالہ

انبالہ کمشنری میں جتنے رئیس اور جاگیردار تھے ان میں سے بعض کی جائدادیں نابالغی کے باعث حکومت کے زیرِ انتظام آگئی تھیں۔ انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن[2] ٹائی نے یہ تجویز پیش کی کہ ان بچوں کی تعلیم کے لئے ایک وارڈز سکول قائم کر دیا جائے - چنانچہ پنجاب کے فنانشل کمشنر کرنل لیک[3] نے اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا اور سر ڈانلڈ میکلوڈ لفٹننٹ[4] گورنر پنجاب نے ۱۸۶۴ء میں انبالہ کے اندر سکول قائم کر دیا، اس درسگاہ سے وہی بچے فائدہ اٹھا سکتے تھے، جنہیں انبالہ کی کمشنری سے تعلق تھا - اس میں طلبہ کی تعداد بھی کم تھی اور تعلیم کا درجہ بھی بالکل معمولی تھا۔

سر چارلس[5] ایچیسن پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بنا تو اسے خیال آیا کہ پورے پنجاب کیلئے لاہور جیسے مرکزی مقام پر رؤسا کے بچوں

---

۱ WALTER ۲ Tighe ۳ Lake ۴ Donald Mcleod. اس زمانے میں پنجاب کے گورنر کو لفٹنٹ گورنر کہا جاتا تھا - یہی شخص ہے جس کے نام سے لاہور کی مشہور سڑک میکلوڈ روڈ موسوم ہوئی ۵ Charles Aitchison

کی خاطر ویسے ہی کالج کا انتظام کر دے جیسے اجمیر اور کاٹھیاواڑ میں بن چکے تھے۔ چنانچہ انبالہ کے کمشنر مسٹر کولڈسٹریم[1] سے کہا گیا کہ وہ مجوزہ کالج کا دستور اساسی اور قواعد و ضوابط تیار کر دے۔ کرنل ہالرائڈ[2] نے نصاب تعلیم تیار کیا اور ۱۸۸۶ء میں وارڈز سکول انبالہ کے بجائے لاہور میں چیفس کالج کے قیام کی تجویز معرض وجود میں آگئی۔ اس کا مقصد و مدعا یہ قرار پایا کہ حکمران روسائ کے رشتہ داروں اور اونچے درجے کے خاندانوں کے بچے بہتر تعلیم و تربیت پا سکیں۔

اس کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ لفٹنٹ گورنر کی طرف سے روپیہ کے لئے ایک اپیل شائع کی گئی، جس پر مختلف ریاستوں اور روسا نے رقمیں پیش کیں۔ مثلاً ریاست پٹیالہ، کپور تھلہ، کشمیر، بہاولپور، حکومت ہند، ریاست نابھ، اور "ریاست فرید کوٹ"۔ بانی کے نام پر درسگاہ کا نام ایچیسن کالج رکھا گیا، اس مد میں ملک صاحب کی طرف سے بھی کورٹ آف وارڈز نے ایک رقم دی۔

مستقل عمارت کا انتظام

ابتدا میں کالج کا افتتاح تین بنگلے کرائے پر لے کر کیا گیا تھا۔ یہ عمارتیں طلبہ کے لئے کافی نہ تھی، چنانچہ بہت جلد کالج کے لئے ایک مستقل عمارت کی تجویز سامنے آگئی۔ شروع میں خیال تھا کہ اس کے لئے شاہدرہ کے آس پاس انتظام کر دینا مناسب ہوگا، غور و فکر کے بعد میانمیر اور لاہور شہر کے درمیان مستقل عمارت بنانے کی تجویز منظور ہوئی۔ اُس زمانے میں

---

[1] - coldstream. [2] Holroyed.

یہ سمت آبادی سے بالکل خالی تھی اور آج کل شہر اور چھاؤنی کے درمیان بنگلوں اور کوٹھیوں کی جو صفیں کھڑی ہیں، یہ بالکل ناپید تھیں۔ حکومت نے بہت وسیع جگہ بہ طور عطیہ دے دی۔ پھر عمارت کے لئے چندے کی اپیل کی گئی، دو لاکھ چھپن ہزار روپے مختلف ریاستوں اور بعض رئیسوں نے دیئے، حکومت کا عطیہ ملا کر کُل رقم چار لاکھ بیاسی ہزار ایک سو پر پہنچ گئی۔[1]

۳ر نومبر ۱۸۸۶ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ڈفرن[1] نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقعہ پر ڈیوک آف کناٹ[2] بھی موجود تھے، ۱۸۹۱ء تک عمارتیں مکمل ہوگئیں اور اس سرمائے کی رقم میں سے کُل چودہ سو روپے بچے گئے۔[3]

تعلیم کا انتظام پہلے لالہ امولک رام کو اس درسگاہ کا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا گیا تھا، پھر جنرل بلیک کو کالج کا گورنر بنا دیا گیا، لالہ امولک رام نے ہیڈ ماسٹری سے استعفا دے دیا اور اس کی جگہ مسٹر کیرتی سنگھ مقرر ہوگئے، جو ملک عمر حیات خاں کے اتالیق رہ چکے تھے۔ اس کالج کے اساتذہ میں سے بعض اصحاب بعد ازاں بہت اونچے مناصب پر پہنچے۔ مثلاً مولوی سر رحیم بخش مرحوم جو ملک عمر حیات خاں کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔ پھر ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۱ء تک کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر رہے۔ کالج کی ملازمت چھوڑ کر بہاول پور چلے گئے تھے، جہاں وہ نواب سر صادق محمد خاں عباسی کی نابالغی کے زمانے میں مجلسِ نیابت

[1] Duffein [2] Connaught [3] یہ تمام حالات چیفس کالج کی ایک رپورٹ اور سید لطیف کی تاریخ لاہور سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ مذکورہ کا پہلا ایڈیشن صفحہ ۲۵۶۔ سید لطیف نے لکھا ہے کہ کل عمارت پر تین لاکھ پچاسی ہزار پانسو بیس روپے خرچ ہوئے۔

(کونسل آف ریجنسی) کے صدر رہے - آخریں وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچے -

ملک صاحب کا زمانہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ملک صاحب ۱۸۸۸ء میں یہاں آئے تھے۔ اور وہ ہر جماعت میں عموماً ممتاز درجے پر فائز رہے یہاں تک کہ ایک سال میں انہوں نے سات انعامات حاصل کئے - اس وقت تک کالج کے کسی طالب علم نے ایک سال میں اتنے انعامات حاصل نہ کئے تھے -

ان کی طالب علمی کے زمانے میں بہت سے مسلمان، ہندو اور سکھ نوجوان اس درسگاہ میں تعلیم پاتے رہے، جن میں سے بعض نے بہت شہرت حاصل کی - مثلاً نواب محمد علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ، نواب سر ذوالفقار علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ، نواب فیض اللہ خاں علی زئی (ڈیرہ اسماعیل خاں) مخدوم سید شیر شاہ (ملتان) سردار امراؤ سنگھ شیر گل مجیٹھا، سردار سر سندر سنگھ شیر گل مجیٹھا، راجا طالب مہدی خاں (دارا پور جہلم) نواب نصیر الدین حیدر (فرخ نگر) نواب مراد علی خاں (دس بیلہ)، ممتاز حسین علی خان (پاٹودی) -

کھیلوں اور فنون میں کمال جنرل صاحب کی تعلیم و تربیت کا جو پہلو بہ طور خاص قابل ذکر ہے، یہ ہے کہ ان کی تعلیم صرف کتابوں تک محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے بہت سے مردانہ کھیلوں میں بھی درجۂ کمال حاصل کیا - مثلاً بھری گنگا، پھیکتی، پٹا بازی وغیرہ - انہیں جنگی فنون سے طبعی دلچسپی تھی، چنانچہ فوجی ڈرل باقاعدہ سیکھی - اسپ سواری کی تعلیم باقاعدہ

پائی - یہ فنون بعد کی زندگی میں ان کے بہت کام آئے - انہوں نے مختلف جنگی میدانوں میں نہایت اہم خدمات انجام دیں - اس سلسلے میں طبعی شجاعت کے علاوہ کالج کے زمانے کی تربیت بھی بڑی حد تک معاون ثابت ہوئی -

گھوڑے پالنے کا انہیں ابتدا ہی سے شوق تھا - کالج کے زمانے میں یہ فن بھی سیکھا - وٹرنری (بیطاری) کی تربیت بھی پائی[1] - چنانچہ وہ گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے علاج معالجے میں پوری مہارت رکھتے تھے - آگے چل کر معلوم ہوگا کہ تبت کی مہم میں جب علاج حیوانات کا کوئی ماہر فوج میں موجود نہ رہا تو ملک صاحب ہی خاصی مدت تک اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتے رہے - وہ صوبے کے بہت بڑے زمیندار تھے، لہذا کھیتی باڑی کی تعلیم بھی باقاعدہ حاصل کی - فسٹ ایڈ بھی بہ خوبی سیکھ لی تھی - کھیتی باڑی کا فن انہوں نے کرنل ہیلن[2] سے اور گھوڑے پالنے کا فن جرنل پیریٹ سے سیکھا -

ملک صاحب کا بیان

اُس زمانے کے بعض حالات بھی ملک صاحب نے بڑے دلچسپ انداز میں تحریر فرمائے ہیں

۱ - کالج کی تعلیم کے زمانے میں دستور تھا کہ طلبہ ایک سال پہاڑ پہ جاتے تھے اور دوسرے سال کراچی - چنانچہ میں ایک مرتبہ مری اور دوسری مرتبہ کشمیر گیا - دو سال کراچی

---

[1] وہ خود فرماتے ہیں کہ اس وقت جو ڈپٹی کمشنر تھا اس نے تاکید کی تھی کہ وٹرنری کا امتحان پاس کروں - میں نے بعد میں نعل بندی سیکھی، میرے پاس بہترین گھوڑے رہے جنہیں خود تیار کیا کرتا تھا - پھر سواری پر چند کتابیں پڑھیں آخر میں اس مضمون کا ایک چھوٹا سا کتابچہ جمع کر لیا جس میں[3] کتابیں تھیں

[2] Helon.

[3] Perot

گیا - ایک مرتبہ شہر میں رہا اور دوسری مرتبہ کلفٹن میں -

۲ - کشمیر میں ہمارا لکھ گئے تو تمام ساتھی سوار تھے - میں تین پڑاؤ یعنی تقریباً ۳۳ میل پیدل چلا -

۳ - تین پڑاؤ باقی تھے کہ ہمارا راشن ختم ہو گیا، کیونکہ برف باری کے باعث ہمیں حساب سے تین روز زیادہ پہاڑ پر رہنا پڑا -

۴ - مانسر بل سے روانہ ہوئے تو راستے میں سخت پیاس لگی - اسلئے سب واپس چلے آئے - صرف میں میرا شکاری اور میرا اتالیق پہاڑ پہ چڑھ سکے، مگر بڑی بری حالت ہوئی، میں اپنی لوئی، کوٹ اور بندوق راستے ہی میں پھینک گیا شکاری دوسرے دن یہ چیزیں لایا - پہاڑ پر ہمیں پانی مل گیا -

۵ - اس زمانے میں پیدل چلتے چلتے تھک جانے کا تو مجھے احساس ہی نہیں ہوتا تھا - پورا دن چل سکتا تھا، کشمیری بولی بھی میں نے سیکھ لی تھی اور کشتی چلانا بھی خوب یاد ہے، مگر تیرنا مجھے کبھی نہ آیا اور عمر میں ہزاروں میل موٹر پر طے کئے مگر موٹر چلانا بھی نہ سیکھ سکا -

۶ - میں کالج کی ڈی بیٹنگ سوسائٹی میں بھی حصہ لیا کرتا تھا - ایک دفعہ قلم اور تلوار پر بحث ہوئی - میں تلوار کا حامی تھا - ایک اور طالب علم نے قلم کی حمایت کی - خاصی بحث کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ووٹ لئے گئے تو میں ہار جاؤں گا، میں اپنے ساتھ ایک تلوار چھپا کرلے گیا تھا ووٹ لئے جانے کا وقت آیا تو میں نے وہ تلوار کھینچ لی - اور کہا کہ کوئی قلم لے کر آئے اور مقابلہ کرے - میں گنگے کا

کا ماہر تھا، کوئی بھی مقابلے پر نہ آیا اور میں جیت گیا۔

۷ - ایک دفعہ بازیگر تماشہ دکھانے کیلئے کالج میں آئے اور اپنے انداز میں گتکا کھیلنے لگے - کالج کے انگریز منتظم نے پوچھا کہ طلبامیں سے کوئی ان کے ساتھ گتکا کھیلے گا؟ میں تیار ہوگیا اور دانستہ اپنا پاؤں آگے کر دیا، بازیگر نے میرے پاؤں پر ضرب لگانی چاہی تو میں نے پاؤں ہٹا لیا اور اس کے سر پہ ضرب لگائی، منتظم بہت خوش ہوا اور مجھے شاباش دی۔

۸ - اس زمانے میں گتکے کی مشق کمال پر پہنچی ہوئی تھی گتکا کھیلنے والے ایک دوسرے کی آنکھ پر نظر رکھتے ہیں، میں آنکھوں اور ہاتھ سے الگ الگ کام لیتا تھا۔ آنکھ ایک طرف اشارہ کرتی تھی، ہاتھ دوسری طرف چلتا تھا۔

۹ - میں نے سواری میں بھی گتکے کی خوب مشق کر لی تھی اعجاز حسین خاں اس زمانے کے مشہور کھلاڑی تھے۔ ایک دفعہ سواری میں انہوں نے میرے ساتھ گتکا کھیلا تو میں نے انہیں بہت مارا۔

تعلیم کا آخری دور

تعلیم کا دور پورا ہونے والا تھا کہ جنرل صاحب کو پیچش ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ سمندر کا سفر مفید ہو گا، انہیں دنوں شکاگو (امریکہ) میں ایک بڑی نمائش ہونے والی تھی۔ میں نے اس میں شریک ہونے کی کوشش کی مگر جن نوجوانوں کی جاگیروں کا انتظام کورٹ آف وارڈز کی نگرانی میں تھا، انہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت



چیفس کالج سے فارغ ہونے کے بعد اس زمانے کے لباس میں



نصف صدی کے بعد چیفس کالج لاہور کے لان میں ٹوانہ خاندان کی تین پشتیں -
ملک عمر حیات - ان کے فرزند ملک خضر حیات اور ان کے فرزند
ملک نذر حیات - ان تینوں نے اسی کالج میں تعلیم پائی -

نہ تھی - چنانچہ مجھے بھی اجازت نہ ملی ، البتہ ہندوستان کے ساحل کے ساتھ جہازی سفر کی اجازت مل گئی ، چنانچہ جنرل صاحب کلکتہ سے مدراس ، سیلون گئے - پھر کوچین ٹھہرتے ہوئے بمبئی پہنچے - اس وقت تک صحت بحال ہو چکی تھی ، مراجعت پر انہیں کھیتی باڑی کرنے اور گھوڑے پالنے کی تعلیم کے لئے بابو گڑھ بھیجا گیا - وہیں کرنیل ہیلن سے انہوں نے کھیتی باڑی سیکھی تھی - جنرل پیریٹ گھوڑے پالنے کے ماہر تھے - ان کا مرکز کرنال میں تھا ، ان سے بھی تربیت پائی اور تعلقات اتنے اچھے ہو گئے کہ جنرل پیریٹ کالرا پہنچے ، جہاں انہوں نے جنرل صاحب کے گھوڑے دیکھے اور ایک ایک کے متعلق اپنی رائے دی -

املاک کا نظم و نسق

سنہ ۱۸۹۳ء میں وہ تعلیم مکمل کر کے چلے گئے - اُس وقت تک ان کے املاک کا انتظام سرکاری تحویل میں تھا - سر جیمز ولسن کی نگرانی میں انہوں نے انتظام املاک کی تربیت حاصل کی - کچھ وقت ملک حاکم خاں کے پاس بھی گذارا تاکہ ضلع کے معاملات کا تجربہ حاصل ہو جائے - پھر انہیں یہ موقعہ ملا کہ پورا نظم و نسق خود سنبھال لیں -

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ، وہ بڑی جائیداد کے تنہا وارث تھے - جو ان کی نابالغی کے زمانے میں بہت وسیع ہو چکی تھی اور روپیہ بھی بڑی مقدار میں جمع تھا - وہ اگر چاہتے تو کسی محنت اور مشقت کے بغیر حد درجہ اطمینان ہی نہیں ، امیری کی زندگی بسر کر سکتے تھے - لیکن وہ ان خوش نصیب

لوگوں میں سے تھے، جو آبائی میراث پر کبھی قانع نہ ہوئے۔ ان کی ہوش مندی کا آغاز ایسے حالات میں ہوا، گویا وہ سب کچھ ذاتی محنت و مشقت اور ذاتی ہمت و جان فشانی سے مہیا کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے لئے انہوں نے اپنی طبعی جوہر وقف کر دیئے۔ اسی کے لئے وہ عمر بھر سرگرم عمل رہے جُسن اتفاق سے انہیں تعلیم و تربیت کے ایسے موقعے مل گئے۔ جو اُن کی طبیعت آرزو اور مذاق کے عین مطابق تھے۔ اس طرح ان کے ذاتی اوصاف نے جلا پائی اور وہ مستقل زندگی کے سٹیج پر نمودار ہوئے۔ تو اگرچہ انہیں سرکاری یا عوامی دائروں میں کوئی خاص درجہ یا شہرت حاصل نہ تھی، تاہم قدرت نے ان کے اندر جو قوتیں ودیعت کی تھیں، وہ ایسی تربیت پا چکی تھیں کہ امتحان و آزمائش کے ہر موقع پر بہترین صورت میں بروئے کار آنے کے لئے بے تاب تھیں۔ یہی جلا پائی ہوئی قوتیں تھیں، جنہوں نے چند ہی سال میں جنرل صاحب کو اعزازات کے لحاظ سے اس بلند درجے پر پہنچا دیا۔ جو ان کے عہد میں کسی ہمسر کو نصیب نہ ہوا، لیکن واضح رہے کہ زندگی کی آخری ساعت تک انہوں نے نہایت کٹھن ملکی اور قومی کاموں میں جس بے تکلفی سے حصّہ لیا، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ حالانکہ وہ کسی دنیوی نفع یا کسی مادی معاوضے کے خواہاں نہ تھے۔ ایسے ہی بلند حوصلہ اور جواں ہمت افراد قومی حکومتوں میں عوام کے لئے زندگی کے کامیاب ترین نمونے بنتے ہیں۔

چوتھا باب

انتظامِ املاک اور اہم کام

تربیت و صلاحیت کے کرشمے

املاک کا نظم و نسق ملک صاحب کے سپرد ہوا تو وہ عمدہ تعلیم پا چکے تھے اور مختلف انتظامی شعبوں کی تربیت انہیں مل چکی تھی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، تعلیم کے علاوہ وہ زراعت کی فنّی تربیت اور ویٹرنری کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر چکے تھے۔ جتنی اُس زمانے میں باقاعدہ ڈگری پائے ہوئے لوگوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ پھر وہ فطرتاً مستعد تھے۔ جفاکشی سے انہیں طبعی وابستگی تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ مسلسل پیدل چلنے کی عادت ڈال چکے تھے اور کشمیر نیز دوسرے

پہاڑوں کے سفر میں بلندیوں پر چڑھنے اور اترنے کی بھی مشق بہم پہنچا چکے تھے۔ انہوں نے جائداد کا کام سنبھالا تو ابتدائی توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ کھیتی باڑی کو ترقی دیں، پیداوار کے وسائل بڑھائیں، کارکنوں کی پوری نگرانی کریں اور کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو نظر انداز نہ ہونے دیں، یہ اس لئے ضروری تھا کہ جن امیروں نے اپنے املاک کی نگرانی پوری طرح نہ کی، ان کی امارتیں زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں۔ ملک صاحب کو تربیت دینے والوں کا مقصد و مدّعا یہی تھا کہ وہ مستعد اور جزرس منتظم بن جائیں۔ جو املاک انہیں وراثت میں ملے ہیں، انہیں زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکیں۔ خود ملک صاحب کے پیش نظر بھی غالباً یہ مقصد تھا کہ زراعت کی ترّقی کے ساتھ مویشی اور گھوڑے پالنے کا انتظام بھی اعلیٰ پیمانے پر کریں۔ اوّل اس لئے کہ خود انہیں اپنے املاک میں مویشی کی ضرورت تھی اور اپنے اجداد کے مسلک پر چلتے ہوئے وہ اتنے سوار مہیّا رکھنا چاہتے تھے کہ ضرورت کے وقت ہر اہم خدمت کا جلد سے جلد انتظام کر سکیں۔ نیز فطری صلاحیّت کی بنا پر وہ ایک مثالی زمیندار بنا چاہتے تھے، تاکہ تمام اربابِ املاک پر واضح ہو جائے کہ حسنِ انتظام سے وسائل میں کتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بیل، گائے، بھینس، بھیڑ بکریوں اور گھوڑوں کی اچھی نسل تیار کر کے خود صوبے کی دولت کتنی بڑھائی جا سکتی ہے۔ ان کاموں کیلئے انہوں نے ذاتی شوق سے تربیت حاصل کی۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جس کام کو بھی شروع کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق خود اتنی معلومات اور عملی تجربہ حاصل کر لیتے تھے۔

کہ انتظامی نگرانی کا حق ادا کر سکیں۔ ویسے بھی صحیح طریق کار یہی تھا۔ کہ کسی کام میں اسوقت تک ہاتھ نہ ڈالا جاتا، جب تک اس کے مالہٗ وما علیہ سے پوری واقفیت نہ ہوتی۔

کورٹ آف وارڈز کے خوشگوار نتائج

ملک صاحب کے والد کا انتقال ہوا تو املاک کا پورا انتظام کورٹ آف وارڈز کے حوالے ہو گیا تھا۔ ان کے والد نے خاصہ روپیہ جمع کر لیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ کورٹ آف وارڈز کیطرف سے ذوالفقار علی جج تمام چیزیں سنبھالنے کے لئے مامور ہوئے تھے، انہوں نے روپیہ تول کر حساب کیا۔ اس زمانے میں نوٹ نہیں تھے، چاندی کے چہرہ شاہی سکے ہوتے تھے اور ان کا گننا دشوار تھا۔ اس وقت عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ روپیہ واپس نہیں ملے گا لیکن کورٹ آف وارڈز کے زمانے میں یہ روپیہ بھی جمع رہا اور املاک کی آمدنی سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ خاندان کے مختلف افراد کیلئے رقمیں مقرر ہو گئی تھیں، انہیں ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا تھا، وہ حساب میں جمع ہوتا جاتا تھا۔ حکومت نے یہ روپیہ جمع رکھنے کے بجائے مختلف مقروض خاندانوں کے قرضے میں دے دیا۔

جب کورٹ آف وارڈز ختم ہوا تو پورا جمع شدہ روپیہ ملک صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ فائدہ یہ ہوا کہ متعدد مقروض خاندانوں کے قرضے آہستہ آہستہ اتر گئے اور اس روپے سے مختلف جائیدادیں ملک صاحب کے لئے خریدی گئیں وہ خود فرماتے ہیں:۔

اس روپے سے ٹوانوں کے جو چھوٹے بڑے خاندان مقروض تھے، ان کا قرضہ اتارا گیا۔ اسی طرح دوسرے

معزز خاندانوں کے قرضے بھی ادا ہوئے، جو بڑی جائیدادوں کے مالک تھے، جیسے ساہی وال، جہان شاہ وغیرہ کے خاندان .... علاوہ بریں عمرپور صاحب نگر وغیرہ میں بہت جائداد خریدی گئی اور کالرا کا مالک ضلع شیخوپورہ اور لائل پور میں سب سے بڑا زمیندار بن گیا۔ سرگودھا کی جائداد اس کے علاوہ تھی۔

شروع میں دیوان کرپارام جائیداد کے منتظم مقرر ہوئے تھے جنکا تعلق بھیرے تھا (مشہور کانگرسی لیڈر دیوان چمن لال اور دیوان رام لال (جو لاہور ہائیکورٹ کے جج بھی بن گئے تھے) اسی دیوان کرپارام کے بھتیجے دولت رائے کے فرزند تھے) پھر دیوان کرپارام کو الگ کر کے دیوان جواہر مل کو مقرر کیا گیا۔

ابتدائی سرگرمیاں

بہرحال جائیداد کا انتظام سنبھال لینے کے بعد ملک صاحب کی نہایت مفید سرگرمیوں کا آغاز ہوا جن کی مجمل کیفیت یہ ہے۔

۱۔ انتظام ایسی خوبی اور خوش اسلوبی سے کیا کہ املاک کا رقبہ بہت بڑھ گیا اور آمدنی تقریباً دگنی ہو گئی۔

۲۔ ضلع میں ایسے لوگ موجود تھے، جن کی سرگرمیاں امن و نظم کے منافی تھیں۔ ملک صاحب نے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر ایسی تمام سرگرمیاں ختم کرا دیں۔

۳۔ بڑے زمیندار ہونے کی حیثیت میں انہیں مجسٹریٹ کے اختیارات مل گئے۔ ابتدا میں تیسرے درجے کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے، جلد ہی اول درجے پر پہنچ گئے۔ یہ کام بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔

۴۔ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس پریزیڈنٹ بنے تو اس کی

آمدنی میں معتدبہ اضافہ کر دیا۔

۵۔ شاہ پور میں بھاری میلا ہوتا تھا۔ ملک صاحب نے اس کا انتظام خود سنبھالا اور اسے نہایت مفید ادارہ بنا دیا۔ سرکاری افسر بھی اُن کے حسنِ انتظام کی تعریفیں سالانہ روددادوں میں کرتے رہے۔

کھیلوں کی تنظیم

اُن کے علاقے میں مختلف مردانہ کھیل پہلے سے جاری تھے، لیکن ان میں کسی تنظیم و باقاعدگی کی روح کارفرما نہ تھی۔ ان کھیلوں میں سے بہ طور خاص قابلِ ذکر دو ہیں، اوّل گھوڑا دوڑا کر مینخ اکھاڑنا، دوم "پڑ کوڈی" (کبڈی) ملک صاحب جانتے تھے کہ ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی سے عوام میں ورزش اور سواری کا شوق پیدا ہو گا اور وہ فوج میں اعلیٰ خدمات انجام دینے کے اہل بن جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے خاصی بڑی رقمیں صرف کر کے ان کھیلوں کی باقاعدہ تنظیم کی۔ ٹیمیں بنائیں اور مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے والوں کے لئے گراں قدر انعامات مقرر کئے۔ مثلاً اچھی کبڈی کھیلنے والوں کو سونے کے کڑے انعام میں دیئے جاتے تھے، جو اس زمانے کے دیہاتی نقطہ نگاہ سے اتنا قیمتی انعام تھا کہ اس کے مقابلے میں ہزار دو ہزار روپے بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ اہلِ دیہات سونے کے کڑے پہن لیتے اور یہ انعام نوجوانوں میں کھیلوں کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ایک مستقل ذریعہ تبلیغ بن جاتا۔

پھر اپنے ہاں کی اعلیٰ ٹیمیں لے کر انہیں اپنے خرچ پر ملک صاحب مختلف چھاؤنیوں میں لے جاتے، تاکہ اس طرح

افسروں کو کھیلوں کی طرف توجہ ہو اور وہ ہر جگہ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اچھے ورزشی اور سوار فوج یا رسالے میں بے تامّل بھرتی کر لئے جاتے۔ خود راقم الحروف نے دیکھا کہ ملک صاحب کے املاک پر جا بجا جو کارکُن مقرّر تھے، ان میں زیادہ تر آدمی انہیں لوگوں میں سے لئے گئے تھے، جو ایک زمانے میں کھیلوں نے اندر نام پیدا کر چکے تھے۔

گھوڑے پالنے کا انتظام

ملک صاحب کو ویسے ہی گھوڑے پالنے کا شوق تھا اور خود ان کے پاس گھوڑوں کی خاصی تعداد رہتی تھی۔ اب انہوں نے ذاتی خرچ پر ایک سٹڈ قائم کیا، جس میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے مہیّا کئے گئے اور مالی بار برداشت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح مختلف ذی وسائل اصحاب کو گھوڑے پالنے کا شوق پیدا ہو اور یہ سلسلہ اس پیمانے پر پہنچا دیا جائے کہ رسالے کے لئے باہر سے گھوڑے خریدنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس زمانے میں موٹروں بکتر بند گاڑیوں یا دوسری چیزوں کا انتظام نہیں ہوا تھا، جو آج موجود ہیں اور جن کی وجہ سے فوج کے لئے گھوڑوں کی وہ ضرورت باقی نہیں رہی، بلکہ فوج کا زیادہ تر انحصار رسالے ہی پر تھا۔

غرض ملک صاحب اپنے نصب العین میں کامیاب ہوئے اور ان کا سٹڈ پنجاب بھر میں بہترین مانا گیا، سب سے زیادہ انعامات تمغے اور سندیں حاصل کیں، جب لارڈ آرتھر سیسل[1] اور جنرل لاک ایلیٹ[2] کے زیرِ سرگردگی گھوڑے پالنے کے سلسلے میں

[1] Lord. Arthur Cecil
[2] Loch Elliot

ایک شاہی کمیشن (رائل ہارس بریڈنگ کمیشن) مقرر ہوا تو ملک صاحب سے اس لئے شہادت لی گئی کہ وہ گھوڑے پالنے میں درجہ مہارت حاصل کر چکے تھے۔ ان کا پالا ہوا ایک گھوڑا بہترین قرار دیا گیا اور اسی کو سب کے لئے نمونہ بنایا گیا۔

اسی طرح انہوں نے گائیں بیل بھینسیں بھیڑیں وغیرہ پالنے کا انتظام کیا۔ مویشی اور گھوڑوں کے سٹڈ آج بھی ملک صاحب کے فرزند ارجمند ملک خضر حیات خاں نے اعلیٰ پیمانے پر قائم کر رکھے ہیں اور وہ قسم قسم کی نسلیں دور دور سے منگوا کر اپنے ہاں رکھتے ہیں، جتنے انعامات ان کے گھوڑوں گائیوں اور بھینسوں نے حاصل کئے وہ شائد ہی کسی دوسرے کو ملے ہوں۔

نہری زمینوں کی آبادکاری اچھے پیمانے پر شروع ہوگئی تو حکومت نے بھی گھوڑے پالنے کی شرط پر لوگوں کو ایک ایک مربع زمین دی اور شاہ پور کے بڑے زمینداروں سے بھی کہا کہ وہ زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے لے کر گھوڑے پالنے کا انتظام کریں۔ اکثر نے یہ پیشکش قبول نہ کی، لیکن ملک عمر حیات خاں نے خود بھی یہ پیشکش منظور کر لی۔ اپنے عزیزوں، بلکہ کاشتکاروں کو بھی قبول پر راضی کر لیا۔ وہ خود اس زمانے میں صومالی لینڈ گئے ہوئے تھے، جو زمین ان کے لئے تجویز ہوئی، وہ اچھی نہ تھی، تاہم انہوں نے کوئی شکایت نہ کی اور اصل کام اعلیٰ پیمانے پر جاری رکھا۔

۵۱۔ شتر سوار دستہ ملک صاحب نے ایک شتر سوار دستہ ترتیب دیا، جس کے لئے ضلع بھر میں

پھر پھر کر لوگوں کو آمادہ کیا ۔ اور فوجی خدمت کے فوائد و منافع ان کے ذہن نشین کئے ۔ اس طرح جلد سے جلد یہ دستہ منظم ہو گیا ۔ کچھ ہی مدت بعد صومالی لینڈ میں اس کی خدمات ضروری ہو گئیں اور خود ملک صاحب شتر سوار دستے کے نائب کمانڈار کی حیثیت میں صومالی لینڈ پہنچے ۔

رفاہی کام

سوءِ اتفاق سے شادی بیاہ کے متعلق مقدمات زیادہ ہو گئے تھے اور قدم قدم پر نکاح کے ثبوت مہیا کرنے میں دقتیں پیش آتی تھیں ۔ ملک صاحب نے ضلع کے مسلمانوں میں نکاح رجسٹر کرانے کا نظام جاری کیا ، جس سے بڑا فائدہ پہنچا ۔ اوّل تو مقدمات کی تعداد کم ہو گئی ۔ دوم جو مقدمات عدالتوں میں جاتے ، ان کے متعلق نکاح کا ثبوت پیش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی ۔ پھر یہ نظام دوسرے اضلاع میں بھی جاری ہو گیا اور آج کل قصبات دیہات میں عام ہے ۔

۱۹۰۹ء میں پنجاب کے اندر ایک عظیم الشان نمائش کا انتظام کیا گیا تھا ، جس کی سرپرستی وقت کے لفٹنٹ گورنر لوئی ڈین نے منظور کی اور ۱۱ ستمبر ۱۹۰۹ء کو مہاراجہ جموں و کشمیر ، نیز روساء پنجاب کی ہمراہی میں اس کا افتتاح ہوا ۔ ملک صاحب نے اس نمائش کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا ۔ وہ اس کی انتظامیہ کمیٹی میں بھی شریک رہے اور بعض منتخب کمیٹیوں میں بھی انہوں نے برابر حصہ لیا ۔

گذشتہ صدی کے آخری عشرے اور موجودہ صدی کے پہلے عشرے میں پنجاب کے لئے وبائی طاعون بڑی مصیبت کا باعث بنا رہا ۔ اس کے انسداد کے لئے جو طریقے ڈاکٹر ضروری سمجھتے تھے ۔ عوام

ناواقفی کے باعث ان سے فائدہ اٹھانے کیلئے تیار نہ تھے۔
ملک صاحب کو اہلِ دیہات کے مزاج اور خیالات سے پوری آگاہی تھی۔انہوں نے انسدادِ وبا کیلئے ایسی تجویزیں پیش کیں، جنہیں اہل دیہات نے بے تامل قبول کر لیا اور وہ اصل مقصد کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملک صاحب نے اپنے علاقے میں مویشی کے "داغ" کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ اس اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوا کہ ان کے ارد گرد صحرائی اور کم آباد سا علاقہ تھا۔ اور وہاں کے لوگ جانوروں کی چوری کے عادی تھے۔ "داغ" کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوری کیا ہوا جانور فوراً پہچانا جاتا اور اس کی بازیافت میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ اس طرح جانوروں کی چوری بڑی حد تک ختم ہو گئی۔

مختلف تنظیمیں اور ادارے

ملک صاحب بیشتر مشہور تعلیمی انجمنوں اور اداروں کے صدر، نائب صدر یا ممبر رہے اور صرف اس وقت ان سے دستکش ہوئے، جب انہیں جنگی خدمات کے سلسلے میں یورپ جانا پڑا۔ مثلاً انجمن حمایت اسلام پنجاب کا سب سے بڑا اسلامی تعلیمی ادارہ تھا۔ وہ ابتدا ہی سے اس کے ساتھ شامل رہے۔ انجمن نے لفٹننٹ گورنر سر لوئی ڈین کے پاس ایک وفد بھیجنے کا انتظام کیا تو اس وفد کو موصوف کے پاس پیش کرنے کیلئے ملک صاحب ہی منتخب ہوئے۔ ایچیسن چیفس کالج میں انہوں نے خود تعلیم پائی تھی۔ اس کی انتظامیہ کمیٹی میں برابر شامل رہے۔ جب پرانے طلبہ نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نام سے مستقل انجمن قائم کی تو اس میں بھی شامل ہو گئے

اور اس سلسلے میں مختلف اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ مثلاً مذہبی تعلیم کیونکر دی جاتے۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی (مجلسِ مذاکرہ)، فوجی قواعد، نشانہ بازی وغیرہ کا انتظام کرایا۔ کالج کی عمارتوں اور جمنیزیم نیز دوسری چیزوں کے لئے گراں قدر عطیات دیئے۔ اسی طرح وہ انجمن اسلامیہ لاہور اور انجمن نعمانیہ لاہور سے برابر وابستہ رہے۔

آل انڈیا مسلم وفد اور اسلامی حقوق

انگریزی حکومت کے ماتحت نمائندہ اداروں کا انتظام ۱۸۹۳ء میں ہو چکا تھا۔ اگرچہ انتخابات کا دائرہ بہت محدود تھا، لیکن معیار رائے ہی ایسا رکھا گیا تھا، جس میں کسی مسلمان کے لئے منتخب ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ متعدد تجربوں کے بعد مسلمان رہنما اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمانوں کے حقوق نمائندگی الگ نہ کرائے جائیں اور ان کے لئے جداگانہ انتخاب کا انتظام نہ ہو گا۔ مسلمان نمائندہ اداروں میں آ ہی نہیں سکتے۔ غور و فکر کے بعد یہ تجویز ہوا کہ ایک نمائندہ وفد وائسرائے کے پاس جائے اور تمام حقائق واشگاف انداز میں پیش کر دے۔

اس زمانے میں بنگال تقسیم ہو چکا تھا اور بنگالی ہندوؤں نے اس کے خلاف وسیع ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ تقسیم صرف انتظامی سہولتوں کی بنا پر عمل میں آئی تھی اور اس میں کسی خاص قوم یا جماعت کا مفاد خصوصیت سے پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کی مسلم اکثریت کے لئے کارکردگی کے بہتر مواقع مہیا ہوتے تھے۔

اگرچہ کانگرس ملک کی مشترکہ نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی مگر وہ تقسیم بنگال کی مخالفت میں ہندوؤں کی ہمنوا بن گئی - یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لئے خاصی تشویش افزا تھی -

جو وفد وائسرائے (لارڈ منٹو) سے ملاقات کیلئے تجویز ہوا اس میں ہندوستان بھر کے ستر مسلم اکابر شریک تھے - سر آغا خاں مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم اس وفد کے ممتاز ترین اصحاب تھے۔ پنجاب کے اکابرین سے ملک عمر حیات خاں کو بھی شامل کیا گیا - اگرچہ وہ اس وقت بالکل نوجوان تھے، مگر قومی اور ملکی کاموں سے ان کی دلچسپیاں اس پیمانے پر پہنچی ہوئی تھیں کہ وہ ممتاز اصحاب میں شمار کئے جاتے تھے - یہ وفد اکتوبر ۱۹۰۶ء میں بمقام شملہ وائسرائے سے ملا - مسلمانوں کی پوری کیفیت بے کم و کاست صاف صاف پیش کر دی اور وہاں سے ایسا جواب لایا، جس میں مطالبات تسلیم کرنے کا قطعی وعدہ تو نہ تھا مگر امید پیدا ہو گئی تھی کہ مسلمانوں نے سرگرمی سے جدوجہد جاری رکھی تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے -

یہی وفد تھا، جس سے جداگانہ انتخاب اور جداگانہ مسلم نمائندگی کی بنیاد پڑی، یعنی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت تسلیم کر لی گئی - آئندہ اسلامی سیاسیات میں جو مراحل پیش آئے، ان سب کی بنیاد یہی اکتوبر ۱۹۰۶ء کا مطالبہ علیحدگی تھا -

خدمتِ عوام

ملک صاحب نے املاک کا نظم و نسق سنبھالتے ہی جن امور پر سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر توجہ فرمائی وہ اپنے حلقے کے افراد کی ضروری خدمات تھیں - مثلاً -

۱ - اپنے حلقے کی آبادی کے بچوں کے لئے ایک سکول قائم کر دیا، جس کا پورا خرچ خود برداشت کر لیا - بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور تعلیم سرکاری درسگاہوں کے درجے اور نصاب کے مطابق دی جاتی تھی -

۲ - ایک شفا خانہ قائم کر دیا گیا جس میں تمام مریضوں کو مفت دوائیں دی جاتیں، اس کا بھی پورا خرچ اپنے ذمّے لے لیا -

۳ - ایک ویٹرنری ہسپتال اپنے خرچ پر قائم کیا، جس میں علاقے کے تمام کاشتکاروں کے جانوروں کا علاج مفت ہوتا -

۴ ایک مذہبی مدرسہ قائم کر دیا، جس کے کام کاج کی تفصیل غیر ضروری ہے -

واضح رہے کہ یہ تمام ادارے ایسے تھے، جن سے صرف علاقے کے آدمی نہیں، بلکہ آس پاس کے لوگ بھی پورا فائدہ اٹھاتے تھے - اور کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی زمیندار نے اپنے ہاں اس قسم کے ادارے قائم کئے ہوں -

سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر امر یہ ہے - کہ اپنے علاقے کی تمام بیواؤں اور یتیموں کے لئے مستقل طور پر اتنے غلے کا انتظام کر دیا جو ان کے گذارے کے لئے کافی ہوتا - یہ تمام رفاہی سلسلے اب تک بدستور قائم ہیں، اپنے علاقوں کی تمام مسجدوں اور مندروں کی تعمیر و مرمت اور دیکھ بھال کے پورے مصارف بھی اپنے ذمّے لے لئے -

یہ ان کاموں کی سرسری کیفیت تھی، جو ملک صاحب نے خدمت عامہ کے میدان میں قدم رکھتے ہی انجام دیئے -

زمینداروں کا طبقہ خاصہ پسماندہ تھا - اور ان میں اس قسم کے

ولولے پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ ملک عمرحیات خاں جب خدمت کے میدان میں آئے تو وہ چنداں معروف آدمی نہ تھے۔ شاہ پور کے بڑے بڑے سن رسیدہ اور نامور زمینداروں میں ان کی حیثیت معمولی تھی تاہم اپنی ہمہ گیر سرگرمیوں کی بدولت وہ بہت جلد صفِ اول میں پہنچ گئے۔ یہ سب کچھ ان کی خدا داد صلاحیتوں اور ذاتی جدوجہد کے کرشمے تھے۔ خدا نے انہیں دولت و ثروت سے نوازا تھا، مگر انہوں نے خدا کی اس نعمت کو حتی الامکان نیک اور مفید عوامی کاموں میں صرف کیا۔ عام امراء کی طرح ذاتی نمود و نمائش یا راحت و آسائش سے انہیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ اور ان کی ترقی و عظمت کا ایک خاص راز یہ امر بھی تھا۔

پانچواں باب

چترال تیراہ اور جنوبی افریقہ

جنگی خدمات کا آغاز جنرل عمر حیات خاں نے اپنی جائیداد و املاک کا انتظام سنبھالا تو انتظامی، رفاہی اور اصلاحی دائروں میں ممتاز و نمایاں خدمات کے باعث اپنے علاقے میں خاصے نامور اور ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ لیکن یہ ان کی خاندانی میراث کا صرف ایک شعبہ تھا، زمینوں کی آباد کاری اور متوسلوں کے لئے امن، آسائش اور خوشحالی کی زندگی کے انتظامات بھی ان کے آباؤ اجداد کی توجہات کا خاص مرکز بنے رہے تھے تاہم ان کی عظمت و برتری کا ایک دائرہ یہ رہا کہ جنگی خدمات میں درجۂ امتیاز حاصل کریں۔ ٹوانے جب سے پنجاب میں پہنچے تھے جنگی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے ملک عمر حیات خاں اپنی اس خاندانی میراث کو بھی گراں بہا

تر بنانے کیلئے حد درجہ بیتاب تھے اور قدرت نے انہیں ان خدمات کے لئے بھی خاص صلاحیتیں عطا کی تھیں۔

اس اثنا میں پے در پے جنگی خدمات کے موقعے پیش آئے۔ مثلاً ۱۸۹۵ء میں حکومت نے دو فوجیں چترال بھیجیں۔ جنوبی افریقہ میں بوئروں سے جنگ چھڑ گئی۔ ۱۸۹۷ء میں تیراہ کی مہم پیش آگئی۔ جنرل صاحب نے ان موقعوں پر بے تامل اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کر دیں، لیکن یہ خدمات اس بنا پر قبول نہ کی گئیں کہ اس وقت تک صاحب موصوف کو فوج میں کمیشن نہ ملا تھا اور سابقہ حکومتوں کے برعکس انگریزی حکومت کا مقررہ قاعدہ یہی تھا کہ صرف ان اصحاب سے جنگی موقعوں پر کام لیا جائے، جو پہلے سے کمیشن حاصل کر چکے ہوں۔

قابلِ غور نکتہ

واضح رہے کہ جنرل صاحب کی پیشکشوں کا مقصد کوئی مالی نفع نہ تھا اور نہ وہ کسی خاص فوجی عہدے کے طلبگار تھے وہ اپنے والد مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور ان کے پاس اتنی بڑی ذاتی جائداد تھی، جو وقت کے بلند پایہ امیروں کے لئے باعثِ رشک سمجھی جا سکتی تھی۔ ان کی کم سنی اور طفلی میں سرکاری انتظام کے ماتحت بہت بڑی رقم جمع ہو چکی تھی۔ ایسے فرد کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ راحت و آسائش کی زندگی چھوڑ کر میدان جنگ کی ناگزیر مشقتوں، پریشانیوں اور جانبازیوں کے لئے تیار ہو جاتا اور اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے خواہ مخواہ کا درد سر مول لیتا۔

پھر ان کی والدۂ ماجدہ موجود تھیں اور جنرل صاحب ان کی زندگی کا تنہا دنیوی سہارا تھے۔ والد ماجد فوت ہوئے تھے تو جنرل صاحب کی عمر چار پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔ والدہ اسی امید پر زندہ تھیں کہ یہ بڑے ہوں گے، اپنی جائداد سنبھالیں گے اور ان کے لئے ڈھارس کا سامان بنیں گے، لیکن جنرل صاحب اپنے خاندان کی جنگی روایات کو بھی چار چاند لگا دینے کے خواہاں تھے۔ لہٰذا نہ انہیں خدمات پیش کرنے میں تامّل ہوا اور نہ والدہ نے اپنے لختِ جگر کو باپ دادا کے مسلک سے روکنا مناسب سمجھا۔

اِنسانوں کی قسمیں

کارکردگی کے اعتبار سے انسانوں کی قِسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض آباؤ اجداد کی پیدا کردہ جائداد اور شہرت و عزت کی بنا پر زندگی آرام و اطمینان سے گزار لینے پر قناعت کئے رہتے ہیں۔ بعض عالی حوصلہ اور جوانمرد موروثی عزت و عظمت پر مطمئن نہیں رہتے، بلکہ محنت و جانفشانی اور زورِ بازو سے اپنے لئے نئے راستے پیدا کرتے ہیں۔ ملک عمر حیات خاں آخری قِسم کے آدمیوں میں سے تھے۔ ان کی بلند ہمتی ماضی کی میراث پر راضی نہ رہ سکی اور یہی فیصلہ کیا کہ ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں، جنہوں نے پیہم جانفشانیوں سے خاندانی عزت کا پرچم سربلند رکھا۔ یہی ہمت و عزیمت ان کے لئے مشعلِ راہ بنی۔ جنرل صاحب کے زمانے میں وہ موقع اور ماحول ختم ہو چکا تھا، جو اُن کے بزرگوں کو چھ سات صدیوں تک میسر رہا، تاہم یہ تغیر ان کے

حوصلوں اور ولولوں کو افسردہ نہ کر سکا اور بہت جلد ان کی جنگی خدمات ملک بھر میں بے مثال بن گئیں - گزشتہ پچاس ساٹھ سال کی مدت میں فکر و نظر کے زاویے تیزی سے بدلتے گئے، پھر بھی یہ اندازہ کر لینے میں قطعاً کوئی دقت پیش نہیں آسکتی کہ خدا نے جنرل صاحب کو جو دل و دماغ عطا کیا تھا، وہ کسی بھی حکومت میں عزت و عروج کی انتہائی منزل پر پہنچے بغیر نہ رکتا، لیپل گرفن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ فوجی سرگرمیوں کا دائرہ مذاق و طبیعت اور خاندانی روایات کے لحاظ سے جنرل صاحب کے لئے بہ طور خاص پسندیدہ و خوشگوار تھا -

چترال کی مہم

چترال کے حکمران خاندان میں مدت سے کشمکشیں جاری تھیں، جن میں بہت سے حکمران موت کے گھاٹ اتر چکے تھے - اس ملک کا ایک بہت بڑا حکمران مہتر امان الملک تھا، جس نے ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی انگریزی حکومت سے معاہدہ کر لیا تھا - اس کے مطابق اقرار کیا تھا کہ میں اپنے ملک میں سے کسی دشمن کو گذرنے نہ دوں گا اور سرکار انگریزی کا خیر خواہ رہوں گا - انگریزی حکومت نے اس کے بدلے میں ہر خطرے کے موقع پر مہتر موصوف کی حفاظت کا عہد کیا -

مہتر کی وفات پر چترال میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی - اس کے فرزندوں میں سے نظام الملک مسند نشین ہوا اسے دوسرے فرزند نے قتل کر دیا اور خود مہتر بن گیا - ساتھ ہی ایک طرف سے جندول کے رئیس عمرا خان نے چترال پر

چڑھائی کر دی، دوسری طرف سے خاندان کا ایک اور فرد کابل سے آکر مرکز پر حملہ آور ہو گیا اور افراتفری پھیل گئی - حکومت ہند اپنے اہم سرحدی علاقے میں اس قسم کی بدامنی گوارا نہ کر سکتی تھی - چترال میں جو تھوڑی سی انگریزی فوج موجود تھی، وہ قلعہ میں محصور ہو چکی تھی - اسے محاصرے سے نجات دلانے اور ایک قابلِ اعتماد شخص کو چترال کی مسند پر بٹھانے کے لئے دو انگریزی فوجیں چترال بھیجی گئیں، وہ چترال کے مقتول مہتر نظام الملک کے چھوٹے بھائی شجاع الملک کو چترال کی مسند پہ بٹھا کر واپس آئیں اور مہم کامیابی کی منزل پر پہنچ گئی، چترال کا محاصرہ ۴ مارچ ۱۸۹۵ء سے ۲۰ اپریل ۱۸۹۵ء تک جاری رہا۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، جنرل عمر حیات خاں کی ذاتی خدمات قبول نہ کی گئیں، اس لئے کہ انہیں اس وقت تک کمیشن نہ ملا تھا، تاہم۔ انہوں نے ۱۸ ٹوانہ لانسرز میں رنگروٹ بھی بھرتی کرائے، گھوڑے بھی دیئے اور بار برداری کے جانور بھی بیشتر تعداد میں مہیا کئے۔

جنگ تیراہ

تیراہ کا علاقہ پشاور کے قریب سرحد پر واقع ہے اور اس کی حد درہ خیبر سے ملی ہوئی ہے۔ تیراہ کی قومیں بہت پہلے سے حکومت ہند کی مواجب خور تھیں، ان سے صرف ایک اقرار لیا گیا تھا اور وہ یہ کہ درے کی حفاظت کرتی رہیں، تاکہ قافلوں اور مسافروں کی آمد و رفت میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ حکومت نے ان قوموں میں سے ایک خاص رجمنٹ بھرتی کر کے اُڈ۔ے

کی مختلف چوکیوں پر بٹھا دی تھی - اس رجمنٹ کے آدمی باقاعدہ تنخواہ پاتے تھے - ۱۸۹۷ء میں تیراہ کی قومیں اچانک خیبر کی چوکیوں پر قابض ہوگئیں اور درے میں سے آمدورفت ان کے رحم و کرم پر رہ گئی - یوں حکومت کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ ان قوموں کے خلاف تادیبی کاروائی کرے - اس غرض سے خاص انتظامات ضروری تھے - اس لئے کہ اندازہ تھا کہ یہ قومیں مجموعی طور پر چالیس، پچاس ہزار آدمی میدان جنگ میں لاسکتی ہیں - چنانچہ سر ولیم لوک ہارٹ کی سالاری میں دو فوجیں تیار کی گئیں - اکتوبر ۱۸۹۷ء سے مہم کا آغاز ہوا - مارچ ۱۸۹۸ء میں قوموں نے صلح کی گفت و شنید شروع کر دی - ادائے جرمانہ اور حوالگیِ اسلحہ کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ گئیں اور علاقے میں امن قائم ہو گیا -

اس مہم میں بھی جنرل عمر حیات خاں نے اپنی خدمات پیش کیں، لیکن ان کی سرگرمیوں کا دائرہ صرف گھوڑے، باربرداری کے جانور اور رنگروٹ مہیا کرنے تک محدود رہا -

جنوبی افریقہ کی لڑائی

جنوبی افریقہ کی لڑائی ۱۸۹۹ء میں شروع ہوئی اور تقریباً تین سال جاری رہی - اس کے آغاز میں بھی جنرل عمر حیات خاں نے اپنے اصطبل کے تمام گھوڑے جنگی مدد کے طور پر پیش کر دیئے تھے، ان کی تعداد تقریباً ۴ سو تھی - اس پیش کش پہ حکومت نے انتہائی خوشنودی کا اظہار کیا - چونکہ اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہ پڑی - اس لئے معاملہ جنرل صاحب کے شکریئے پر ختم ہو گیا -

اعزازی کمیشن ۱۸ ٹوانہ لانسرز کے لئے رنگروٹ اور گھوڑے مہیا کرنے کی بنا پر ذمہ دار فوجی افسروں نے جنرل عمر حیات خاں کے لئے اعزازی کمیشن کی سفارش کی، حکومت پنجاب نے بھی اس سفارش کی پوری تائید کی۔ چنانچہ صاحب موصوف ۱۹۰۱ء میں اعزازی لفٹننٹ بنا دیے گئے۔ ۱۸ لانسرز ان کے والد ماجد کی فوج تھی۔ اسی سے انہیں وابستہ کر دیا گیا۔ بعد ازاں اس فوج کا نام ۱۹ کنگ جارج لانسرز رکھا گیا۔[۱]

---

[۱] King George's Own Lancers



ملکه وکٹوریہ کی جوبلی میں شرکت کے موقعہ پر لندن میں



۱۸ ٹوانہ لانسرز کے لفٹیننٹ کی وردی میں

چھٹا باب

صومالی لینڈ کی جنگ

(۱)

صومالی لینڈ

صومالی لینڈ مشرقی افریقہ کا ایک وسیع خِطّہ ہے، جس کا رقبہ تقریباً پونے چار لاکھ مربع میل ہوگا - علاقہ زیادہ تر پہاڑی تھا بارش کم ہوتی تھی- لوگ عموماً خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے - اونٹ، گھوڑے، مویشی اور بھیڑ بکریاں پالتے تھے - بڑے جنگ جُو مانے جاتے تھے - خصوصاً تیر اندازی اور نیزہ بازی میں انہیں کمال حاصل تھا - یہ وسیع علاقہ چار حصّوں میں بٹ گیا تھا- ایک

حِصّہ برطانیہ کے پاس رہا - دوسرا فرانس کے پاس، تیسرا اٹلی اور چوتھا ابی سینیا کے پاس - بربرہ برطانوی صومالی لینڈ کی مشہور بندرگاہ عدن کے بالمقابل واقع ہے اور یہی مرکز حکومت تھی -

جس زمانے میں ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی، اُس زمانے میں انگریزوں کا تعلق صومالی لینڈ سے پیدا ہوا- چونکہ یہ ملک ہندوستان کے بحری راستے پر واقع تھا، اسلئے کمپنی چاہتی تھی کہ اس کی بندرگاہوں سے فائدہ اٹھائے- ملک میں مختلف قبیلوں کے سرداروں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر رکھی تھیں - ۱۸۴۰ء میں کمپنی نے سرداروں سے معاہدے کر کے مناسب رعائتوں کا انتظام کر لیا - کمپنی یا اس کے کارندوں کو اندرونِ ملک سے نہ کوئی دلچسپی ہو سکتی تھی اور نہ ان سے کوئی سروکار رکھتا - ساحلی علاقوں پر کمپنی کا اثر خاصا وسیع ہو گیا- جن قبیلوں کو تجارت سے دلچسپی تھی یا وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، ان کے تعلقات انگریزوں سے بہت مستحکم ہو گئے -

آغازِ جنگ جنگ کا آغاز معمولی سے واقعہ پر ہوا، ایک سرکاری بندوق چوری ہو گئی بربرہ کے نائب کونسل نے سمجھا کہ بندوق قبائیلوں کے پاس پہنچ گئی ہے، اس کی حوالگی کا مطالبہ کیا گیا جواب ملا کہ ہم میں سے کسی نے نہیں چرائی جس نے چرائی ہے اس سے پوچھا جائے، بس اسی سے کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی - ادھر حکومت نے باز پرس شروع کر دی، ادھر قبائلی جمعیت کی فراہمی میں مصروف ہو گئے - اگست ۱۸۹۹ء تک ان کے پانچ ہزار جنگ جُو جمع ہو چکے تھے - یہ

لوگ اُن قافلوں پر حملہ کرنے لگے، جو انگریزی حکومت سے خاص ربط ضبط رکھتے تھے۔

یہ حالت دیکھ کر انگریزی حکومت نے لفٹنٹ کرنل سوینؔ کی سرکردگی میں ایک فوج قبائلیوں کی تادیب کیلئے مقرر کردی، سوین صاحب نے دو سال میں قبائلیوں کے خلاف دو مہموں کا انتظام کیا۔ وہ لوگ سید محمد احمد مہدئ سوڈان کی طرح اپنے آپ کو درویش کہتے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار بھی بہت معمولی تھے، اس لئے انگریزی فوج کے منظم دستوں کا مقابلہ نہ کرسکے اور جگہ جگہ شکستیں کھا کر پیچھے ہٹتے رہے تاہم یہ کامیابیاں حکومت انگلینڈ کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں، اس لئے کہ نہ قبائلیوں نے مقابلہ چھوڑا اور نہ وہ مقصد پورا ہوا، جس کے لئے رزم و پیکار کا سلسلہ جاری کیا گیا تھا۔

ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ اندرون ملک میں فوج بھیجنے سے پہلے کھانے پینے کی چیزوں کا سلسلہ اعلیٰ پیمانے پر قائم رکھنا ضروری و لازم تھا، اس لئے کہ پانی کمیاب تھا، رسد ناپید اور راستے سخت دشوار گذار۔ ہر جگہ اونٹوں پر غلہ، پانی اور سامانِ جنگ پہنچانا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فوج کو کہیں بھی زیادہ دیر تک ٹھہرایا نہ جا سکتا تھا قبائلیوں کو یہ سہولت تھی کہ کہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتے تو بے آباد سے علاقے میں جدھر راستہ پاتے، نکل جاتے۔

Swayne - ۱ؔ

انگریزی علاقے میں قیام ناممکن ہو جاتا تو حبشہ یا اٹلی کے علاقے میں پہنچ جاتے۔ وہ صحرائی زندگی کے عادی تھے اور انہیں کہیں بھی کوئی خاص دقت پیش نہ آتی تھی۔ علاقوں کی ایسی حد بندی کہیں بھی نہ تھی کہ کسی جگہ روک ٹوک کا اندیشہ ہوتا۔

علاوہ بریں وہ جہاں بھی لڑتے، انتہائی فداکاری سے لڑتے۔ کرنل سوین نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے

غرض پہلی دو مہموں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ان میں سب سے بڑی لڑائی ایریگو[1] کے مقام پر ۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ہوئی، جو اطالوی صومالی لینڈ میں اس نقطے کے قریب واقع ہے، جہاں برطانوی، اطالوی اور ابی سینیا کی حدیں ملتی ہیں۔ اس میں قبائلیوں کا خاصا نقصان ہوا، لیکن درویشوں نے مقابلہ نہ چھوڑا اور حکومت انگلشیہ نے جنگی قوت سے جو مقصد پورا کرنا چاہا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔

تیسری مہم تیسری مہم کے لئے زیادہ وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا اور فوج کی کمان بریگیڈیئر جنرل مننگ[2] کے سپرد ہوئی، نیز اٹلی اور ابی سینیا کی حکومتوں سے گفت و شنید کر کے انہیں کامل تعاون پر آمادہ کر لیا گیا۔ اٹلی نے اپنے علاقے میں فوجی کاروائیوں کی کھلی اجازت دے دی۔ ابی سینیا کے بادشاہ نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر فوج بھیجنے کا وعدہ کر لیا اور پانچ ہزار منتخب آدمیوں کا لشکر بھیج دیا جن کے ساتھ دو انگریز افسر مشیر دل کی

[1] Eerigo [2] Manning

حیثیت میں شریک تھے ۔

اٹلی اور ایبی سینیا کے تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول قبائلیوں کے لئے ایبی سینیا کے علاقے میں داخلہ مشکل ہو گیا دوسرے اطالوی صومالی لینڈ کی بندرگاہ اوبیا[1] میں انگریزی فوج اتار دینے کے باعث قبائلیوں کے لئے جنوبی سمت میں بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہی - یہ مہم جولائی ۱۹۰۳ء تک جاری رہی بلاشبہ اس میں قبائلیوں کو سخت نقصان پہنچا، لیکن انگریزوں کو بھی سخت پریشانیوں سے سابقہ پڑا - ملا محمد نے اپنے مجاہدوں کو تاکیدی حکم دے دیا تھا کہ وہ فوج کے انگریز افسروں کو تاک تاک کر گولیوں کا نشانہ بنائیں، چنانچہ صرف ایک لڑائی میں نو بڑے بڑے انگریز افسر موت کے گھاٹ اتر گئے - بہر حال جس غرض سے یہ فوجی اقدام کیا گیا تھا، وہ تیسری مہم میں بھی پوری نہ ہوئی -

---

[1] Obbia

ساتواں باب

صومالی لینڈ کی جنگ

(۲)

چوتھی مہم

تین مہمیں اصل مقصد پورا نہ کر سکیں تو مزید فوجی تیاری کے بعد نئی مہم کا انتظام کیا گیا اور جنرل ایجرٹن ؎ کو اس کا سپہ سالار بنایا گیا۔ وہ جولائی ۱۹۰۳ء میں بربرہ پہنچا اور فوراً جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

سرسری کیفیت

اُس وقت اہلِ قبائل کی بڑی فوج وادیٔ نوگل کے مشرقی حصّے میں مقیم تھی، جو برطانوی صومالی لینڈ کے قلب سے شروع ہوتی ہے اور مشرق مائل بہ جنوب اطالوی صومالی لینڈ میں چلی جاتی ہے۔ ان کے متفرق دستے ملک کے مختلف حصّوں میں

؎ General Sir Charles Egerton

پھیلے ہوئے تھے ۔ جنرل ایجرٹن نے جو جنگی سکیم بنائی اس کی سرسری کیفیت یہ ہے۔

۱۔ ایک فوج وادی نوگل میں بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اسے حکم دے دیا کہ وہاں پہنچ کر مورچہ بندی کرے اور اہل قبائل کے لئے مغربی سمت میں نکل جانے کا کوئی موقعہ باقی نہ چھوڑے۔

۲ ۔ دوسری فوج کو بہوتلے جانے کا حکم دیا ۔ جو برطانوی صومالی لینڈ کے جنوب مغرب میں ایبی سینیا کی سرحد سے قریب واقع ہے ۔ اس پیش بندی کی غرض یہ تھی کہ قبائلی لوگ جنوب مغرب کا رخ نہ کر سکیں۔

۳ ۔ بہوتلے والی فوج کے سالار کو حکم دے دیا کہ اپنے اصل مقام پر پہنچ کر حفاظتی مورچے بنا لے ۔ پھر ایک دستے کو اطالوی صومالی لینڈ میں جلادی کے مقام پر بٹھا دے جو بہوتلے کے عین جنوب میں واقع ہے، اس طرح قبائلیوں کے لئے جنوبی راستہ بھی بند ہو جاتا تھا۔

۴ ۔ جنرل ایجرٹن نے اس تذبذب کو ختم کرنے کے لئے اعلان کر دیا کہ انگریزی حکومت خود پورے ملک کا انتظام کرے گی اور جو قبیلے انگریزوں کا ساتھ دیں گے انہیں یقیناً فائدہ پہنچے گا۔

ملک عمر حیات خاں کی شرکت

یہی مہم ہے، جس کے لئے ملک عمر حیات خاں نے اپنی خدمات پیش کیں ۔ انہیں فوجی کمیشن مل چکا تھا اور وہ ۵۳ ویں شتری دستے کی بھرتی میں شاندار

خدمات انجام دے چکے تھے، لہذا ان کی پیشکش منظور کرلی گئی اور ۱۸۹۵ شتری دستے کے معاون کی کمانڈ حیثیت میں وہ صومالی لینڈ روانہ ہو گئے۔

یہاں پھر ایک مرتبہ یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ ان کی یہ پیشکش کسی مالی نفع کے لئے نہ تھی بلکہ انہوں نے مالی نقصان اٹھایا۔ اپنی جائیداد کا انتظام دوسروں کے حوالے کیا۔ راحت و آسائش کی زندگی چھوڑی۔ عزیزوں سے مفارقت گوارا کی۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر انکی والدہ ماجدہ تھیں جن کی زندگی کا دنیوی سہارا تنہا ملک صاحب تھے۔ اس پیشکش کا مقصد یہ تھا کہ ملک صاحب طبعی شجاعت و جوانمردی کے جوہر دکھا کر آباؤ اجداد کا نام روشن کریں جو صدیوں اپنے اعزاز کی داستانیں جنگی میدانوں میں نوکِ شمشیر سے لکھتے رہے۔

جنگ کی داستان

اب سب سے پہلے جنگ کی داستان اختصاراً سن لیجئے۔ اس کے بعد ہم ملک صاحب کی خدمات تفصیلاً پیش کرینگے۔ جنگ کے حالات سامنے رکھے بغیر خدمات کی اہمیت کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ مہم کی کامیابی باربرداری اور رسد کے اعلیٰ انتظامات پر موقوف تھی۔ فوج اندرون ملک میں اسی وقت بڑھ سکتی تھی کہ جابجا اس کے لئے وسیع پیمانے پر خوراک اور پانی کا بندوبست کر لیا جاتا اور مختلف مقامات پر ذخیرے قائم کر دیے جاتے تاکہ فوج کو ہر جگہ قریب ترین ذخیروں سے ضرورت کی چیزیں

ملتی رہیں ۔

باربرداری کے لئے اونٹوں اور خچروں کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا ۔ جنرل ایجرٹن کے پاس تقریباً تین ہزار ہندوستانی اونٹ پہلے سے موجود تھے ۔ بہت سے مزید اونٹ منگوائے اور کم و بیش ساڑھے بارہ ہزار اونٹ صومالی لینڈ سے حاصل کئے ، ان کے علاوہ اونٹ گاڑیاں ، یکے ، یابو وغیرہ بہم پہنچاتے ۔

جنرل میننگ کی نقل و حرکت

جنرل ایجرٹن نے میننگ کو بہوتلے بھیج دیا ۔ وہ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۰۳ء کو روانہ ہوا ۔ بہوتلے پہنچ کر دفاعی انتظامات مکمل کئے ۔ وہاں سے ۱۱ ر نومبر کو چھوٹے سے دستے کے ساتھ چلا دی گیا ۔ مورچہ بندیاں پختہ کر کے خود " بہوتلے " واپس آ گیا ۔

جنگ جدبلی

اوائل دسمبر میں اطلاع ملی کہ قبائلیوں نے جدبلی کے مقام پر دفاعی استحکامات شروع کر دیئے ہیں جو وادی نوگل کے تقریباً وسط میں واقع ہے ۔ جدبلی سے اٹھائیس میل مغرب میں کرنل کینا[1] وی سی اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا ۔ جنرل ایجرٹن نے اسے فوراً جدبلی پہنچنے کا حکم دیا ساتھ ہی تاکید کر دی کہ اگر قبائلیوں کی جمعیت زیادہ ہو تو لڑائی شروع کرنے

---

[1] وی سی سے مراد وکٹوریہ کراس ہے جو انگریزی فوج میں بہادری کا سب سے بڑا تمغہ ہے کینا کو یہ تمغہ ام درمان (سوڈان) کی جنگ میں ملا تھا ۔ پھر یہ ترقی پا کر جرنیل بن گیا اور گیلی پولی کی جنگ میں مارا گیا ۔
Lieut Colonel P.A. Kenna V.C

کے بجائے پیچھے ہٹ آئے تاکہ مناسب تعداد میں فوج فراہم کرکے فیصلہ کن جنگ کی جائے۔

اب واضح ہو چکا تھا کہ جلادی یا بوتلے میں فوجیں بٹھائے رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، چنانچہ جنرل مینگ کو پیغام بھیج دیا گیا کہ جلادی سے فوج واپس بلا لی جائے اور وہ خود ۹ جنوری ۱۹۰۴ء تک جدبلی کے قریب جنرل ایجرٹن کی فوج سے ملحق ہو جائے۔ ۱۰ جنوری کو بھاری جمعیت سے قبائلیوں پر حملہ کیا گیا، وہ شکست کھا کر مشرقی سمت میں نکل گئے۔ میجر بروکس[1] اور کرنل کینا کو ان کے تعاقب پر مامور کر دیا گیا۔ انہوں نے دور تک تعاقب کیا، لیکن کوئی جمعیت مل نہ سکی یہ تعاقب حوض[2] کے جنگل میں سے تھا، جو وادی نوگل کے شمال میں واقع ہے۔

جنگ اِلگ

اس اثنا میں اطلاع ملی کہ قبائلیوں کی ایک جمعیت اِلگ[3] میں موجود ہے، جو وادی نوگل کے مشرق میں اطالوی صومالی لینڈ کی ایک بندرگاہ ہے۔ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے، قبائلی اس مقام پر جمع ہو کر دوبارہ مقابلے کا انتظام کریں۔ حکومت برطانیہ نے اٹلی سے گفت و شنید کے بعد ایک اطالوی جنگی جہاز کی نگرانی میں اپنی فوج وہاں اتاری اور اس مقام پر بھی قبائلیوں کو سخت شکست دی

جنگ اِلگ پر چوتھی مہم ختم ہو گئی۔ اس میں بھی ابی سینیا کے چار ہزار سواروں نے حصہ لیا، انگریز افسر ان سواروں

---

[1] Brooks - [2] Haud - [3] Illig -

کے بھی ساتھ تھے - پندرہ ہزار پونڈ کی رقم خرچ کے لئے حکومت ایبی سینیا کی خدمت میں پیش کی گئی - علاوہ بریں سواروں کو خاصی مقدار میں ضروری سامان دیا گیا -

ملک عمر حیات خاں کی خدمات

ملک عمر حیات خاں نے اس جنگ میں جو خدمات انجام دیں ان کی کیفیت لیپل گرفن اور بعض دوسرے سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ذیل میں درج ہے -

۱- وہ بہوتلے پر پیش قدمی کے دوران میں جنرل میننگ کے ساتھ تھے - یہ سفر حد درجہ کٹھن اور ہمت آزما تھا -

۲- وہ جدبلی کی جنگ میں شریک تھے اور جنرل ایجرٹن نے انہیں اپنا ایڈی کانگ مقرر کر لیا تھا - یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ جنرل میننگ کے ساتھ بہوتلے سے واپس آئے - یا پہلے ہی وادی نوگل کے مشرقی حصے میں بلائے گئے تھے جہاں سے جنرل ایجرٹن نے جدبلی پر پیش قدمی کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا - ۳ - وہ درویشوں کے تعاقب میں کرنل کینا یا میجر پر دکس کے ساتھ تھے - حوض کے جنگل میں ہی ملک صاحب کے شتری دستے نے ایک مرتبہ متواتر نو دن پانی کے بغیر گزارے اور یہ واقعہ اب تک شتری جیشوں کی تاریخ میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے - ملک صاحب اونٹوں اور گھوڑوں کے عادات خصائل اور معالجات سے بہ خوبی واقف تھے -

انہیں جب علم ہوا کہ جس علاقے میں سے فوج گزرنے والی ہے - وہاں پانی کا ملنا یقینی نہیں تو اپنے

اونٹوں کو دو تین روز پانی نہ پلایا - پھر ایک اچھے مقام پر انہیں خوب پیٹ بھر پینے کا موقع دیدیا اس کے بعد نو دن پانی کے بغیر گزار دیئے اور اونٹوں کی رفتار یا عام حالت پر قطعاً کوئی اثر نہ پڑا، اس کارنامے کی تحسین سب نے کی۔

۴ - میجر بروکس اور کرنل کینا کی معیّت کے دوران میں بھی جنرل ایجرٹن نے انہیں بدستور اپنے سٹاف میں شامل رکھا بلکہ اپنی ایک خاص گھوڑی ملک صاحب کو دیدی - کرنل کینا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہادری کے جوش میں اندھا دھند حملے کر دیتا تھا اور اس کے ساتھی اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کیا کرتے تھے تاہم ملک عمر حیات خاں نے اس کی معیّت ترک نہ کی اور ہر قسم کے خطرات بہ خوشی گوارا کر لئے۔

۵ - وہ اِلگ کی لڑائی میں بھی شریک ہونے کے خواہاں تھے، لیکن دوسرے فرائض کی بجاآوری کے پیش نظر انہیں اجازت نہ دی گئی اس ایک لڑائی کے سوا وہ صومالی لینڈ کی چوتھی مہم کے تمام معرکوں میں شریک رہے

۶ - مہم کے اختتام پر بعض بڑے بڑے انگریز افسر انگلستان چلے گئے تو ملک صاحب کو صدر مستقر (ہیڈ کوارٹرز) کے نظم و نسق کا ذمہ دار بنا دیا گیا اور انہیں نے نوکر چاکر، گھوڑے اور

سامان صومالی لینڈ سے ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں بھجوایا۔

ذاتی خطرات اس جنگ میں ملک صاحب کو قدم قدم پر شدید خطرات سے سابقہ پڑا جن میں سے بعض کی سرسری کیفیت یہ ہے:-

۱۔ سب سے بڑا خطرہ ان دستوں کو تھا جو رسد اور سامان جنگ لے کر فوجوں سے آگے چلتے تھے۔ ملک صاحب کے شتری دستے کی عام حالت چونکہ سب سے بہتر تھی، اس لئے وہ عموماً آگے رہتا تھا۔

۲۔ گرمی سے بچنے کے لئے سفر عموماً رات کے وقت کیا جاتا تھا اور کچھ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ گردو پیش کی جھاڑیوں میں کہاں کہاں درویش بیٹھے ہیں گویا سفر کا کوئی لمحہ بھی خطرے سے خالی نہ ہوتا تھا۔

۳۔ ملک صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے دستوں کے جانوروں کی چرائی کا خاص خیال رکھتے اور بعض اوقات لشکر کی جائے قیام سے میل دو میل آگے یا پیچھے موزوں جگہ دیکھ کر ٹھہر جاتے۔ اس طرح انہیں خیمے یا سائبان کی راحت سے محروم ہونا پڑتا، لیکن جانوروں کی شکم سیری کے مقابلے میں انہوں نے اپنی راحت کا کبھی خیال نہ کیا

۴۔ ایک مرتبہ درویشوں نے پسپا ہوتے وقت راستے کے تمام کنوؤں میں زہریلی جڑی بوٹیاں ڈال دیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ پانی زہر آلود ہو گیا ہے، جن لوگوں نے

بے خبری میں یہ پانی پی لیا - ان میں ملک صاحب بھی شامل تھے - بعض آدمی اس وجہ سے جان بحق ہو گئے - ملک صاحب خدا کے فضل سے محفوظ رہے اور زہر کے اثرات تھوڑی دیر میں زائل ہو گئے -

۵ - ایک مرتبہ انہیں ایک ضروری پیغام دے کر سواروں کے پاس بھیج دیا گیا، اس فرض کی بجا آوری بھی خطرات کے طوفان سے گزرے بغیر ممکن نہ تھی، وہ روانہ ہو رہے تھے کہ سٹاف افسر سواروں کی طرف سے پیغام لے کر آ گیا - چونکہ اسے واپس جانا تھا، اس لئے پیغام بھی اسی کے حوالے کر دیا گیا - وہ بیچارا راستے ہی میں مارا گیا - گویا اس موقعہ پر بھی خدا نے اپنی رحمت سے ملک صاحب کو بچا لیا -

۶ - اس مہم میں ان پر اسکروی کی بیماری کا حملہ ہوا - کیونکہ کھانے کو سبزیاں نہیں ملتی تھیں، جس سے ان کے دانتوں پر بہت بُرا اثر پڑا، تاہم انہوں نے مہم کے دوران میں ایک دن کے لئے بھی خدمات سے سبکدوشی گوارا نہ کی -

۷ - ایک موقع پر وہ فوج کے ایک دستے کو ضروری پیغام پہنچا کر واپس آ رہے تھے کہ اندھیرا ہو گیا اور وہ راستہ بھول گئے - حسن اتفاق سے ایک سیٹی کی آواز ان کے کان میں پہنچ گئی اور وہ اپنے دستے سے آ ملے - اس روز دوسرے جتنے لوگ پیغام دیکر بھیجے گئے تھے، وہ درویشوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا-

اعترافِ خدمات اور اعزاز

اس مہم میں ملک صاحب نے جو خدمات انجام دیں ۔ ان کے صلے میں ایک تمغا ملا جسے تمغائے صومالی لینڈ ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۴ء کہتے تھے ۔ میدان جنگ سے جو مراسلے بھیجے گئے، ان میں بھی ملک صاحب کی خدمات کا تحسین آمیز ذکر کیا گیا تھا ۔ چند امور مسلّم ہیں ۔ مثلاً :-

۱ ۔ ملک صاحب نے مہم کے دوران میں ہر اس خدمت کی بجا آوری کے لئے اپنے آپ کو بے توقّف پیش کر دیا، جس سے مہم کو کامیاب انجام پر پہنچانے میں کچھ بھی مدد مل سکتی تھی، خواہ اس خدمت کے انجام دینے میں کتنے ہی خطرات درپیش تھے ۔

۲ ۔ ان کی پیشکش کو اس لحاظ سے خاص امتیازی حیثیت حاصل تھی کہ ان کے پیشِ نظر کوئی منفعت نہ تھی، وہ صرف خاندانی روایات کو تازہ رکھنا چاہتے تھے ۔ لہٰذا جو بھی کام ان کے سپرد ہوا، اسے انتہائی خلوص و جانفشانی سے انجام دیا ۔

۳ ۔ تنہا ان کا شتری دستہ تھا جس نے سب سے بڑھ کر خدمات انجام دیں اور آخری دم تک سب سے اچھی حالت میں رہا ۔

اس جنگ میں بہادری اور مردانگی کے لئے انہیں

سی، آئی، ای کا خطاب ملا - جنرل ایجرٹن نے رخصت ہوتے وقت اپنی گھوڑی ملک صاحب کو بہ طور تحفہ دے دی تاکہ جنگ میں رفافت کی خوش گوار یاد تازہ رہے ۔



جنگوں میں ملک صاحب ہر حملے یا پیش قدمی سے پہلے اپنے آدمیوں کے ہمراہ دعائے خیر مانگتے تھے -



میدان جنگ میں کیمپ کا منظر - اگلے دن کی کارروائی سے پہلے ملک صاحب نقشے کا مطالعہ کر رہے ہیں -

آٹھواں باب

تبت کی مہم

جانفشانی کا نیا مرحلہ

ملک عمر حیات خاں صومالی لینڈ سے واپس آ رہے تھے اور گھر نہ پہنچے تھے، کہ تبت کی مہم شروع ہو گئی اور ملک صاحب نے بے توقّف اس کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صومالی لینڈ میں ان کے کارنامے ذمہّ دار فوجی افسروں کو بخوبی معلوم ہو چکے تھے، پھر ایسے کارکن کی خدمات سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جاتا، جسے فوجی و انتظامی دائروں میں یکساں امتیازی درجہ حاصل تھا اور وہ اپنی جیب سے خرچ برداشت کرکے یہ خدمات بجا لانے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ انہیں حکم مل گیا کہ جلد سے جلد اس مقام پر پہنچ جائیں، جہاں سے انگریزی فوج تبت جانے والا تھا، صرف ایک ہفتہ کی مہلت اس غرض سے ملی کہ اپنے لئے گھر سے

گرم کپڑے لے آئیں، اس لئے کہ تبّت کا سفر شدید برفستانی علاقوں میں سے تھا

تبّت اور صومالی لینڈ کا مقابلہ

صومالی لینڈ میں راستے کٹھن، خوراک، پانی وغیرہ ضروری سامان ناپید تھے اور کچھ خبر نہ تھی کہ درویش کہاں کہاں گھات میں چھپے بیٹھے ہیں، اس لئے ہر قسم کی جسمانی مشقتیں برداشت کرنے کے علاوہ ہر وقت جان کا خطرہ لگا رہتا تھا، تبّت کی مہم بھی تکالیف کی شدّت کے لحاظ سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھی، اس لئے کہ سارا راستہ دشوار گذار پہاڑوں میں سے تھا، جن کی بلندی دس ہزار فٹ سے سترّہ ہزار فٹ تک جاتی تھی اور قدم قدم پر برفانی طوفانوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ بارش مسلسل ہوتی تھی۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ جب حمل ونقل کے وسائل بہت معمولی حالت میں تھے اور جو سہولتیں آج جا بجا نظر آتی ہیں، ان کا تصوّر بھی اس زمانے نہ کیا جا سکتا تھا۔ جنرل صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ صومالی لینڈ کے انتہائی گرم خطّے کے بعد انتہائی سرد خطّے میں خدمت کی ضرورت پیش آ گئی تو اُس کے لئے بھی بے تکلّف تیار ہو گئے۔

مہم کے اسباب

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ مہم کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ تبت برائے نام چین کے ماتحت تھا۔ جب چین کا بادشاہی نظام کمزور ہو گیا تو تبّت نے عملاً خود مختاری اختیار کر لی ملکی انتظامات کی باگ ڈور دو آدمیوں کے ہاتھ میں تھی، ایک

دلائی لامہ جسے ملکی اور سیاسی امور کا مختار سمجھا جاتا تھا، دوسرا تاشی لامہ جو مذہبی امور کا مختار تھا۔

ہندوستان کی انگریزی حکومت نے تبت سے ابتدائی تعلقات وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں پیدا کیے۔ انگریز حکمرانوں کے سامنے دو بڑے مقصد تھے۔ ایک یہ کہ روس کے لیے تبت میں عمل دخل کا موقع پیدا نہ ہو وہ وسط ایشیا کے اسلامی ملکوں پر قبضہ جما چکا تھا۔ تبت میں اس کے قدم جم جاتے تو ہندوستان کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو جاتا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان اور تبت کے درمیان تجارت کا سلسلہ جاری رہے۔

روسی کارندے کی کامیابی اتفاق سے روسیوں کو ایک ایسا کارندہ مل گیا، جس نے دلائی لامہ اور بعض دوسرے کارفرماؤں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اُس کا نام دُرجیف[1] تھا۔ اس نے دلائی لامہ کو سمجھایا کہ چین خواہ مخواہ تبت پر اپنا اقتدار جما رہا ہے۔ اُدھر سے انگریز اس خیال میں ہیں کہ تمہارے ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔ ان خطروں سے محفوظ رہنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ زار روس کی سرپرستی قبول کر لو۔ نہ چین کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ہو گا، نہ انگریزوں کو۔ دلائی لامہ نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور ایک معاہدے کی شرطیں بھی طے ہو گئیں۔ ۱۹۰۳ء میں روسی فوج کا ایک دستہ لاسہ بھیجنے کا وعدہ کر لیا گیا۔

---

[1] Dorjieff

کرزن کی کوششیں

اُس زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا ۔ اس نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ[1] کی سرکردگی میں ایک وفد تیار کیا اور اس کے ساتھ فوجی دستے روانہ کر دیئے ۔ تجویز یہ تھی کہ حکمرانانِ تبت وفد سے گفت و شنید کر کے روسی مداخلت کا کانٹا نکال دینے پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی فوجی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر وفد کو راستے میں روکا جائے یا گفت و شنید سے انکار کر دیا جائے تو اس صورت میں لازم ہوگا کہ وفد فوجی قوت سے کام لے کر لاسہ پہنچے اور وہاں ایسی شرطیں منظور کرائی جائیں جن کی بنا پر روسی مداخلت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے ۔

وفد کی پیشقدمی

وفد ضروری انتظامات کے بعد روانہ ہوا اس کا مرکز سلی گڑی[2] تھا جو دارجیلنگ ریلوے کا ایک مشہور سٹیشن ہے ۔ وہاں سے دریائے تستا کے کنارے کنارے بڑھا ۔ ارکانِ وفد سکم کے دارالحکومت گنٹوپ ہوتے ہوئے چھمبی کے قریب فوج کے ساتھ شامل ہو گئے ۔ وادیِ چھمبی کا راستہ خاصا دشوار گزار تھا ۔ اہلِ تبت نے وفد کو روکنا چاہا لیکن کوئی فوجی کارروائی نہ کی ۔ چھمبی سے آگے بڑھ کر جھیل بام سو کے قریب سخت لڑائی ہوئی، جس میں اہلِ تبت کو شدید نقصان پہنچا ۔ پھر وفد گیانتسی پہنچ گیا، جہاں دفاعی انتظامات مکمل کر لئے اور لاسہ پیغام بھیج دیا کہ ذمہ دار آدمیوں کے ذریعے سے گفتگو کر لی جائے ۔ گیانتسی میں انگریزی فوج پر حملہ ہو گیا اور دو مہینے تک اس کا محاصرہ جاری رہا ۔ آخر اہلِ تبت نے صلح کا جھنڈا بلند کر دیا

---

[1] Francis Younghusband.
[2] Siliguri سلی گڑی اور دار جیلنگ کے درمیان مشہور مقام ہے ۔

پھر وفد لاسہ پہنچا اور کارفرمایانِ تبت نے انگریزوں کی پیش کردہ شرطیں منظور کر لیں - یوں مہم پایۂ تکمیل تک پہنچی

راستے کی مشکلات

راستے کی مشکلات کے متعلق فرانسس ینگ ہسبنڈ اینڈ منڈ کینڈلر اور بعض دوسرے شرکائے وفد نے تفصیلی حالات بیان کئے ہیں - مثلاً مہم کے آغاز ہی سے تیز تند برفانی ہوائیں چلنے لگیں - آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچے تو طوفان اور بھی شدت اختیار کر گئے۔ ندیوں اور آبشاروں کا پانی جم کر یخ ہو گیا - خیموں میں سونا پڑتا تھا اور درجۂ حرارت صفر سے بھی پچیس ۲۵ درجے نیچے تھا۔ گیانٹسی پہنچے تو قیام کے لئے قلعہ مل گیا جس کی چار منزلیں تھیں، لیکن اس کے تمام کمرے صدیوں کے گرد و غبار سے اٹے پڑے تھے - آگ جلانے کے لئے یاک[1] کے اپلے ملتے تھے - ان کے دھوئیں اور بدبو سے ناک میں دم آجاتا تھا - تین مہینے اسی حالت میں گذارنے پڑے

ملک عمر حیات خاں کی خدمات

اس مہم میں ملک عمر حیات خاں نے جو خدمات انجام دیں، ان کی صرف سرسری کیفیت معلوم ہو سکی ہے - خود انہوں نے اپنے قلم سے جو کچھ لکھا تھا، وہ ضائع ہو گیا - ان کا صرف ایک رفیق سفر زندہ ہے، لیکن اسے پچاس باون سال پیشتر کے واقعات پوری طرح یاد نہیں رہے ہے بہر حال جو کچھ ہمارے علم میں آیا ذیل میں درج ہے -

---

[1] یاک ایک قسم کا پہاڑی بیل ہے جس کے جسم پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں - پہاڑوں میں سواری اور بار برداری کے لئے یہی جانور استعمال ہوتا ہے -

۱۔ راستے بے حد خراب تھے۔ پہاڑی یا بوہر جگہ مل نہ سکتے تھے۔ بارش میں ان راستوں کو سواری پر طے کرنا خالی از خطرہ نہ تھا، لہٰذا سفر کا بیشتر حصّہ پیدل طے کیا، حالانکہ ملک صاحب امیر گھرانے کے آدمی تھے اور اس قسم کے دشوار گذار راستے پیدل طے کرنے کا انہیں کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔

۲۔ انہیں ابتدا میں حمل و نقل کا انتظام سونپا گیا تھا، اس لئے کہ صومالی لینڈ میں انہیں اس کام کا وسیع تجربہ ہو چکا تھا اور تبت کے راستے میں حمل و نقل کا مسئلہ خاصا اہم اور پیچیدہ تھا۔ چھمبی پہنچنے کے بعد ۳۲ پیادہ فوج کے اس دستے کا منتظم بنا دیا گیا، جو بابوؤں پر راستہ طے کرتا تھا۔ چھمبی سے گیانٹسی تک وہ اس دستے کے منتظم رہے۔

۳۔ گیانٹسی پہنچنے کے بعد اس دستے کو وسائل خبر رسانی کا انتظام سونپ دیا گیا، چنانچہ قیام گیانٹسی کی پوری مدّت میں ملک صاحب ایک طرف لاسہ اور گیانٹسی، دوسری طرف گیانٹسی اور کلکتہ کے درمیان ڈاک پہنچانے کے ذمہ دار رہے صلح کی گفتگو کے دوران میں خبر رسانی کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور ملک صاحب نے یہ کام انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

۴۔ ملک صاحب خود لاسہ جانے کے لئے تیار تھے، لیکن گیانٹسی میں جو فرائض ان کے حوالے کئے گئے تھے، ان کے پیش نظر اجازت نہ مل سکی، اس لئے کہ کوئی دوسرا شخص ان فرائض کی بجا آوری سے بخوبی عہدہ برآ نہ ہو سکتا تھا۔

۵۔ ایک موقع پر انہیں کسی وادی کی دیکھ بھال کیلئے

بھیجا گیا، جس میں وہ سترہ ہزار فٹ بلند ایک درّے سے گزرے۔ دیکھ بھال کا یہ کام انہوں نے پیدل انجام دیا۔

گوناگوں فرائض

جن فرائض منصبی کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کے علاوہ ملک صاحب نے اور فرائض بھی انجام دیئے جو خاص حالات کے اعتبار سے ان کے ذمّے عائد ہو گئے تھے اور پوری مہم میں صرف وہی اپنی ہمہ گیر معلومات اور تجربات کی بنا پر انجام دے سکتے تھے۔ مثلاً۔

۱۔ قیام گیانٹسی کے دوران میں گھوڑوں کے معالجات اور دیکھ بھال کے لئے کوئی ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ ملک صاحب ذاتی شوق سے ویٹرنری کا کورس پاس کر چکے تھے اور انہیں اپنے اصطبل میں گھوڑوں کی بیماریوں کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا تھا، لہذا وہ مہم کے بیمار گھوڑوں کا علاج کرتے رہے اور ان کی توجہ سے گھوڑوں کی خاصی تعداد تندرست ہو گئی۔

۲۔ بعض فوجیوں نے کچھ ضروری جنگی سامان ہتھیا لیا تھا۔ ملک صاحب نے مدبرانہ طریق تفتیش سے سارا ہتھیایا ہوا سامان برآمد کرا لیا۔

۳۔ مہم میں ان کے سوا کوئی شخص نہ تھا، جسے عدالتی کاروبار کا پورا تجربہ ہوتا۔ وہ اپنے علاقے کے مجسٹریٹ تھے، اس لئے عدالتی کارروائیوں کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ قیام گیانٹسی میں کورٹ مارشل کے اکثر مقدمات میں ملک صاحب سے پیروکار استغاثہ کا کام لیا گیا اور یہ کام انہوں نے انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

۴۔ ایک موقعہ پر پیادہ فوج میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی

اور اندیشہ یہ تھا کہ مبادا وہ باغی ہو جائے ۔ ملک صاحب نے اس خطرناک موقعہ پر کماندار کے مشورے سے فوج کو مطمئن کر دیا ۔ اس طرح ایک ناگوار صورت حالات سے مہم کو بچا لیا ۔

معاہدہ صلح آخر تبت کے حکمرانوں نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور قرار پایا کہ روس کیلئے عملی دخل کا کوئی موقعہ پیدا نہ ہوگا ۔ تبت و ہند کے درمیان آزادانہ تجارت جاری رہے گی ۔ مشرقی اور مغربی تبت میں گیانٹسی اور گرٹوک تجارت کے مرکز قرار پائے ۔ تبت نے پچیس لاکھ روپے کی رقم تاوان کے طور پر ادا کرنی منظور کر لی ۔ حکومت ہند نے یقین دلا دیا کہ تبت کے کسی بھی علاقے پر قبضہ نہ کیا جائے گا ۔ اور ملک کی آزادی کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچے گا ۔

مراجعت اور اعزاز تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے اور وفد مع فوج واپس ہوا تو ملک عمر حیات خاں بھی ساتھ آئے ۔ وہ مہینوں حد درجہ صبر آزما حالات میں اہم فرائض انجام دیتے رہے تھے ۔ اور رات دن غیر معمولی زحمتیں برداشت کرتے رہنے کے باوجود اُن کی صحت خدا کے فضل سے اچھی رہی ۔ لیکن سفر مراجعت میں تند برفانی طوفانوں کے باعث انہیں برف کوری[1]

---

[1] برف کوری سے مراد وہ عارضہ ہے جسے انگریزی میں سنو بلائنڈنیس (Snow Blindness.) کہتے ہیں ۔ یہ عارضہ تند برفانی طوفانوں میں بھی ہو جاتا ہے ۔ اصرف پر چلنے سے بھی بینائی کو شدید مضرت پہنچ جاتی ہے ۔

کا عارضہ ہو گیا ۔ خدا کا شکر ہے کہ ملک صاحب نے اس سے جلد شفا پائی ، وہ اگرچہ لاسہ نہ گئے تھے ، لیکن گیانٹسی سے دارجیلنگ تک صرف آمد و رفت میں کم و بیش پان سو میل کی مسافت سخت وشوار گذار پہاڑی علاقوں میں طے کی تھی ۔پھر خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ تمام بابو نمبر۴ پٹھان لشکر کے حوالے کر دیئے تھے ، جسے تبّت میں چھوڑا گیا تھا ، اس لئے ملک صاحب کو سلی گڑی تک جو دارجیلنگ کے قریب مہم کا مرکز تھا ، پیدل واپس آنا پڑا ۔

مہم کے دوران میں انہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی تھیں ، ان سے جیش کا سپہ سالار بہت متاثر تھا ، چنانچہ اس نے واپسی پر ملک صاحب کو لارڈ کچنر کمانڈران چیف سے متعارف کرایا ۔ ۱۹۰۴ء میں یہ اعزاز انہیں اصحاب کو ملتا تھا ، جن کی خدمات بہ طور خاص قابلِ قدر سمجھی جاتی تھیں ۔ نیز تبّت کے تمغۂ خاص کے علاوہ ملک صاحب کو سی ۔ آئی ۔ ای کا خطاب دیا گیا ۔

کورٹ آف وارڈز کے اختتام پر ملک صاحب انتظام جائداد کے مختار بنے مخفے تو ڈپٹی کمشنر نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے دوسری باتوں کے علاوہ

ملک صاحب کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلو گے تو ایک روز بڑے بڑے اعزاز حاصل کرو گے ۔ ملک صاحب شاندار خدمات اور جانفشانیوں کی بدولت بہت جلد عزّت و سربلندی کے اُس اعلیٰ درجے پر پہنچے جو انگریزی حکومت کے ماتحت بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوا ۔

نواں باب

کانگڑہ میں امداد کا کام

کابل جانے کی پیش کش ملک عمر حیات خاں تبت کی مہم سے واپس آئے تو اسی سال حکومتِ ہند ایک خاص وفد کابل بھیجنے کا فیصلہ کر چکی تھی - اس کی غرض یہ تھی کہ افغانستان کے نئے امیر حبیب اللہ خاں سے جدید معاہدے کیلئے بات چیت کی جائے - وفد کے رئیس سر لوئی ڈین تجویز ہوئے تھے، جو اس زمانے میں معتمد امور خارجہ (فارن سکرٹری) تھے - بعد ازاں پنجاب کے گورنر بن گئے - وفد کے ساتھ ایک فوجی دستہ بھی جا رہا تھا - ملک صاحب نے اس میں شامل ہونے کے لئے درخواست پیش کر دی - آپ دیکھ چکے

ے Sir Louis William Dane

ہیں کہ صومالی لینڈ اور تبت میں کن شدید خطرات کے ماتحت انہوں نے نہایت اہم خدمات انجام دی تھیں اور ان کی سی بلند حیثیت کا امیر شخص نظر بہ ظاہر ایسے خطرات کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتا تھا، لیکن ملک صاحب طبعاً من چلے آدمی تھے اور ان کی عزیمت کا تقاضا یہی تھا، کہ خطرناک مہموں میں اپنے خدا داد جوہروں کی نمائش کریں، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ بڑے سے بڑے خطرات بھی ان کے دل میں کبھی کوئی ہراس پیدا نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی مواقع اور اسی قسم کا ماحول ان کے نزدیک سازگار و خوش گوار تھا۔

لارڈ کچنر اُس زمانے میں کمانڈرانِ چیف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ملک صاحب نے پے در پے دو مہموں میں شدید تکلیفیں اٹھائیں بلکہ تبت کی مہم میں وہ سخت بیمار بھی ہو گئے، لہذا گوارا نہ کیا کہ انہیں فوراً کوئی اور خدمت سونپ دی جائے۔ چنانچہ ان کی پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہدیا کہ وہ کچھ وقت آرام فرمائیں۔

کانگڑہ کا زلزلہ

۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء کو کانگڑہ میں خوفناک زلزلہ آیا۔ ۶ بجے صبح کا وقت تھا۔ اکثر لوگ گھروں میں اطمینان سے سوئے پڑے تھے۔ پہلے دو ہلکے سے ہچکولے محسوس ہوئے۔ تین چار لمحوں کے وقفے سے دو خوفناک جھٹکے لگے اور وسیع علاقے میں جگہ جگہ تباہی پھیل گئی۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ دور دور تک عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ جو خوش نصیب بہت

سویرے اٹھ کر باہر نکل گئے تھے یا جو ابتدائی ہچکولے کے ساتھ ہی آناً فاناً بھاگ اٹھے، وہ تو بچ گئے۔ باقی اکثر ملبے میں دب گئے۔ ان میں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں۔ کانگڑہ، دھرم سالہ، نگروٹہ، سجان پور وغیرہ قصبوں اور بے شمار دیہات کو شدید نقصان پہنچا۔ پل ٹوٹ گئے چٹانیں گرنے سے سڑکیں آمد و رفت کے قابل نہ رہیں تار کے سلسلے بھی منقطع ہو گئے۔ گویا اس خوفناک آسمانی مصیبت میں آفت زدوں کی امداد بھی سخت مشکل ہو گئی۔ دھرم سالہ سے دو انگریزوں نے بہ مشکل تمام دو قاصد نور پور بھیجے۔ وہاں سے لاہور تار دیئے گئے۔ یوں بیرونی دنیا کو خوفناک تباہی کی پہلی خبر ملی۔

نقصان کا اندازہ

سرسری اندازہ یہ ہے کہ کانگڑہ، پالم پور، ہمیر پور اور گوبی پور دیرہ کی تحصیلوں میں تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مویشی کا نقصان اس سے بہت زیادہ تھا۔ علاقہ پہاڑی تھا اور ایسے علاقوں میں مویشی عموماً مکانوں کی نچلی منزل میں باندھے جاتے ہیں۔ مکان ڈھے گئے تو نچلی منزل سے کسی جاندار کا سلامت بچ نکلنا بالکل محال تھا۔ چنانچہ مویشی کا نقصان ساڑھے سنتیس ہزار سے کم نہ تھا۔

امدادی کام

سر چارلس ریواز اس زمانے میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ انہوں نے فوری امداد کے انتظامات میں انتہائی مستعدی سے کام لیا ۴ اپریل کو رات کے وقت حادثے کی اطلاع ملی تھی۔ ۵ر۔ اپریل کو دن کے ایک بجے سپیشل امدادی ٹرین لاہور سے پٹھان کوٹ روانہ ہو گئی، جس میں خوراک، دواؤں، خیموں اور دوسری ضروری چیزوں کے علاوہ ڈاکٹر، انجینئر اور فوجی کارکن بھی بھیجے گئے تاکہ ضرورت مندوں کے لئے جلد از جلد کھانے پینے اور علاج معالجے کا انتظام ہو جائے۔ ان کے عارضی قیام کے لئے جا بجا خیمے لگ جائیں۔ سڑکیں اور پل درست کئے جائیں اور آمد و رفت باقاعدہ جاری ہو جائے۔ اس آخری انتظام کے بغیر باہر سے ضرورت کے مطابق امدادی ٹیمیں نہ بھیجی جا سکتی تھیں۔ اس طرح چند ہی روز میں حالات پر قابو پا لیا گیا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مقامی لوگوں میں سے جو دولت مند اور ذی استطاعت تھے، انہوں نے بھی امداد میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی۔ وہ زمانہ عام چندوں کا نہ تھا، تاہم اہل ملک نے تھوڑی ہی مدت میں ساڑھے تیرہ لاکھ سے زیادہ کی رقم بہ طیب خاطر فراہم کر دی اور حکومت نے مستقل آباد کاری کا کام شروع کیا۔

مشکلاتِ کار

اصل کام محض اس حد تک محدود نہ تھا کہ جو لوگ زندہ بچے تھے، ان کے لئے قیام و طعام اور علاج معالجے کا انتظام کر دیا جائے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ جو بدنصیب ملبے کے نیچے دب گئے تھے، ان کی لاشیں نکالی جاتیں اور ملبہ صاف کر کے نئے سرے سے مکان تعمیر کئے جاتے۔ پھر لوگوں نے غلے کے جو ذخیرے جمع کر رکھے تھے، وہ سب بھی ملبے میں دب گئے تھے۔ ان ذخیروں کو نکالے بغیر ان مصیبت زدوں کے لئے مستقل گذارے کا بندوبست نہ ہو سکتا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ آئندہ فصل کی کاشت میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ حالت یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے مویشی مر چکے تھے اور نئے مویشی خریدے بغیر وہ کھیتی باڑی کر ہی نہ سکتے تھے، نیز انہوں نے فصلوں کی آبیاری کے لئے جو چھوٹے چھوٹے کھالے بنا رکھے تھے، وہ بے نشان ہو چکے تھے۔ گویا کھیتی باڑی کے باقاعدہ اجراء کے لئے لازم تھا کہ مویشی خاصی تعداد میں بہم پہنچائے جاتے اور پانی کے کھالے درست کر دیئے جاتے۔

سرکاری کارکنوں اور ان کے معاونوں نے تمام ضروری کام بڑی ہی سرگرمی سے انجام دئے، سر چارلس ریواز خود موقع پر پہنچے۔ انہوں نے زلزلہ زدہ رقبے میں ربیع کا مالیہ معاف کر دیا۔ ضرورت مندوں کو بلا سود تقاویاں دے دیں۔ اور قسطیں ایسی مقرر کیں جو بہ آسانی ادا ہو

سکیں ۔ مکانوں کے لئے جنگل سے لکڑی مفت ملنے کا اعلان کر دیا ۔ آبیاری کے کھالے جلد سے جلد درست کرا دیئے گئے ۔ اس طرح مکئی اور دھان کی فصلیں بر وقت کاشت ہو سکیں ۔

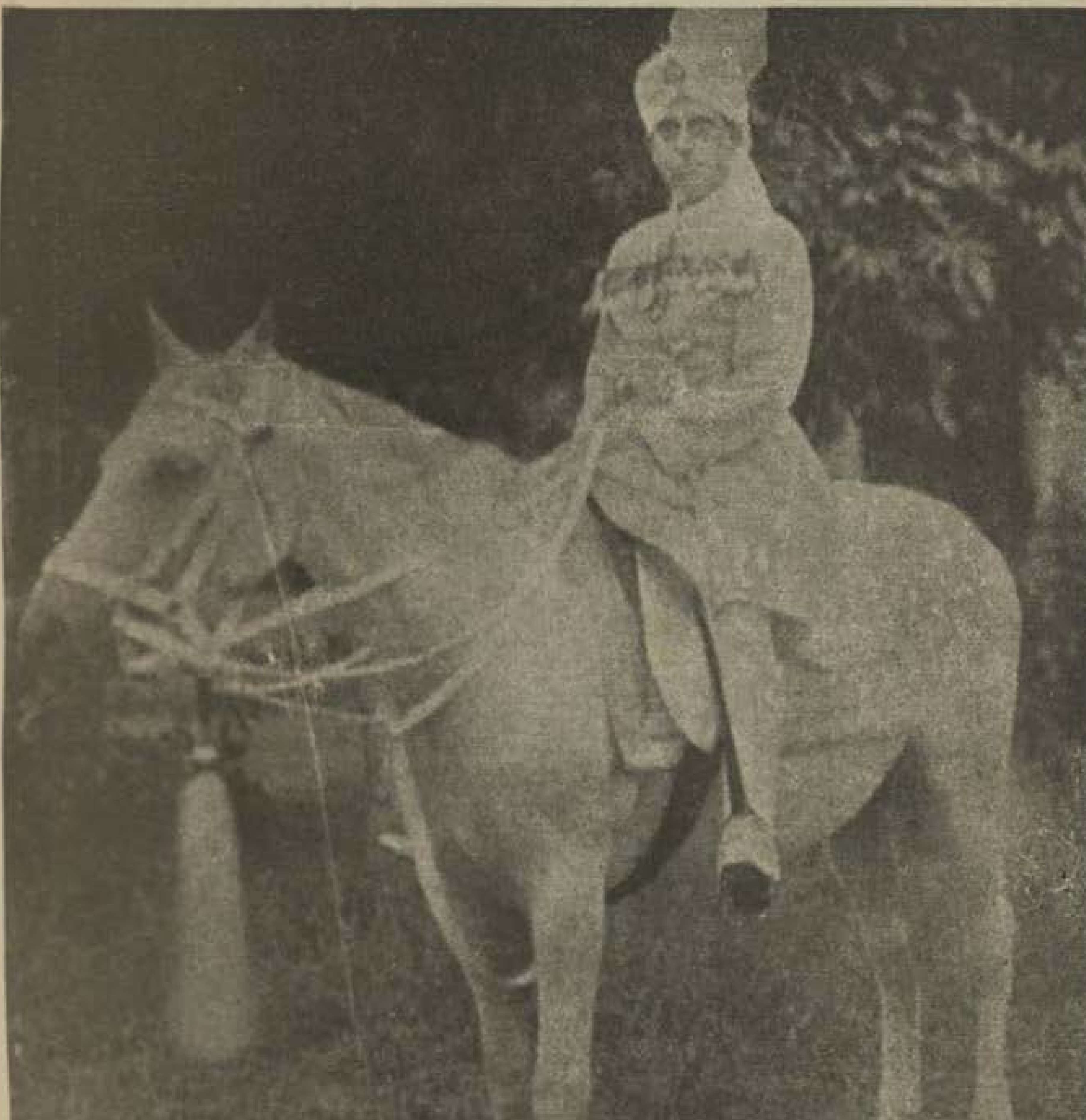
ملک عمر حیات خاں کی سرگرمیاں

مصیبت زدہ لوگوں کی مستقل امداد کا کام بڑا ہی نازک تھا اور یہ انہیں اصحاب کے حوالے کیا جا سکتا تھا ۔ جو اس اہم فرض کی بجا آوری کے زیادہ سے زیادہ اہل ہوتے ، ملک عمر حیات خاں نے مالی امداد میں حصہ لینے کے علاوہ اپنی خدمات بھی پیش کر دی تھیں ، جو حکومت پنجاب نے شکریے کے ساتھ قبول کیں اور لمبا گراں کا علاقہ ان کے حوالے کر دیا ۔ یہ علاقہ تحصیل پالم پور میں بیج ناتھ کے قریب ہے اور اس کی حد ریاست منڈی سے ملی ہوئی ہے ۔

ملک صاحب ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو موقع پر پہنچے اور دو مہینے پانچ دن انہوں نے پورے علاقے کے دورے میں صرف کئے ۔ وہ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں خود گئے اور ایک ایک فرد کی ضرورتوں کا ٹھیک اندازہ کر کے مناسب امدادی رقم براہ راست اس کے حوالے کی اس دورے میں انہیں انتہائی مشکلات پیش آئیں ۔ اس لئے کہ راستے بے حد خراب تھے تاہم یہ خلق خدا کی خدمت کا کام تھا ، جو ملک صاحب نے بہ طیب خاطر اپنے ذمے



۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں سٹاف کیپٹن کی وردی میں



ملک عمر حیات خاں انگلستان میں انٹرنیشنل ویڑن ریلی کے موقعہ پر

لیا تھا۔ اسے وہ کسی کارندے کے حوالے کر سکتے تھے اور نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ مکمل تحقیقات اور پوری چھان بین سے اطمینان کئے بغیر روپیہ بانٹتے جائیں۔

تحسین وستائش عوام کی امداد کے سلسلے میں ملک صاحب نے عمل کا جو نہایت عمدہ اور قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا تھا، اس کی تحسین سب نے کی۔ سر ڈانلڈ[1] بائڈ نے اپنی مفصل رپورٹ میں ان کے کام کو ہر لحاظ سے انتہائی ستائش کا مستحق قرار دیا، بیپل گرفن کے بیان سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے[2]۔ یہیں سے سر جے چند راجا لمبا گاؤں کے ساتھ گہری دوستی کا آغاز ہوا، جو راجا کی زندگی تک برابر قائم رہی۔

---

[1] Sir Donald Boyd. [2] "پیپل گرفن" جلد دوم ص ۲۰۶

دسواں باب

پنجاب لیجسلیٹو کونسل

کونسل کیلئے نامزدگی

ملک عمر حیات خاں کی عمر تیس یا اکتیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ جب انہیں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے لئے نامزد کیا گیا۔ انہیں املاک کا انتظام سنبھالے ہوئے بہت تھوڑی مدت گذری تھی۔ اپنے ضلع میں بھی وہ دائرہ عوام میں چنداں نامور شخصیت نہ تھے، تاہم چند ہی سال میں سرگرمی، جانفشانی، عوامی کاموں سے گہری دلبستگی اور ہر مفید دائرے میں سبقت کے باعث اتنا اونچا رتبہ حاصل کر چکے تھے کہ انہیں وقت کا یہ بڑا اعزاز مل گیا۔ ان کے متعلق ایک صاحب نے مختصر سا سوانحی خاکہ مرتب کیا تھا، اس سے معلوم

ہوتا ہے :-

خدمتِ عوام سے گہری دلبستگی کے باعث ملک عمر حیات خاں کو بہت جلد پنجاب کونسل میں لے لیا گیا، جہاں وہ عمر کے لحاظ سے کونسل کے نوجوان ترین ارکان میں سے تھے۔

راقم الحروف نے پرانی انتظامی رودادوں کا تفصیلی مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جنوری ۱۹۰۶ء میں انہیں کونسل کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ اس کونسل کے ممبر تھے، جنہوں نے بعد میں بڑا نام پایا اور اس وقت بھی پنجاب میں بہت اونچے درجے پر فائز تھے۔ مثلاً ایگزانڈر انیڈرسن، جے، ایم ڈوئی[۱] سر چارلس ٹپر[۲]، میاں شاہ دین، پرتاب سنگھ آہلو والیہ، ٹھاکر مہان چند، گورڈن[۳] واکر[۴]۔

ان لوگوں میں سے دیہاتی حلقے کے نسبتاً کم تجربہ کار زمیندار کا کوئی نمایاں حیثیت اختیار کرنا بہت مشکل تھا، لیکن ملک صاحب نے تھوڑی ہی مدت میں ایسی اہمیت پیدا کر لی کہ ان کی نامزدگی کے ذمہ دار یقیناً اپنے انتخاب پر فخر کرتے ہوں گے رکنیت کی ابتدائی دو سالہ میعاد پوری ہو گئی تو انہیں جنوری ۱۹۰۸ء میں مزید دو سال کے لئے رکن نامزد کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ مسلسل ۴ سال پنجاب کونسل کے ممبر رہے[۵] پھر انہیں مرکزی کونسل

---

۱ - J.M. Dowie ۲ Tupper ۳ Gordon ۴ Walker.

۵ پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۰۶ء سے جنوری ۱۹۰۸ء تک دوسری مرتبہ جنوری ۱۹۰۸ء سے جنوری ۱۹۱۰ء تک ملاحظہ ہو پنجاب ایڈمنسٹریشن رپورٹ بابت ۱۹۰۵ء ۱۹۰۶ء ۱۹۰۷ء ۱۹۰۸ء

میں لے لیا گیا۔

نہری آبادیاں

پنجاب میں نہری آبادیوں کا سلسلہ بہت پہلے جاری ہو چکا تھا۔ جہاں پہلے دور دُور تک بنجر اور بے آباد علاقے پڑے ہوئے تھے، وہاں پہلے چھوٹی چھوٹی منڈیوں کی بنیاد پڑی، جیسے جیسے زمینیں سیراب ہونے لگیں اور جنسیں کثیر مقدار میں پیدا ہوتی رہیں، منڈیوں کے آس پاس قصبے آباد ہو گئے اور ایسے شہر بن گئے، جنہیں آج پنجاب میں بہت بلند حیثیت حاصل ہے، مثلاً لائل پور جو آبادی کے لحاظ سے آج بھی مغربی پاکستان کا بہت بڑا بڑا شہر ہے اور تجارت، نیز صنعت و حرفت کے اعتبار سے وہ لاہور پر بھی فوقیت لے گیا ہے۔ آج کوئی شخص تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ جہاں لائل پور آباد ہے، وہاں ساٹھ ستّر سال پیشتر کسی چھوٹے سے گاؤں کا سراغ لگانا بھی مشکل تھا،

ابتدائی مشکلات

یقیناً پنجاب میں جفاکش کسانوں اور زمینداروں کی کبھی کمی نہ تھی، تاہم ابتدا میں بنجر زمینوں کو آباد کرنا سہل نہ تھا۔ نہریں جاری ہو گئیں اور دیہاتی آبادیوں کے لئے حلقے متعین کر دیئے گئے۔ اس سے آگے پورا کام زمینداروں کو انجام دینا تھا اور اس حالت میں کہ دور دور تک سائے کے لئے کوئی درخت بھی موجود نہ تھا۔ سنا جاتا ہے کہ زمیندار جہاں پہنچتے، سب سے پہلے جا بجا ارنڈ کے پودے لگا دیتے۔ وہ جلد سے جلد اتنے بڑھ جاتے کہ ایک دو آدمی ان کے سائے میں بیٹھ سکتے۔ پھر پانی کی بڑی دقّت تھی۔ نہری پانی کے سوا پینے اور کھانا پکانے کے لئے کوئی پانی نہ تھا، اور یہ

پانی خاصا گدلا ہوتا تھا عام لوگ ایسا کرتے کہ یہ پانی کسی برتن میں بھر لیتے، گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مٹی تہ میں بیٹھ جاتی تو پانی کام میں لایا جاتا، مگر وہ بھی ویسا صاف ستھرا اور نتھرا ہُوا نہ ہوتا جیسا پرانی آبادیوں کے کنوؤں کا تھا۔ مختلف آبادیوں میں زمینداروں نے خود مشقتیں اٹھا کر پانی پینے کے لئے کنوئیں تیار کرائے، لیکن ان کا پانی بہت گہرا اور کھاری تھا، زمینداران کنوؤں میں نہر کا پانی بھر کر انہیں بند کر دیتے اور چند دن کے بعد کھولتے تو کسی قدر بہتر پانی مل جاتا۔ قدم قدم پر زہریلے حشرات کا خطرہ لگا رہتا تھا اور نہر کے پانی کی باری رات کو بھی آ جاتی تھی۔

بہرحال ابتداء میں لوگ زیادہ تر مذبذب تھے، اس لئے حکومت کی روش میں فراخدلی نمایاں رہی، جب کچھ نہری آبادیاں ترقی کر گئیں اور عام لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی تو حکومت کی روش میں تبدیلی آ گئی اور آبادیوں کے سلسلے میں ایسی شرطیں تجویز ہونے لگیں، جو ابتدائی آبادکاروں کے لئے بہت سخت تھیں۔

نیا قانون

حکومت کی اسی بدلی ہوئی روش نے نئے قانون کی شکل اختیار کی، جو ۱۹۰۶ء میں منظور ہوا۔ ملک عمر حیات خاں نئے نئے ممبر بن کر آئے تھے، لیکن انہیں آبادکاروں کے حالات وجذبات سے براہ راست آگاہی تھی اور وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں سے ہمدردانہ برتاؤ صوبے کی آبادی کی خوشحالی اور خود حکومت کے مقاصد کیلئے کس درجہ مفید ہے۔ چنانچہ انہوں نے تنہا اس قانون کی مخالفت کی اور مخالفت اتنی مدلّل

تھی کہ کسی کے لئے اس پر حرف گیری کی گنجائش نہ رہی۔ تاہم قانون منظور ہو گیا اور اسے وائسرائے کی منظوری کے لئے بھیج دیا گیا۔ مگر وائسرائے نے منظوری نہ دی سوانحی خاکہ مظہر ہے کہ ملک عمر حیات خاں :۔

کونسل کے واحد رکن تھے، جنہوں نے استقامت سے نوآبادیوں کے مسودۂ قانون کی آخر تک مخالفت کی اور ثابت کر دیا کہ جو مقاصد حکومت کے پیشِ نظر ہیں، وہ قانون کے بغیر بھی پورے کرائے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسودۂ قانون کونسل میں منظور ہو گیا مگر وائسرائے نے اسے ویٹو کر دیا، اور ملک صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا، اس کے حوالے وقت کے وزیر ہند نے اپنی تقریروں میں دیئے،

قانون انتقالِ اراضی

اپنی رکنیت کی ابتدائی دو سالہ میعاد میں نوآبادیوں کے مسوّدہ قانون کے علاوہ ملک صاحب نے انتقال قانونِ اراضی میں مجوزہ ترمیمات کی پُرزور حمایت کی جس سے اصل قانون کے مقاصد کو تقویت پہنچتی تھی اور زراعت پیشہ طبقات کے مفاد کی حفاظت بہتر طریق پر ہو سکتی تھی، عموماً کہا جاتا تھا کہ قانون انتقالِ اراضی کی وجہ سے زراعت پیشہ طبقوں کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔ ملک صاحب نے اپنی تقریروں میں ثابت کر دیا کہ اس قسم کے دلائل بے سروپا ہیں، زراعت پیشہ طبقوں کی ساکھ پر اس قانون سے کوئی اثر نہ پڑے گا، بلکہ ان کا واحد ذریعہ معاش غیر زراعت پیشہ سرمایہ داروں کی دست برد سے محفوظ ہو جائے گا، اور یہ امر ملک قوم اور حکومت تینوں کی بہترین مصلحتوں

کے عین مطابق ہے۔

ترمیم شدہ مسودہ قانون "۲۱ فروری ۱۹۰۷ء کے اجلاس" میں گارڈن واکر نے پیش کیا تھا، اس کے حق میں تقریر کرتے ہوئے ملک صاحب نے فرمایا:۔

میں اپنی اس رائے پر مضبوطی سے قائم ہوں کہ یہ مسودہ قانون پنجاب کی زراعت پیشہ آبادی کو اصل قانونِ انتقالِ اراضی سے بھی زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔ ابتداً اس "قلیل التعداد لوگوں کو خطرہ تھا کہ قانونِ انتقالِ اراضی کامیاب نہ ہو سکے گا اور اس سے زمیندار کی ساکھ یا تو بالکل ختم ہو جائے گی یا بہت گھٹ جائے گی، لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ خطرے محض خیالی تھے۔ جن زمینوں کے مالک پشت ہا پشت سے زراعت پیشہ طبقے چلے آ رہے تھے، وہ بڑی تعداد میں ساہوکاروں کے نام منتقل ہو رہی تھیں۔ قانون کا مدعا یہ تھا کہ اس انتقال ملکیت کو جو تشویشناک صورت اختیار کر رہا تھا، روکا جائے۔ یہ مدعا عالیشان طریقے پر پورا ہو گیا ہے اور زمینداروں کی ساکھ میں کوئی کمی نہیں آئی، مگر اصل قانون میں ان لوگوں کے لئے دروازہ بند کر دینے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا، جن کا تعلق کبھی زراعت پیشہ طبقے سے نہیں تھا لیکن پہلے باقاعدہ بندوبست کے کاغذات میں انہوں نے اپنے آپ کو زراعت پیشہ درج کرا لیا تھا۔

اب اس خامی کا تدارک کیا جا رہا ہے اور یہ حد درجہ ضروری ہے کہ خامی دور کر دی جائے تاکہ قانون سے پوری طرح فائدہ حاصل ہو سکے مجھے یقین ہے کہ اس قانون کو تمام لوگ زمینداروں کے لئے ایک حقیقی نعمت تصوّر کرتے ہیں، میں منتخب کمیٹی کی روداد سے پوری طرح متفق ہوں اگرچہ میں اس کے اجلاسوں میں مجبوراً شریک نہ ہو سکا لیکن میں ابتداء ہی سے اس مسودۂ قانون کا حامی تھا۔ اور اب میں خوشی سے کہتا ہوں کہ یہ مسودہ قانون منظور کر لیا جائے۔

یہ سب کچھ اس صدی کے اوائل میں کیا گیا، جب قانون انتقال اراضی کے پورے لوازم عام لوگوں کے سامنے نہ تھے لیکن ملک عمر حیات خاں نے ۱۹۰۶ء میں جو کچھ فرمایا تھا وہ بیس پچیس سال بعد عملی صورت میں دنیا کے سامنے آ گیا۔ یہی قانون تھا جس نے زراعت پیشہ طبقوں کی جائدادیں مہاجنوں سے محفوظ کیں۔ پھر انجمن ہائے امداد باہمی کے باعث وہ طبقے سود خوار مہاجنوں کے چنگل سے آزاد ہوئے۔ زراعت پیشہ لوگ صوبے کی آبادی کا نوّے فی صد حصّہ تھے اور ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہی قانون تھا، جس کی وجہ سے ان لوگوں میں بیداری پیدا ہوئی اور اسی سے ان کی بہبود و ترقی کا آغاز ہوا۔

نو آبادیوں کا کمیشن

نو آبادیوں کے معاملے کی چھان بین کے لئے کمیشن مقرر ہوا تو ملک صاحب کو بھی اس کے روبرو پیش ہونے کی دعوت دی گئی۔ وہ خود زمیندار تھے۔ اپنے ہاتھوں آباد کاری کرا چکے تھے اور تمام دیہاتی طبقات سے براہ راست ان کے تعلقات تھے۔ نو آبادیوں کے متعلق جتنا علم انہیں تھا، اتنا غالباً کسی کو نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شہادت میں آباد کاروں کا نقطۂ نگاہ انتہائی خوش اسلوبی اور وضاحت سے پیش کیا اور کوئی ضروری نکتہ نہ چھوڑا۔ جو آباد کاروں کے جائز مطالبات سے تعلق رکھتا تھا۔

ملک صاحب کی یہ خصوصیت مدت العمر قائم رہی کہ جس معاملے کے متعلق سچائی اور حقانیت کا انہیں یقین ہو جاتا تھا، اسے کسی کے سامنے پیش کرتے وقت بھی متامل نہ ہوتے تھے پھر اپنا نقطۂ نگاہ صرف دلائل کی بنا پر پیش کرتے تھے، جذباتی رنگ کبھی اختیار نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حلقے میں ان کے خلوص کی قدر کی گئی اور اختلاف رائے کے باوجود ان کے متعلق احترام یا اعتماد میں کبھی کمی نہ آئی۔

آبیاری کا کمیشن

اسی طرح حکومت نے آبیاری کا کمیشن مقرر کیا تو اس نے بھی ملک عمر حیات خاں کے ذاتی تجربات سے فائدہ اٹھایا۔ ملک صاحب کی اپنی نہریں تھیں، جن سے ان کی زمینوں کے علاوہ آس پاس کے دیہات کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ پھر انہوں نے نہری آبادیوں میں بھی زمینیں لے لی تھیں۔ اس وجہ سے انہیں آبیاری کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ اس کمیشن کا صدر سکاٹ

مون کریفٹ تھا۔ ملک صاحب کی شہادت تمام پیشِ نظر مسائل کے متعلق بہت قیمتی اور پُر از معلومات سمجھی گئی۔

امیر افغانستان کی سیاحت

۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم والی افغانستان سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تو ان کی معیّت کے لئے جو اکابر چنے گئے، ان میں سب سے پہلا درجہ ملک عمر حیات خاں کا تھا۔ امیر حبیب اللہ خاں ہندوستان میں جہاں جہاں گئے ملک صاحب برابر ساتھ رہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بطور خاص قابل ذکر ہے کہ ایسی خدمات انجام دینے کے دوران میں ملک صاحب نے تمام مصارف خود برداشت کئے۔ وہ ایسے کاموں کو عام لوگوں کی طرح سرکاری خدمات سمجھ کر انجام نہیں دیتے تھے ہمیشہ یہی سمجھتے تھے کہ ملک وقوم کے ایک معزز فرد اور شہری کی حیثیت میں یہ سب کچھ ان کے واجبات کا ویسا ہی ایک حصّہ ہے، جیسا خود زندگی کے مختلف فرائض ادا کرنا۔ ہندوستان سے واپس جاتے وقت امیر افغانستان نے اپنا ذاتی ریوالور اور بیش قیمت سنہری گھڑی دونوں نشان دوستی کی حیثیت میں بطور یادگار ملک صاحب کو دیئے۔

شہزادہ ولیعہد کی آمد

۱۹۰۶ء میں شہزادہ ولیعہد نے ہندوستان کی سیاحت کی۔ چند سال بعد وہی مملکت برطانیہ کا شہنشاہ بنا رجارج پنجم)اس سیاحت کے دوران میں ملک عمر حیات خاں دو مرتبہ شہزادہ ولیعہد سے ملے۔ پہلی مرتبہ لاہور میں، دوسری مرتبہ علی گڑھ میں، جہاں شہزادہ ولیعہد کی آمد پر کھیلوں کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ دوسری اسلامی جمعیتوں

Scott Moncrieff

اور اداروں کی طرح ملک صاحب نے علی گڑھ سے بھی گہری وابستگی برابر قائم رکھی۔

پنجاب چیفس ایسوسی ایشن

اس دور کا ایک قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ روسار پنجاب میں ایک انجمن پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے نام سے بنانے کی تجویز تھی۔ ملک عمر حیات خاں کے ایک رفیق خاص کنور پرتاپ سنگھ اہلووالیہ تھے، جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے اور ملک صاحب نے مل کر اس انجمن کی داغ بیل ڈالی اور جلد ہی یہ ایک ممتاز انجمن بن گئی، جس میں صوبے کے تمام روسا شامل تھے۔ ملک عمر حیات خاں اس انجمن کی پہلی سیلیکٹ کمیٹی کے صدر تجویز ہوئے اور اس انجمن کے تمام کاموں میں برابر حصہ لیتے رہے۔

صوبائی لیجسلیٹو کونسل میں دو دو سال کی دو میعادیں پوری کرنے کے بعد ملک عمر حیات خاں کو مرکزی کونسل میں شامل کر لیا گیا جو منٹو مارلے کی اصلاحات کے مطابق نئے اصولوں پر مرتب ہوئی تھی۔

گیارھواں باب

مرکزی قانون ساز مجلسوں کی رکنیت

ہندوستان کی مرکزی مجلس میں

ملک عمر حیات خاں دو مرتبہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں خدمات انجام دینے کے بعد امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنا دیئے گئے، جس کا مرکز اس وقت تک کلکتہ میں تھا اور کلکتہ ہی اس زمانے میں ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات منظور ہوئی تھیں اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی حیثیت وہ نہ تھی جو بعد میں لیجسلیٹو اسمبلی بن جانے پر ہوئی۔ ملک صاحب نے اپنے پروگرام کے مطابق خدمتِ ملک اور خدمتِ قوم کا جو نقشہ تیار کر لیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی مستعدی سے کاربند رہے۔ جہاں

مناسب معلوم ہوا، حکومت کا ساتھ دیا۔ جہاں انھیں کوئی اہم قومی یا ملکی مسئلہ ایسا نظر آیا، جس میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کو سو فیصد درست ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا، انھوں نے نکتہ چینی یا اختلاف میں کبھی تامل نہ کیا۔ البتہ ہر معاملے کے متعلق ان کی رائے معلومات و دلائل پہ مبنی ہوتی تھی اور اختلاف و اتفاق دونوں میں ان کے الفاظ متوازن ہوتے تھے۔

پالیسی کے بنیادی اصول

ان کی پالیسی کے چند بنیادی اصول تھے، جن سے وہ عمر بھر کبھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ سرسید احمد خاں مرحوم اور بعض دوسرے اکابر کی طرح ملک عمر حیات خاں کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ اگر مسلمانوں اور پسماندہ قوموں کے تحفظ کے بغیر خود اختیاری حکومت یا آزادی کا مطالبہ کیا گیا تو ہندوؤں کے چند اونچے طبقات کے سوا کسی قوم کی حیثیت محفوظ نہ رہے گی۔ خصوصاً مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت میں مٹ جائیں گے۔ چنانچہ ملک صاحب نے صرف اس وقت تک حکومت سے تعاون ضروری سمجھا، جب تک مسلمانوں اور دوسری پسماندہ قوموں یا طبقوں کے تمام حقوق پوری طرح محفوظ نہ ہو جائیں۔ ان کا مسلک یہ نہ تھا کہ محض حکومت سے تعاون پہ زور دیا جائے، یا پسماندہ گروہوں اور طبقوں کی حفاظت کا سرسری اعلان کرا لیا جائے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، وہ برابر کوشاں رہے کہ پسماندہ طبقوں اور مسلمانوں کے حقوق تدریجاً محفوظ ہوتے جائیں تاکہ وہ اپنی حفاظت کی طرف سے مطمئن ہو کر آزاد حکومت کی ذمہ داریوں میں شریک ہو سکیں۔ وہ جانتے تھے اور محسوس کر رہے تھے

کہ یہ ذمہ داریاں جلد اہل ملک کے سر پر آ پڑیں گی۔ اور اس وقت سے پہلے وہ سب کچھ کر لینا چاہئے، جو ملت و قوم کی حیثیت بحال رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

آج کی فضا میں ان کے مسلک اور ان جیسے دوسرے اصحاب کے مسلک پر نکتہ چینی سہل ہے، کیونکہ اجنبی حکومت کا اقتدار حذف ہو چکا ہے اور وہ حالات کسی کے سامنے نہیں، جن میں ان بزرگوں نے انتہائی غور و فکر کے بعد مناسب پروگرام بنایا اور مدت العمر اس پر عمل پیرائی کے لئے کوشاں رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو دس بیس سال کے بعد مسلمانوں نے جو قدم اٹھائے ان کے ممکنات بالکل ختم ہو جاتے اور وہ سب کچھ کرنے کی گنجائش نہ رہتی جو بعد میں کیا گیا اور تحفظ کا نیا راستہ نکالا گیا۔

اصلاً ان کی پالیسی وہی تھی، جس پر مسلم لیگ ۱۹۳۵ء میں احیاء و تجدید کے بعد تک کاربند رہی، البتہ ملک عمر حیات خاں کی سرگرمیوں کے دور میں فضا اور ماحول کی کیفیت ۱۹۳۵ء یا اس کے بعد سے بالکل مختلف تھی۔ انہیں سرسید احمد خاں اور بعد کے زمانے کے درمیان عبوری دور کا ملکی و قومی کارکن قرار دیا جا سکتا ہے، جن کا تعلق سرسید سے زیادہ قریبی تھا، کیونکہ اس زمانے میں حالات بہت نازک تھے بعد کے دور سے زیادہ قریبی نہ تھا، جب گرد و پیش کے حالات میں غیر معمولی تغیر پیدا ہو چکا تھا۔

بیس سال کی خدمات

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں وہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۰ء تک رہے پھر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات آئیں تو وہ کونسل آف سٹیٹ

کے رکن منتخب ہوئے ۔ اس رکنیت پر وہ ۱۹۲۹ء تک فائز رہے ۔ ابھی ان کی میعاد ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۲۹ء میں انہیں انڈیا کونسل کا ممبر بنا دیا گیا ۔ پانچ سال انھوں نے لندن میں گذارے ۔ آخری پانچ سال کی کیفیت ایک جداگانہ باب میں پیش کی جائے گی ۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل اور کونسل آف سٹیٹ میں انہوں نے بیس سال گذارے ۔ یہ پورا دوران کی اصلاحی ، فلاحی اور تعمیری سرگرمیوں کا بہترین دور ہے ۔ اسی زمانے میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی ۔ مجلس وضع قوانین کے ارکان میں سے وہ پہلے شخص تھے ، جنہوں نے اپنی خدمات رضا کارانہ طریق پر جنگ کے لئے پیش کر دیں ۔ اور اس سلسلے میں جو مشقتیں اٹھائیں ، ان کی کیفیت الگ بیان ہو گی ۔ انہوں نے اس دوران میں یا جنگ کے متعلق دوسری خدمات کے سلسلے میں حکومت پر کسی قسم کا بار نہ ڈالا پورا خرچ خود برداشت کیا ، کیونکہ ان کے نزدیک قوم و وطن کی حفاظت کا تقاضا یہی تھا ۔ یہ ایسے امور ہیں ، جن کی مثالیں ہمارے ہاں بہت ہی کم ملیں گی ۔ پھر ان خدمات کا کوئی صلہ ذاتی طور پہ نہ لیا ۔ ان کی غرض صرف ایک تھی کہ قوم اور ملک کو فائدہ پہنچے ۔ بری اور بحری فوج میں ان ہندوستانی طبقوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق ملیں ، جو جنگی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے ۔ نیز ان طبقوں کو فائدہ پہنچے ، جو تعلیم و اقتصادیات میں پسماندہ تھے اور قانون ساز مجالس کے عام نمائندے ان طبقوں کی ترجمانی پہ یا تو قطعاً توجہ نہیں کرتے تھے یا محض سرسری طور پہ دو چار ہمدردانہ کلمے کہہ کر سمجھ لیتے تھے کہ فرض ادا ہو گیا ۔

ملک عمر حیات خاں کی تقریروں کا جو ریکارڈ ہمیں ملتا ہے ، اسے

پیشِ نظر رکھ لینے سے فوراً واضح ہو سکتا ہے کہ ان کی درد مندی اور جذبۂ خدمتِ عوام کی کیا کیفیت تھی۔

اہم امور و مسائل ان کی تقریروں میں جن امور و مسائل کا ذکر بار بار آتا رہا، ان کی اجمالی کیفیت ذیل میں درج ہے[1]

۱۔ مسلمانوں کے حقوق۔

۲۔ زمینداروں، خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی ترجمانی۔

۳۔ پنجاب کے حقوق کی ترجمانی۔

۴۔ فوج اور اس میں سب سے بڑھ کر سپاہیوں کے حقوق کی ترجمانی۔

۵۔ تعلیمی پسماندگی، عام تعلیم اور مذہبی تعلیم۔

۶۔ ریلوے میں تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کا اہتمام۔

۷۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق۔

۸۔ عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علیحدگی۔

۹۔ میثاق لکھنو۔

۱۰۔ فوج میں صحیح ملکی عناصر کے شمول پر زور دینے کے علاوہ اس امر پر زور کہ فوج کی صلاحیت میں اضافہ ہو اور وہ ہر خطرے کے مقابلے میں ملک کی حفاظت کر سکے۔

---

[1] (اس بارے میں تمام ضروری چیزیں آگے الگ الگ بیان ہوئی ہیں دیکھئے آئندہ ابواب کی فہرست)



کونسل آف سٹیٹ کے ممبر وائسرائے کے ساتھ ملک عمر حیات خاں ٹوانہ بیچ کی قطار میں
بائیں طرف سے ساتویں



انڈین امپیریل لیجسلیٹو کونسل ۱۹۱۰ء کے صدر (وائسرائے لارڈ منٹو) اور ممبر - ملک صاحب
بیچ کی قطار میں بائیں طرف سے آٹھویں



ملک صاحب نے شاھی نقیب کی حیثیت سے نئی دھلی میں ھندوستان کے دارالحکومت کا
سنگ بنیاد رکھنے کا حکم سنایا



لندن میں جارج پنجم کی تاجپوشی ۱۹۱۰ء کے موقعہ پر ہیمپٹن کورٹ کیمپ میں ملک صاحب نے ہندوستانی دستہ فوج کی قیادت کی - یہاں بادشاہ کے ساتھ وزیر جنگ لارڈ ہالڈین اور کمانڈر ان چیف لارڈ کچز موجود تھے -

ہم ان معاملات نیز دوسرے معاملات کے متعلق ان کے افکار و آرار الگ الگ تفصیل سے پیش کریں گے، تاکہ معلوم ہو جائے، وہ ملک کو کس راستے پر چلانا چاہتے تھے اور ان کے پیشِ نظر صحیح و پائدار ترقی کے کیسے کیسے نقشے تھے *

دارالحکومت کی منتقلی

ملک عمر حیات خاں ان لوگوں میں سے تھے، جو بہت پہلے سے دارالحکومت کے لئے کلکتہ کے بجائے دہلی کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے اور اس کے لئے وہ برابر کوشاں رہے، کیونکہ ان کے نزدیک

۱۔ کلکتہ مرکزی مقام نہ تھا، بلکہ ملک کے انتہائی مشرقی گوشے میں واقع تھا۔

۲۔ کلکتہ کے برعکس دہلی کو بہترین مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

۳۔ پھر کلکتہ کی کوئی سابقہ تاریخ نہ تھی۔ انگریزوں نے تجارتی مقاصد کے لئے کلکتہ کو مرکز تجویز کر لیا تھا۔ اس وقت ان کی سرگرمیاں زیادہ تر بنگال اور کرناٹک تک محدود تھیں۔ آہستہ آہستہ سلطنت پھیلی تو ساتھ ہی کلکتہ کی موزونیت بھی ختم ہو گئی۔

۴۔ دہلی زمانہ قدیم میں بھی بڑا مرکز مانا جاتا تھا اور اسلامی حکومت کے وقت میں تو تقریباً سات سو سال تک برابر پایۂ تخت رہا۔ اس طویل اور شاندار تاریخ نے اس شہر کو عظمت و احترام کا ایک خاص درجہ دے دیا تھا۔ نیز وہاں ہندوستان کے ہر حصے سے لوگ بہ آسانی پہنچ سکتے تھے۔

بہر حال یہ تجویز منظور ہوئی اور جارج پنجم نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان آکر تاجپوشی کا دربار منعقد کیا تو اس میں بعض دوسرے

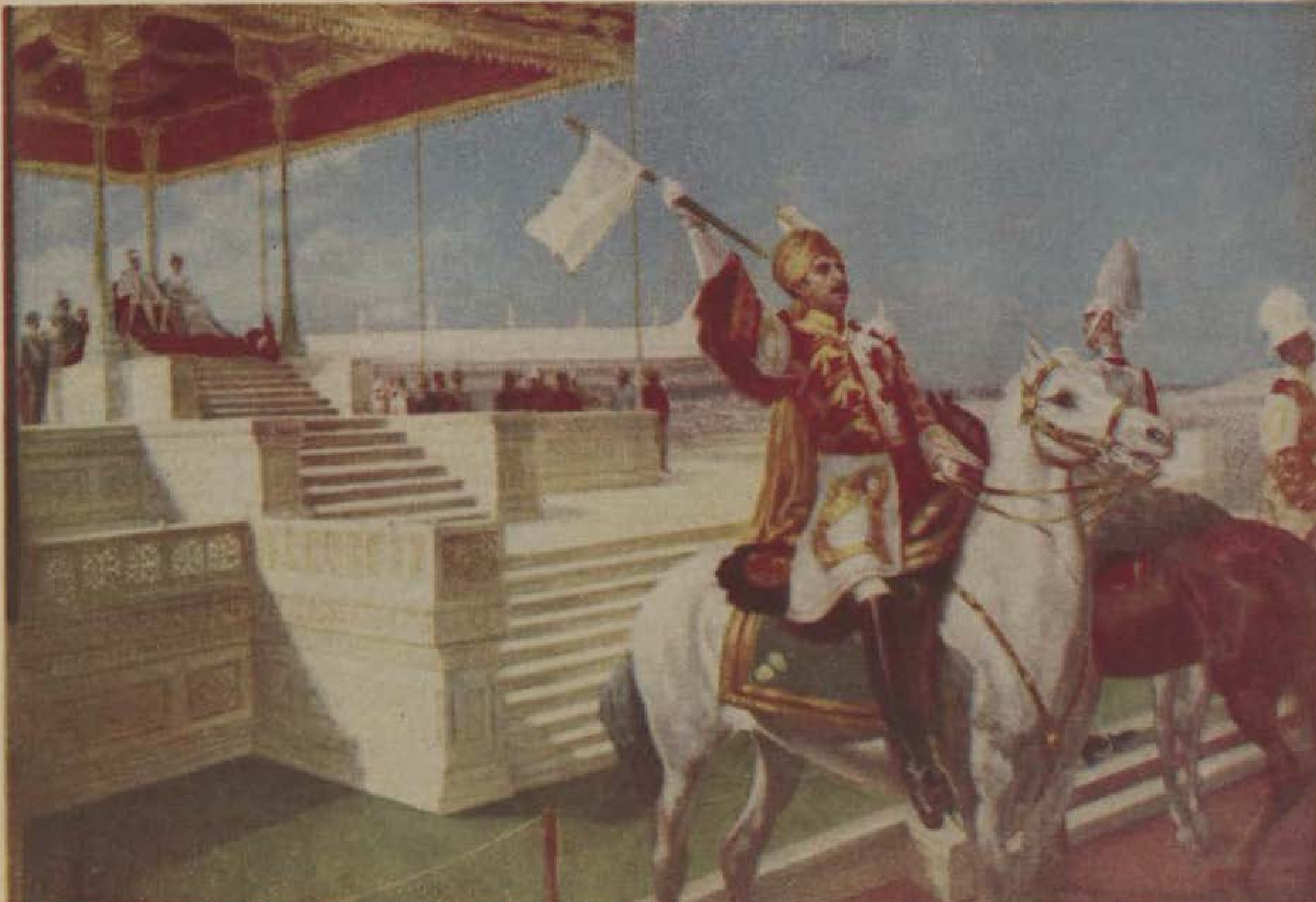
اعلانات کے علاوہ یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ دہلی ہی مرکزِ حکومت ہو گا۔

سنہ ۱۹۱۱ء کا دربار اور ملک عمر حیات خاں کا اعزاز

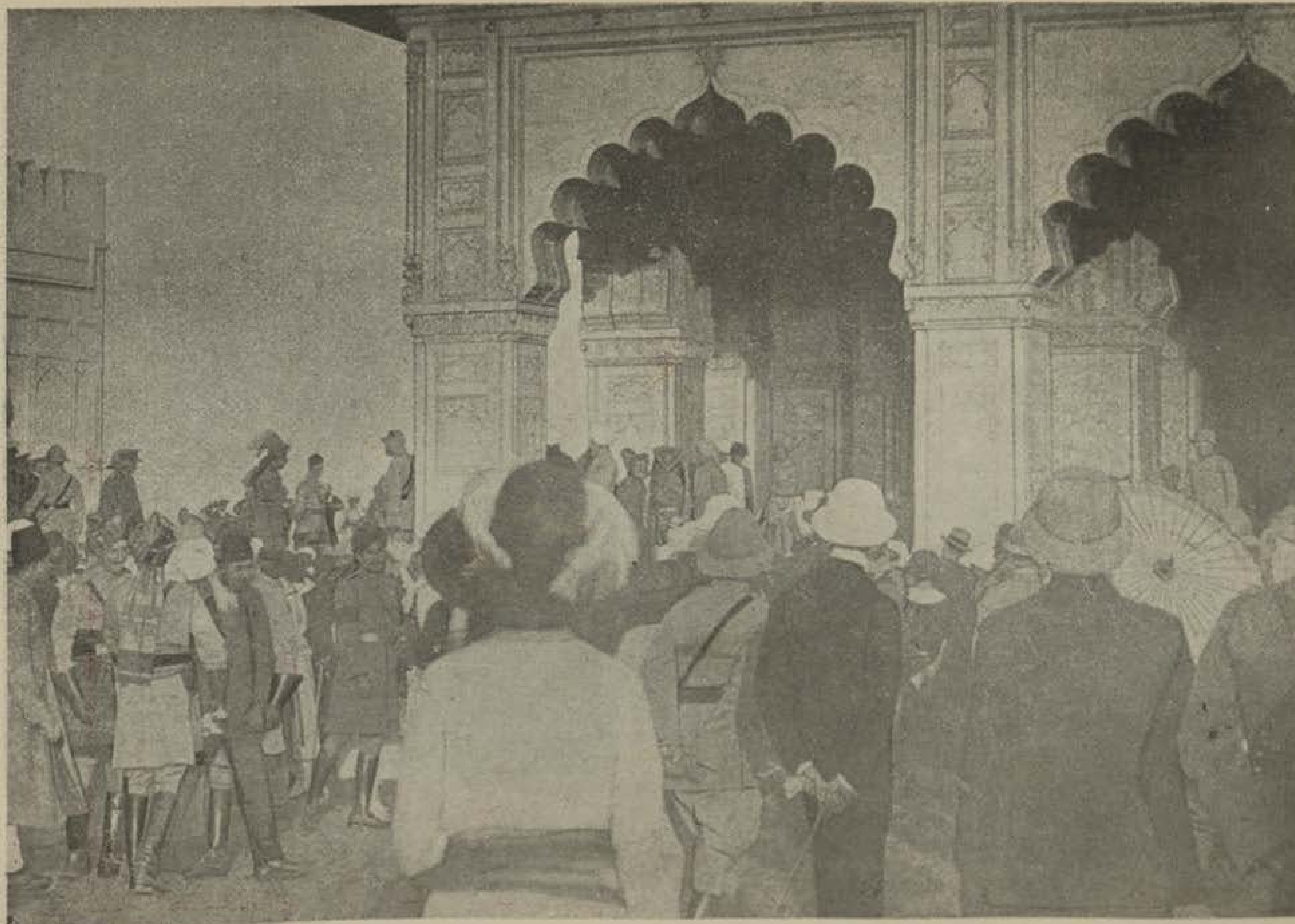
بادشاہ کی آمد پر مختلف لوگوں کو حکومت کی طرف سے مختلف اعزازات دیئے گئے ملک عمر حیات خاں کو جو اعزاز ملا، وہ ایسا تھا جو نہ ان سے پہلے کسی ہندوستانی کو ملا تھا اور نہ ان کے بعد کسی کو ملا، یعنی انھیں اس موقع پہ بادشاہ کا ڈپٹی ہیرلڈ (نائب نقیب شاہی) بنایا گیا۔ یہ انتہائی اعتماد کا منصب تھا، جو کسی ہندوستانی کو مل سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں بادشاہ کی تقریر کا اردو ترجمہ بڑی خوش اسلوبی سے سنایا۔

جب لارڈ ہارڈنگ کلکتہ سے منتقل ہو کر دہلی آئے تو اس موقع پر بھی ملک عمر حیات خاں جلوس میں شریک تھے، اس موقع پہ ایک بنگالی دہشت پسند راش بہاری بوس نے لارڈ ہارڈنگ پہ بم پھینکا تھا۔

اب ہم سب سے پہلے پہلی عالمی جنگ میں ملک صاحب کی شرکت اور کارناموں کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ پھر ترتیب کے ساتھ ان کی آئینی سرگرمیوں پہ روشنی ڈالیں گے جو انہوں نے مرکزی قانون ساز مجلسوں میں بیس سال تک جاری رکھیں اور تمام سرگرمیوں کے لئے ان کی تقریروں سے اقتباسات دیں گے تاکہ حقیقی کیفیت خود ان کی زبان سے واضح ہو جائے۔



دربار دھلی (۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر شاھی ھیرلڈ کی وردی میں جارج پنجم کی بہ حیثیت شہنشاہ ھند تاجپوشی کا اعلان کر رہے ھیں۔



لال قلعہ دھلی کے دیوان خاص میں ایک پارٹی کا منظر جہاں فوجیوں اور فوجی اقوام کی جانب سے ملک صاحب نے
پرنس آف ویلز (بعد میں ایڈورڈ هشتم) کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے

بارھواں باب

پہلی عالمی جنگ اور جنگ افغانستان

تباہی خیز کشمکش اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ کے اندر وہ جنگ چھڑ گئی، جو دور حاضر کی پہلی عالمی جنگ تھی، کیونکہ اس میں تقریباً ہر براعظم کے مختلف علاقوں نے حصہ لیا اور اس کی تباہ کاریاں اس پیمانے پر پہنچ گئیں کہ عہد گذشتہ کی کوئی بڑی سے بڑی جنگ ہی نہیں، بلکہ اکثر جنگیں مل کر بھی ان کی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔ یہ تقریباً سوا چار سال جاری رہی۔ اس میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد مقتول اور دو کروڑ کے قریب مجروح ہوئے۔ پھر اسی کی وجہ سے دنیا بھر میں انفلوانزا وبائی شکل اختیار کر گیا۔ جس میں مزید ایک کروڑ افراد جان بحق ہو

گئے - اس کے مالی نقصانات کا اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ جنگ میں جتنا روپیہ صرف ہوا، اس سے فرانس اور بلجیم کی پوری آبادیوں کے لئے وہ سب کچھ خریدا جا سکتا تھا جو ان کے پاس تھا۔ پھر اس کے اثرات و نتائجُ مدت مدید تک یورپ اور دوسرے ملکوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے، بلکہ دوسری عالمی جنگ بھی اسی پہلی جنگ ہی کا ایک نہایت خوفناک نتیجہ تھی۔

مشہور مثل ہے: فلک شرّے بر انگیزد کہ خیر مادر آں باشد۔ یہ جنگ اس کہاوت کی معجز نما مثال تھی۔ یورپ کی قوت اس پیمانے پر پہنچ چکی تھی کہ اس نے دنیا کے بہت بڑے حصّے کو اپنے اقتدار کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا اور ان سے مخلصی کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس جنگ نے یورپ کی قوّت پر ایسی کاری ضرب لگائی، جس کے بعد وہ سنبھل نہ سکا۔ کم از کم اس کا اقتدار بڑی حد تک ماضی کا ایک افسانہ بن گیا۔ جو نظام یورپ نے بڑی محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا، اس کا کھوکھلا پن دنیا بھر پر آشکارا ہو گیا۔ علامہ اقبال نے سنہ ۱۹۰۸ء میں اہل یورپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

یہ پیش گوئی چھ سال بعد حرف بحرف پوری ہوئی۔ یورپ نے جو خنجر دنیا کو ذبح کرنے کے لئے خاص اہتمام سے تیار کیا تھا اسے خود اپنے سینے میں بھونک لیا اور اس کا اقتدار خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ اس جنگ کا ایک نہایت خوشگوار پہلو تھا۔

جنگ کے اسباب اور ابتداء

جنگ کے اسباب کسی تفصیل کے محتاج نہیں۔ یورپ کی بڑی قوتوں میں رقابت کی آگ مدت سے سلگ رہی تھی اور ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا کہ یہ اچانک بھڑک اٹھے گی اور گردوپیش کو دور دور تک اپنے اشتعال کا تختۂ مشق بنائے گی۔ فوری سبب یہ ہوا کہ سرویا کے چند سرپھرے سیاسی کارکنوں نے آسٹریا کے ولیعہد کو سرویا کے ایک مقام سراجیو میں قتل کر دیا۔ آسٹریا نے سرویا کو الٹی میٹم دے دیا۔ جرمنی نے آسٹریا کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ فرانس، روس اور برطانیہ سرویا کے پاسدار بن گئے۔ یوں ولیعہد کے قتل کا معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ آسٹریا نے سرویا پر حملہ کر دیا۔ روس نے سرویا کی حمایت میں آسٹریا کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ جرمنی آسٹریا کی حمایت کے لئے آ گیا۔ فرانس و برطانیہ روس اور سرویا کا حق رفاقت ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ پھر جرمنی نے فرانس پر حملے کے لئے بلجیم سے جبراً راستہ لینا چاہا تو برطانیہ کے لئے بلجیم کی امداد ناگزیر ہو گئی۔ آگے چل کر ترکی اور بلغاریہ وسط یورپ کی طاقتوں، یعنی جرمنی و آسٹریا کے ساتھ ہو گئے۔ اٹلی نے، جو حقیقت میں جرمنی و آسٹریا کا حلیف تھا، اپنا مفاد اسی میں دیکھا کہ روس، برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دے۔

یہ اس لڑائی کی سرسری کیفیت تھی، جس کے محاذ سمندروں کے علاوہ فرانس، بلجیم، روس، بلقان، عراق، شام، حجاز وغیرہ میں بنے۔ جاپان نے جنگ میں کوئی خاص حصّہ نہ لیا، تاہم وہ اتحادیوں یعنی برطانیہ و فرانس کا ساتھی تھا۔ جنگ کے آخری دور

میں امریکہ نے جرمنی کے خلاف اتحادیوں کی رفاقت اختیار کر لی ؛

اختلافِ رائے

اس وقت ہندوستان میں رائیں مختلف تھیں ایک گروہ کہتا تھا کہ یہ سامراجی قوتوں کی جنگ ہے۔ وہ ایک دوسرے کو تباہ کر رہی ہیں اور ہمیں اس تباہی سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیئے۔ دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ انگریز ہم پر مسلط ہیں اور ان کا تسلط کسی بھی قوت سے ٹوٹے، ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ جذبہ صرف انگریزی تسلط کی شدید مخالفت کا کرشمہ تھا اور اس میں تعمیری نقطۂ نگاہ سے ملک کے مستقبل کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا تھا۔ ایک گروہ کی رائے تھی کہ ہمیں ہر حال میں انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیئے، کیونکہ ان سے ہم شناسا ہیں اور محکومی کا ابتدائی دور گزار کر ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں، جہاں سے خاصے حقوق حاصل ہونے لگے ہیں۔ اگر اس مرحلے پر جرمنی جیسی کوئی قوت کامیاب ہو کر یہاں پہنچ گئی تو ہماری سیاسی زندگی دوبارہ اس مقام سے شروع ہو گی، جہاں ہم انگریزی تسلط کے آغاز میں تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جرمنی از سرِ نو ہمارے وسائل سے فائدہ اٹھا کر زمانہ جنگ کے نقصانات کی تلافی پر آمادہ ہو جائے اور ہمارے لئے آزادی کی منزل مزید سو دو سو سال کے لئے دور چلی جائے۔ چنانچہ خاصے بڑے طبقے نے اسی آخری رائے پر عمل کیا اور جن لوگوں نے انگریزوں کی اعانت کے لئے اپنی خدمات بے تکلف پیش کر دیں، ان میں ایک ملک عمر حیات خاں بھی تھے اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ارکان میں سے انھوں نے رضاکارانہ خدمات

کے لئے سب پر سبقت حاصل کر لی۔

ملک صاحب کی حیثیت

ملک صاحب اپنے حلقے کے دولتمند امرا میں شامل تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ایک خوفناک جنگ کے خطرے میں ڈالتے۔ سب پر آشکارا ہو چکا تھا کہ جرمنی کی ابتدائی ترکتاز بڑی ہی خوفناک تھی، کیونکہ اس نے مدت سے جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اتحادیوں میں سے کسی کو بھی تیاریوں میں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو جرمنی کو حاصل تھا۔ انگریزی فوج کی تعداد بھی کم تھی اور سازو سامان بھی معمولی تھا۔ فرانسیسی فوج کے متعلق بہت کچھ سنا جاتا تھا، لیکن میدانِ جنگ میں تجربہ کیا گیا تو ثابت ہوا، نہ فوج تعداد میں اتنی ہے کہ جرمنی سے عہدہ برآ ہو سکے، نہ سازو سامان پورا ہے اور نہ فوجیوں میں اتنی جنگی صلاحیت ہے کہ جم کر لڑ سکیں اور دشمن کی پیش قدمی کو روک سکیں۔

ان حالات میں رضا کارانہ خدمات پیش کرنا صریح خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن ملک عمر حیات خاں نے جس مسلک کو اپنے اندازے کے مطابق قوم و ملک کے لئے مفید اور ضروری سمجھا، اسے بے توقف اختیار کر لیا اور پہلے کی طرح وہ کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہ لائے۔ یہی ان کی مدت العمر کی خصوصیت تھی اور اسی پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔ وہ یہاں بھرتی میں امداد دے کر بھی اعلیٰ پیمانے پر فرضِ اعانت سے سبکدوش ہو سکتے تھے، مگر انہوں نے ہمیشہ بہترین طریق کار اختیار کیا۔ خود ذاتی خرچ پر رفیقوں کے ساتھ فرانس چلے گئے اور یہاں اپنے تمام کارکنوں کو بھرتی کے کام پر لگا گئے۔

جنگی خدمات ملک عمر حیات خاں جس جہاز میں فرانس گئے تھے، اس کے لیئے ہر وقت اندیشہ تھا کہ ممکن ہے، دشمن کا کوئی پھرتا پھراتا جنگی جہاز اچانک نکل آئے اور تارپیڈو مار کر تباہ کر دے اور معلوم ہے کہ جرمنی کے اکا دکا جنگی جہاز جابجا پھر رہے تھے۔ایک جہاز ایمڈن نے چین سے نکل کر جابجا تباہی پھیلائی تھی اور ہندوستان کے بعض مقامات پر گولہ باری بھی کی تھی۔پھر اس زمانے میں مشینی دستے تیار نہیں ہوئے تھے، بلکہ رسالوں سے کام لیا جاتا تھا۔ ملک صاحب فیروز پور بریگیڈ کے سٹاف میں شامل ہوئے تھے، جو لاہور ڈویژن کا ہراول تھا۔جس جہاز میں وہ گئے تھے، اس میں گھوڑے بھی بکثرت سوار تھے اور سوء اتفاق سے گھوڑے کے معالجوں کا عملہ کم تھا، اس لیئے اس جہاز یا بعض دوسرے جہازوں کے ساتھ کوئی سند یافتہ معالج نہ بھیجا گیا۔راستے میں ملک صاحب کو اس کمی کا علم ہوا تو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ خود گھوڑوں کے بہت بڑے سٹڈ کے مالک تھے اور ان کے معالجات کی باقاعدہ تربیت پا چکے تھے۔ پھر اپنے گھوڑوں کی دیکھ بھال میں انہیں خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔چنانچہ انہوں نے گھوڑوں کے چارے کو اپنے سامنے گرد اور مٹی سے صاف کرایا اور جو گھوڑا بیمار ہوتا رہا، اس کا علاج خود کرتے رہے یہی ایک جہاز تھا جس کے تمام گھوڑے صحیح سلامت منزل مقصود پر پہنچے ۔ دوسرے جہازوں کے بعض گھوڑے مناسب انتظامات نہ ہونے کے باعث راستے ہی میں مر گئے۔

میدان جنگ ملک صاحب کے فرانس پہنچنے تک جرمن فوجیں



ایام جنگ میں اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کی مثال ۔ ملک صاحب خود اپنے گھوڑے کی مالش کر رہے ہیں ۔



انگلستان کی سخت سردی ملک صاحب کے لئے جانوروں کی دیکھ بھال
میں مالغ نہ ہوتی تھی۔

بلجیم کو پامال کرتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھیں اور جو پینسٹھ ہزار برطانوی فوج مونز[1] کے محاذ پر تھی، وہ اپنی بائیں جانب کی فرانسیسی فوج کی پسپائی کے باعث پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی تھی اور اس محاذ کی حالت خاصی خطرناک تھی۔ یہی محاذ تھا جس پر ملک صاحب کے بریگیڈ کو بھیجا گیا۔ چنانچہ انھیں وہ سب پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں، جو جرمن افواج کے ابتدائی کامیاب اقدامات کے باعث برطانوی اور فرانسیسی افواج کو پیش آئی تھیں، لیکن انھوں نے کبھی شکایت نہ کی اور برابر مدافعت کا کام جاری رکھا۔ غالباً یہی افراتفری کا دور تھا، جب ایک مقام پر دشمن کی گولہ باری شروع ہوئی اور گھوڑوں کے مرکز پر گولے پھٹنے لگے۔ ملک صاحب ہر خطرے سے بے پرواہ ہو کر فوراً موقع پر پہنچے۔ ہمراہیوں کو ساتھ دینے پر آمادہ کیا تاکہ تمام گھوڑوں کو محفوظ طریق پر نکال کر دوسری جگہ پہنچا دیں۔ پھر خطرے کے اس حلقے میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک چھکڑا گھاس سے بھرا کھڑا تھا۔ ملک صاحب اس کے پاس تھے۔ یکایک ایک گولہ وہاں آ گرا اور صرف چھکڑے کی اوٹ کے باعث ملک صاحب کی جان بچ گئی۔

اسی زمانے میں انہوں نے ایک مقام پر زخمی فرانسیسی راہنماؤں کو نکال کر محفوظ مقام پر پہنچایا۔ جنگی رودادوں میں جوانمردی کے ان واقعات کا تحسین آمیز ذکر موجود ہے اس شاندار خدمت کی بدولت انھیں مونس سٹار[2] کا تمغہ ملا، جو

---

[1] Mons، بلجیم کا مشہور قصبہ جو برسلز سے اڑتیس میل کے فاصلے پر ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں یہاں زبردست لڑائی ہوئی۔
[2] Mons Star

اس خطرناک جنگ میں شرکت کا بہت قابل قدر نشان سمجھا جاتا تھا۔

ادائے فرض کی نادر مثال

اس وقت تک فوجوں کے لئے حفاظت یا ضروری سرد سامان کے انتظامات بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔ لڑائی عموماً خندقوں میں بیٹھ کر ہوتی تھی۔ جب سردی کا موسم آیا اور برف گرنے لگی تو فوج کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اسی زمانے میں ملک عمر حیات خاں کے پاؤں کو برفباری کے باعث نقصان پہنچا انھیں علاج کے لئے لندن بھیجنے پر اصرار کیا گیا، مگر انہوں نے خطرناک موقع پر میدان چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا اور تکلیف ہی کی حالت میں فرائض انجام دیتے رہے۔

جب ڈاکٹروں نے ان کے لئے لندن جانا حددرجہ ضروری قرار دیا تو وہ علاج کی غرض سے گئے۔ بیماری کے زمانے میں بھی جنگی منصوبے تیار کرتے رہے اور اس کے سوا انھیں کسی مشغلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر یہی زمانہ ہے، جب وہ ہندوستانی سپاہیوں کے لئے اچھے راشن اور دوسرے حفاظتی انتظامات کی اصلاح پر زور دیتے رہے گویا ان کا مقصد یہ تھا کہ جس حد تک سامانِ رسد اور بود و باش کا تعلق ہے ہندوستانی سپاہیوں کو انگریز سپاہیوں کی برابری حاصل رہنی چاہئے۔

پندرہ مہینے کی مسلسل خدمات کے بعد وہ از روئے قاعدہ رخصت کے حقدار تھے۔ چنانچہ انھیں رخصت پر ہندوستان بھیجنے کی پیشکش کی گئی، مگر انھوں نے اس قاعدے سے فائدہ نہ اٹھایا اور کہہ دیا کہ جب تک میرا بریگیڈ فرانس میں ہے، میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔ پھر ان کی بیگم سخت بیمار ہو گئیں



پہلی عالمی جنگ میں ہندوستانی فوج کا دستہ مارسیلز میں داخل ہوا
(۱۹۱۳ء) تو ملک صاحب اپنے گھوڑے "امیر" پر اس کی کمان
کر رہے تھے - ایک فرانسیسی مصور نے آپ کی یہ تصویر
بنا کر آپ کو بطور تحفہ پیش کی -



فرانس میں مانس کی جنگ (۱۹۱۴ء) کے وقت کیپٹن کی وردی میں

یہاں تک کہ اپریشن کی ضرورت پیش آئی اور ان کے اکلوتے فرزند کی صحت بھی بہت خراب ہو گئی، مگر ملک صاحب نے اپنے قومی و ملکی فرائض کو ہر ضرورت پر مقدم رکھا۔

انگلستان میں افواج کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کی ایک کمیٹی بنی تھی۔ ملک صاحب نے اس میں شریک ہو کر ہندوستانی سپاہیوں کی تمام ضرورتیں بہ طریق احسن پیش کیں۔ اور ان کے لئے تمام ضروری انتظامات جلد سے جلد کرا دیئے۔

ایک اور واقعہ بہ طور خاص قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ انھیں ڈویژن کے سٹاف میں زیادہ بلند منصب دیا گیا تھا، مگر انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے بریگیڈ کے ساتھ خط آتشباری پر پورا وقت گذاریں۔

ملک صاحب عراق میں

جب عراق میں نیا محاذ قائم ہو گیا تو ملک صاحب کے بریگیڈ کو وہاں جانے کا حکم دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ فرانس سے عراق روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان کے لئے دشمن کے جہاز نے خطرہ پیدا کر دیا۔ ان سے آگے جو جہاز آ رہا تھا، اس پر تارپیڈو پھینکا گیا اور وہ جہاز ڈوب گیا لیکن ملک صاحب کا جہاز بہ خیر و سلامت منزل مقصود پہ پہنچ گیا۔ عراق میں جتنے ابتدائی اقدامات ہوئے، ملک صاحب ان میں شریک رہے۔ جب جنگ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تو وہ رخصت لے کر ہندوستان چلے آئے اس وقت تک انھیں وطن سے باہر گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ وہ واپس آئے تو ارادہ تھا کہ زیادہ رخصت لے کر

اپنے بعض معاملات کا انتظام کرلیں جو ان کی غیر حاضری میں خاص توجہ کے محتاج ہو گئے تھے۔ لیکن یکایک عراق میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ انھیں جلد واپس جانے کے لئے کہا گیا، چنانچہ وہ اپنی رخصت ختم کر کے پھر روانہ ہو گئے۔ بصرہ پہنچ کر ان کے تمام ملازموں کو بخار ہونے لگا۔ اور دس میں سے نو ملازم صاحب فراش ہو گئے۔ ملک صاحب نے بدستور اپنا کام جاری رکھا۔ فوجیوں کے ایک ایک طبقے سے ملے۔ ان کی ضروریات کا مناسب انتظام کرایا۔ ان کی بعض غلط فہمیاں دور کیں۔ اس دوران میں وہ مختلف مقامات پر گئے اور مقامی شیوخ و امرا سے بھی ملے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایک موقع پر سپاہیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا:

> "میں نے سپاہیوں کو کبھی ایسا کام نہیں کہا، جسے خود کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ میں بارہا بم باری کے مقامات پر پہنچا اور پھٹتے ہوئے گولوں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہا۔ زندگی میں جہاں کہیں اور جس عہدے پر بھی رہا سپاہیوں کی بہبود کے لئے برابر کوششیں جاری رکھیں... مجھے جب موقع ملا، ہندوستانی سپاہیوں کے مقاصد و مفاد کو بالادست فوجی یا ملکی حکام کے سامنے پیش کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کی۔"

ملک کے اندر جنگی خدمات

ملک صاحب قط العمارہ کی لڑائی کے ابتدائی دور میں بھی شریک تھے۔ وہی تھے جنہوں نے مسلمان مقتولین کے لئے جنازوں اور غیر مسلم مقتولین کے لئے آرتھیوں کا انتظام کیا۔ پھر وہ اتنے بیمار ہو گئے کہ جنگ میں کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہے۔ ان کے گھٹنے سوج گئے تھے اور ایکس رے کے ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی ہڈی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ وہ واپس آئے یہاں پہنچ کر دوران جنگ میں بھرتی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے دسیلع رقمیں خرچ کیں اپنے تمام ملازموں کو جیب سے تنخواہ دیتے رہے اور کسی فوجی خدمت کے لئے کوئی مشاہرہ قبول نہ کیا۔ آخر ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ ختم ہوئی اور جگہ جگہ قیام امن پر خوشیاں منائی گئیں +

جنگ افغانستان

صلح و امن پر مسرت و شادمانی کے مظاہروں سے پوری طرح فراغت نہیں ہوئی تھی کہ یکایک افغانستان میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی۔ امیر حبیب اللہ خاں نغمان کے قریب کلہ گوش میں شکار کھیل رہے تھے۔ رات کو اطمینان سے خیمے میں سوئے۔ صبح دیکھا گیا کہ کسی نے گولی مار کر انہیں ہلاک کر دیا لیکن کسی نے بھی گولی کی آواز نہ سنی۔ شہزادہ عنایت اللہ خاں ولیعہد تھے۔ عام حالات میں وہی تخت نشین ہوتے، مگر نزاکت وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ مرحوم امیر

کے بھائی نصر اللہ خاں کو مسند پر بٹھایا جائے، چنانچہ جو درباری اور فوجی امیر مرحوم کے ساتھ تھے، انہوں نے نیز شہزادہ ولیعہد نے نصر اللہ خاں ہی کو امیر بنا لیا۔

ادھر کابل میں امیر حبیب اللہ خاں کے تیسرے بیٹے شہزادہ امان اللہ خاں گورنر تھے۔ انھوں نے وہاں اپنے لئے بیعت کا انتظام کر لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں امیر نصر اللہ خاں کے حامیوں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ کیونکہ اکثر لوگوں نے کابل جاکر امان اللہ خاں کی بیعت کر لی۔ آخر امیر نصر اللہ خاں کو بھی امارت کے دعوے سے دستبردار ہونا پڑا اور وہ کابل چلے گئے، جہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی ہی میں وفات پائی ؛

امیر بنتے ہی امان اللہ خاں کا پہلا قدم یہ تھا کہ افغانستان کو تعلقات خارجہ میں آزادی دلائے۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کے سامنے یہی مطالبہ پیش کر دیا اور اسی وجہ سے باہم کشمکش پیدا ہوئی، کیونکہ انگریز بڑی جنگ میں کامیابی حاصل کر چکنے کے بعد کسی بھی قوم کے جائز حقوق کے اعتراف پر آمادہ نہ تھے۔ اس جنگ کو افغانستان کی تیسری جنگ کہتے ہیں ؛

تین بڑے محاذ تیسری جنگ افغانستان کے تین بڑے محاذ تھے ایک خیبر کے سامنے ڈکہ کا محاذ، دوسرا تھل اور کرم کا محاذ، تیسرا چمن و قندھار کا محاذ۔ جنگ کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں، البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ڈکہ اور چمن کے محاذ

پر جو افغانی فوجیں تھیں، وہ کارروائی کا کوئی بہتر مظاہرہ نہ کر سکیں اور دونوں مقامات پر انھیں پیچھے ہٹنا پڑا، لیکن تھل کے محاذ پر نادر خاں مرحوم اور ان کے بھائیوں نے اتنی مردانگی اور عزم و حکمت سے جنگ کی کہ انگریزی فوج نے شکست کھائی اور اسے پسپا ہونا پڑا۔ یہی شکست صلح کا باعث ہوئی فریقین نے ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے چھوڑ دیئے۔ افغانستان کی خارجہ پالیسی آزاد ہو گئی اور اس وقت سے وسط ایشیا کے اس ملک کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوا۔ افغانستان کا استقلال نادر خاں کی ہمّت کا کرشمہ تھا۔ چنانچہ کابل میں جنگ کی یادگار کے طور پر استقلال کے نام سے جو مینار بنایا گیا) اس میں نادر خاں کے اس کارنامے کا واضح ذکر کیا گیا۔

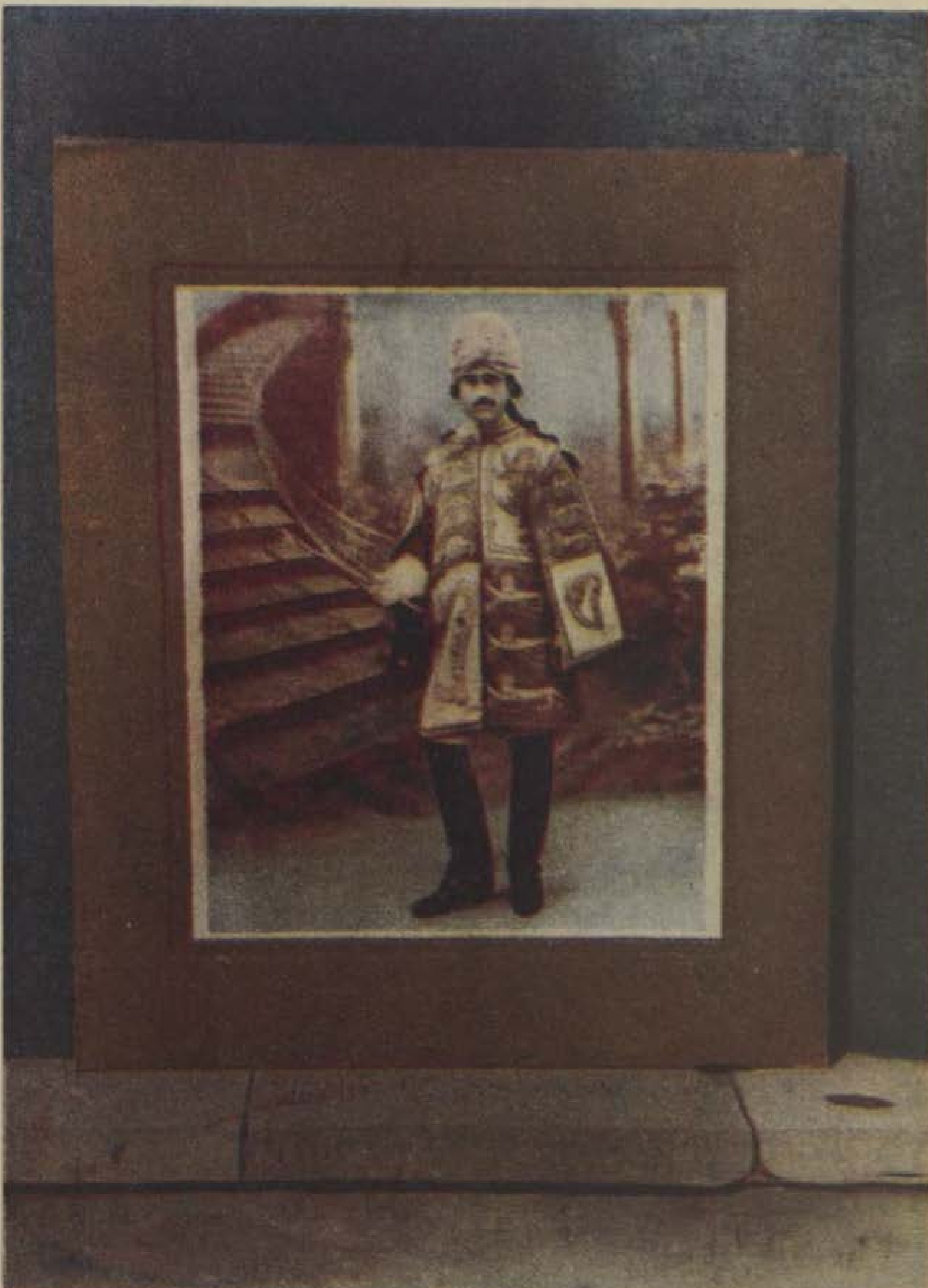
ملک عمر حیات خاں

پہلی لڑائیوں کی طرح اس لڑائی میں بھی ملک عمر حیات خاں نے صرف اپنی خدمات پیش نہ کیں بلکہ ان کے اکلوتے فرزند نے بھی اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور جب تک لڑائی جاری رہی، وہ خیبر کے محاذ پر ٹھہرے رہے۔ پشاور ان کا جنگی مستقر تھا۔ اس زمانے کے متعلق ملک غلام محمد بیرسٹرایٹ لا بعض بڑی دلچسپ حکایتیں سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی جنگ میں ملک صاحب کے وسیع فارسی مطالعے اور غیر معمولی حافظے کے تجربے ہوئے۔ مثلاً ایک روز گرمی تیز تھی۔ دوپہر کے وقت خس کی ٹٹیاں چھوڑ دی گئی تھیں اور ہوا چل رہی تھی ملک صاحب ایک کمرے سے نکل کر برآمدے میں سے ہوتے ہوئے دوسرے کمرے میں گئے۔ عین اسی وقت میں اپنے

کمرے سے باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی میر صیدی کا شعر پڑھا جو اس نے جہاں آرا بیگم کے لئے لکھا تھا:

برقع بہ رخ انگندہ برد سیر بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

جنگ تقریباً تین مہینے جاری رہی۔ ۳۰۔ مئی ۱۹۱۹ء کو شروع ہوئی تھی اور ۸ر اگست ۱۹۱۹ء کو صلحنامے پر دستخط ہو گئے۔



ملک صاحب شاہی نقیب کی وردی میں



جنرل عمر حیات خاں هیرلڈ کی حیثیت میں انگریزی اور هندوستانی فوج کے bugleer
(اعلان کنندوں) کے نمائندوں کے ساتھ

تیرھواں باب

اسلامی مسائل

تمہید اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک معاملے کے متعلق ملک عمر حیات خاں کے افکار خود ان کی تقریروں سے مرتب کئے جائیں، تاکہ اندازہ ہو سکے، وہ کس روش و نہج پر کار بند رہے اور ملک کے مختلف ملی، مذہبی، عمرانی، تعلیمی اور دوسرے معاملات کے باب میں ان کا اصولی نقطۂ نگاہ کیا تھا، ان کی یہ خصوصیت کسی بحث و تشریح کی محتاج نہیں کہ جو کچھ ان کے خیال میں ضروری تھا بے خوف لومۃ لائم اسے پیش کر دیتے تھے۔ کبھی اس بات کی پرواہ نہ کی کہ سننے والے ان کی باتیں سن کر ان کے متعلق کیا رائے قائم کرینگے۔ وہ عمر بھر اس مشہور اصول پر کار بند رہے "آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ

چہ باک، ممکن ہے ایک یا زیادہ معاملات میں مجھے یا آپ کو ان کی رائے سے اختلاف ہو، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوئی رائے بلا دلیل قائم کر لیتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ رائے قائم کرتے وقت خاص مصلحتیں ان کے پیش نظر رہتی تھیں حالانکہ رائے کے سلسلے میں مصلحتیں پیش نظر رکھنا عموماً ضروری سمجھا جاتا ہے۔ سب سے آخر میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کبھی کسی رائے کے اظہار میں صرف اس لئے تامّل کیا کہ ان کی قوم یا ہم وطن یا ارباب حکومت اسے پسندیدہ نہیں سمجھیں گے۔

پالیسی کے بنیادی خط و خال

وہ دل کی بات کہہ دینے میں بیباک تھے

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ انہیں حکومت کی پاس داری کا زیادہ خیال رہتا تھا، جس دور میں ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا، اس سے وہ دور قریب تر تھا، جس میں مسلمانوں پر تباہی آئی اور ان کے لئے مستقل قوم کی حیثیت میں منظم ہونے اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کے امکانات بہ ظاہر بالکل کم رہ گئے تھے۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے بڑے غور و فکر کے بعد مسلمانوں کی بحالی کے لئے جو تحریک شروع کی تھی، اس میں انتہائی احتیاط کو بنیاد کار قرار دیا گیا تھا۔ مسلمان تعلیم میں پسماندہ تھے، کاروبار میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نظم و نسق میں ان کا حصہ محض برائے نام تھا۔ ان کے خاصے بڑے طبقے کے پاس معاش کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا، یعنی زمینیں، وہ بھی بہت

کم رہ گئی تھیں ۔ ساہوکاروں نے ضرورت کے وقت گراں قدر شرح سود پر قرضے دے دے کر خاصی زمینیں خود سنبھال لی تھیں اور باقی زمینوں کے لئے شدید خطرات لاحق تھے، ایسے حالات میں غیر محتاط پالیسی مسلمانوں کے لئے قطعاً سود مند نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس کی مضرتیں بالکل واضح تھیں ۔

ملک عمر حیات خاں کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی تو یہی پالیسی اکثر دور اندیش مسلمانوں کے نزدیک صحیح قومی مسلک کی حیثیت رکھتی تھی ، یعنی حکومت سے فی الجملہ اتفاق و تعاون مسلمانوں کے بنیادی ملکی حقوق کے لئے انتہائی سعی و کوشش اور عام وطنی مسائل میں پائیدار ملکی مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرم کوششیں۔اسی مسلک پر ملک صاحب مدت العمر کار بند رہے اور مسلم لیگ نے اسی مسلک کی بنا پر ایک جداگانہ ملک کے حصول میں کامیابی حاصل کی ۔

بیباک صاف گوئی

ملک عمر حیات خاں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے ۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں وہاں ایک قرار داد پیش ہوئی جس کا مفاد یہ تھا کہ ملک کا نظام حکومت بڑی حد تک مرکزیت کا پہلو لئے ہوئے ہے جس کی وجہ سے حکّام ضلع ، بالخصوص ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور کلکٹروں کو وسیع اختیارات حاصل ہیں ، ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرز عمل کو ختم کیا جائے ۔

ملک عمر حیات خاں نے نہ محض اصل مقصد کی تائید کی، بلکہ اس میں ایک ترمیم پیش کر دی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور کلکٹروں کو اضلاع اور تحصیلوں کے بورڈوں کی صدارت سے الگ کر دیا جائے کیونکہ اس کے بغیر لوگوں کے لئے لوکل سیلف گورنمنٹ کا تجربہ حاصل کرنے کا موقعہ نہیں آ سکتا۔ تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا :۔

مجھے اس قسم کے بورڈوں میں کام کرتے ہوئے پچیس سال سے زائد مدت گزر چکی ہے۔ میں نے پبلک سروس کمیشن کے سامنے بھی یہ رائے پیش کی تھی کہ جب تک ڈپٹی کمشنر بورڈوں کے صدر ہیں، کوئی دوسرا ممبر شامل کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ پوری کاروائی صدر کے ایما پر ہوتی ہے نائب صدر نام کو تو موجود ہیں مگر ان کی ہستی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، جب کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ بورڈ کے سامنے پیش ہوتا ہے تو صدر اس لئے نائب صدر کو اجلاس کی صدارت سونپ کر الگ ہو جاتا ہے۔ کہ اختلاف سے اپنے آپ کو بچائے۔

پھر ملک صاحب نے چار صفحوں کا ایک ایجنڈا اپنی طرف سے شہادت میں پیش کیا، اس ایجنڈا میں گیارہ امور زیر بحث بتائے گئے تھے مگر وہ بورڈ کے روبرو پیش ہی نہیں ہوئے تھے، پھر ڈپٹی کمشنر نے ان کے متعلق نوٹ

لکھ کر منظوری دے دی گویا وہ امور محض برائے نام بورڈ کے رو برو پیش ہو گئے ، ملک صاحب نے کہا ،جب تک ممبر ڈپٹی کمشنروں کے نامزد ہوں گے اور صدر ڈپٹی کمشنر رہیں گے صورت حال یہی رہے گی - سچ ہے :-

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

آخر میں فرمایا :-

حکام جس قدر اختیارات اہل ملک کو سونپ سکیں ان سے ملک کو فائدہ پہنچے گا - اہل ملک خود اختیاری کی تعلیم حاصل کریں گے - کم از کم بورڈوں کا کام تو تمام تر ملکیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے ، تمام ممبروں سے میری درخواست ہے کہ اگر پیش کردہ قرار داد منظور نہ کر سکیں تو کم از کم میری ترمیم کی تائید ضرور فرمائیں "

طریق کار

ملک صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ جو کام اپنے ذمے لیا جائے ، اس میں کبھی دوسرے ذاتی کام کے باعث کوتاہی گوارا نہیں کی جا سکتی ، خود عمر بھر ان کا شیوہ یہی رہا - مثلاً مختلف جنگوں میں وہ بطور رضا کار شامل ہوئے اور ہمیشہ انتہائی خطرات برداشت کرتے رہے ، یہی کیفیت صومالی لینڈ کی جنگ میں اور یہی کیفیت تبت کی مہم میں پیش آئی - پہلی عالمی جنگ کے سلسلے میں انہیں نہایت خطرناک محاذ پر متعین کیا گیا تھا ، مگر انہوں نے کبھی شکایت نہ کی - پاؤں برف سے متورم ہو گئے ، پھر

بھی محاذ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ ڈاکٹروں نے علاج کے لئے لندن بھیجا، حالت سدھرتے ہی انہوں نے مطالبہ کیا کہ مجھے فرانس بھیج دیا جائے ۔ انہیں رخصت کا حق حاصل تھا، مگر اس سے مطلق فائدہ نہ اٹھایا اور جب ان کے بریگیڈ کو عراق بھیج دیا گیا اور عراق میں ابتدائی جنگ کے بعد فوجی کارروائیاں خاصی مدت کیلئے رک گئیں تو ذاتی معاملات کی درستی کے لئے وطن آئے ۔ یہ معاملات ان کی طویل غیر حاضری کے باعث خاصے الجھ گئے تھے۔

ان کا طریقہ یہی رہا کہ یا تو کسی کام کا ذمہ نہیں اٹھانا چاہیے اگر ذمہ اٹھا لیا جائے تو مردانہ وار اسے پورا کرنے کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا چاہیے ۔ اپنا یہ اصول انہوں نے ۲۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے صاف صاف واضح کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا :۔

جو کانفرنس شملہ میں ہوئی تھی، میں نے اس میں اپنے افکار ذرا سختی سے پیش کئے تھے اور کہا تھا کہ اگر کوئی فرد خدمت عوام اپنے ذمے لیتا ہے پھر ذاتی معاملات میں منہمک ہو کر خدمت عوام کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اور فرض بجا نہیں لاتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ غلط آدمی ہے، جسے غلط کام پر لگا دیا گیا ہے ۔ ایسے آدمی کو قطعاً اس کام پہ نہیں رہنا چاہیے اور مفاد عامہ کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ

استعفا دیکر الگ ہو جائے۔

ملک صاحب نے زندگی میں جتنے کام کیے، ان میں بنیادی اصول کار یہی تھا جس امر کا ذمہ اٹھاؤ اسے ذاتی معاملات سے بے پرواہ ہو کر پورا کرو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو بہتر یہی ہے کہ اس امر سے دست کش ہو جاؤ۔

صاف گوئی میں وہ اپنے دوستوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں صنعت فولاد کے تحفظ کا مسودہ قانون پیش ہوا تو ملک صاحب سمجھتے تھے کہ یہ صرف چند دولت مندوں کے فائدے کے لئے بنا ہے غریبوں کے فائدے کا اس میں کوئی خیال نہیں رکھا گیا، حکومت فولاد کے کارخانہ داروں کی حامی تھی، ملک صاحب نے بے تکلف کہا "جس ایوان میں حکومت اور کارخانہ دار متحد ہیں، وہاں کچھ کہنا یقیناً صدا بہ صحرا سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔"

وقف علی الاولاد

ابتدائی دور میں مولانا شبلی مرحوم اور بعض دوسرے اصحاب کی کوششوں سے وقف علی الاولاد کا مسودۂ قانون مسٹر محمد علی جناح (بعد میں قائداعظم) نے مرکزی مجلس میں پیش کیا تھا اور انہیں کی کوشش سے یہ مسودہ قانون منظور ہوا۔ ملک عمر حیات خاں نے ہر مرحلے پر اس قانون کی سرگرم حمایت کی اور اس دور میں اسلامی مفاد کے اس ذریعے کو پوری تقویت پہنچائی، انہوں نے فرمایا کہ اس مسودہ قانون کو شریعت اسلامی کے مطابق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور

ہیں مختلف مآخذ شریعت کے حوالے پیش کر سکتا ہوں مگر اس طرح کونسل کا زیادہ وقت صرف ہو گا، یہ قانون عین شریعت کے مطابق ہے اور مسلمان اس کے سرگرم حامی ہیں، خصوصاً پنجاب کے خواندہ اور ممتاز مسلمان اسے ضروری سمجھتے ہیں - لہذا اسے منظور کیا جائے۔

میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور لیگ کے درمیان تناسب نمائندگی کے متعلق ایک قرارداد بمقام لکھنؤ منظور ہوئی جس نے میثاق لکھنؤ کے نام سے شہرت پائی - اس میثاق کی حمایت میں زیادہ تر وہ لوگ سرگرم تھے، جن کا تعلق مسلم اقلیت والے صوبوں سے تھا - چنانچہ انہوں نے جو سمجھوتا کیا، اس میں مسلم اقلیت کے صوبوں کے اندر مسلمانوں کی نمایندگی تقریباً دگنی کر دی گئی، لیکن مسلم اکثریت کے دو صوبوں یعنی پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی گھٹا دی گئی پنجاب میں اسے پچاس فی صد اور بنگال میں چالیس فی صد کر دیا گیا، جو مسلمان اس کے حامی تھے، ان کے پیش نظر یہ پہلو رہا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کانگرس نے تسلیم کر لی، لیکن بالغ نظر مسلمان یہ کہتے تھے کہ جب مسلمانوں کی اکثریتیں قائم نہ رہیں گی تو جداگانہ ہستی تسلیم کر لینے سے عملاً کیا فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

چنانچہ یہ میثاق ۱۹۱۶ء کے بعد سے سالہا سال تک کشمکش کا باعث بنا رہا - مسلمان اسے ختم کرانا چاہتے تھے اور ان کی آرزو تھی کہ اسلامی اکثریتیں پنجاب و بنگال میں

بحال ہو جائیں، غیر مسلموں کی کوشش یہ تھی کہ میثاق کا تناسب بحال رہے البتہ جداگانہ انتخاب اڑا دیا جائے۔

ملک عمر حیات خاں نے براہ راست تو نہیں مگر کونسل آف سٹیٹ کی ایک تقریر کے دوران میں اس پر نہایت عمدہ تبصرہ کیا۔ سر محمد شفیع مرحوم کو میثاق کی مخالفت میں درجہ امتیاز حاصل تھا۔ ملک عمر حیات خاں نے ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> مسلمانانِ پنجاب اس میثاق کے خلاف ہیں کیونکہ اس کے رو سے جہاں جہاں مسلمانوں کی تعداد از روے آبادی قلیل تھی، قلیل ہی رہی، لیکن جہاں وہ اکثریت میں تھے، مثلاً پنجاب میں، وہاں بھی انہیں اقلیت ہی میں رکھا گیا اور اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچا ۔

اصل میثاق میں پنجاب کے مسلمانوں کا تناسب پچاس فی صد رکھا گیا تھا۔ لیکن مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات کے مطابق اسے عملی شکل دی گئی تو پنجاب کے مسلمانوں کا تناسب صرف بتیس فی صد رہ گیا، سرکاری بلاک الگ تھا جس کے ممبر سرکاری افسر یا نامزد لوگ تھے، وہ ہمیشہ حکومت کے حق میں رائے دیتے تھے۔ ضروری نہ تھا کہ ہمیشہ مسلمانوں کی تائید کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک عمر حیات خاں نے پنجاب کی اسلامی نیابت کو اقلیت کی نیابت قرار دیا

مسئلۂ خلافت

سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں مسئلۂ خلافت نے پاک و ہند کے اندر نہایت اہم حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس وقت کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ کانگریس اور پاک و ہند کی دوسری جماعتیں بھی خلافت کے معاملے میں مسلمانوں کی حامی تھی، ملک عمر حیات خاں نے ۱۲ار۔ فروری سنہ ۱۹۲۱ء کو ایک قرارداد پیش کی، جس میں حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ مسلمان نہایت اہم اور ضروری معاملات کے متعلق اسلامی خیالات کی ترجمانی کے لئے ایک وفد فوراً لندن بھیجنا چاہتے ہیں، اس پر تقریر کرتے ہوئے کہا :-

> میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ ہمیں ایسے مسئلے پر بحث کرنے کا موقع دیا گیا ہے، جو ہمیں نعل در آتش کئے ہوئے ہے، میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مسئلے کے متعلق مسلمانوں میں بہت جوش ہے، مجھے بعض وفدوں میں شرکت کا موقع ملا۔ جو اس مسئلے کے متعلق مختلف محکموں کے اعلیٰ حکام کے پاس پیش ہوئے۔

شادی کی عمر میں تحدید

سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا تھا، جس میں شادی کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کی عمر کا تعین کیا گیا تھا۔ ملک عمر حیات خاں نے مسلمانوں کی رائے عامہ کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ سب سے پہلے یہ اصول پیش

کیا کہ اگر کوئی مسلمان شریعت اسلامی کے قوانین وضوابط کے خلاف ذاتی رائے پیش کرے تو اسے مسلمان نہیں سمجھا جائے گا:-

مسلمانوں کو بحالت عدم بلوغ بھی شادی کی اجازت ہے۔ اگر لڑکی نابالغ ہے تو اس کا باپ یا ولی شادی کا معاہدہ کر لینے کا ذمہ دار ہے۔ یہی صورت لڑکوں کے متعلق بھی ہے۔ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اسے نکاح پسند نہ ہو تو وہ نکاح یعنی معاہدہ توڑنے کی حقدار ہے، یعنی بالغ ہو کر اسے نکاح یا شادی کو فسخ کر دینے کی پوری آزادی دے دی گئی ہے۔ اگر وہ بعد بلوغ نکاح نہ توڑے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے معاہدہ عملاً قبول کر لیا۔ غرض مسلمانوں کے لئے شادی کے سلسلے میں عمر کا تعین شریعت کے سراسر خلاف ہے اور حکومت اقرار کر چکی ہے کہ وہ ملک کی کسی جماعت کے مذہبی قانون میں مداخلت نہیں کرے گی۔"

نہرو رپورٹ

۱۹۲۸ء میں کانگرس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمجھوتے کو نظر انداز کر کے دستور کا ایک مسودہ تیار کیا تھا، جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔

ملک عمر حیات خاں نے کونسل آف سٹیٹ میں اس کی مخالفت کی۔ سب سے پہلے نہرو رپورٹ کے طریق انتخاب

کو لیا، جسے جداگانہ کے بجائے مخلوط رکھا گیا تھا - ملک صاحب نے فرمایا کہ جب تک ہمارے ہاں سے جداگانہ انتخاب کی بنا پر نمائندے نہیں چنے جائیں گے، ہماری صحیح نمائندگی کا انتظام نہ ہو گا - پنجاب کے حالات کا مجھے پورا علم ہے اور میرا خیال ہے کہ دوسرے صوبوں کی حالت بھی مختلف نہیں :-

"پنجاب کے غریب کسان بنیوں کے بھاری قرضے کے نیچے دبے ہوئے ہیں - ان کی بیچارگی کی حالت یہ ہے کہ بنیوں کے چنگل سے رہائی نہیں پا سکتے - اب اگر طریق انتخاب مخلوط رکھا گیا تو مسلمانوں کے صحیح نمائندے کیونکر منتخب ہوں گے - وہی لوگ بنیوں کے کہنے پر مسلمانوں کے نمائندے چنے جائیں گے، جو سرتاپا قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو انہیں کے کہنے پر سب کچھ کریں گے، نہرو کمیٹی کی رپورٹ کا اثر اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا...... اس رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر بے انصافی کی ہے اور جو لوگ یہ رپورٹ پڑھ چکے ہیں، ان کی رائے یہی ہے -

ساتھ ہی ملک صاحب نے کہا کہ میں نے حال ہی میں شملہ کے ایک اسلامی جلسے کی صدارت کی تھی، جو نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاج کے لئے منعقد ہوا تھا - اس جلسے کی حقیقی حیثیت کو سمجھ لینا ضروری ہے - اس

وقت پورے ملک کے ممتاز مسلمان شملہ میں جمع ہیں، وہ سب اس میں شریک تھے گویا یہ ملک بھر میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجتماع تھا، جس نے نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاج کیا :۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ ایک شکایت

حکومت سے مسلسل یہ ہوتی رہی کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے، چنانچہ ۲۵ر مارچ ۱۹۲۵ء کو ایک قرار داد پیش ہوئی جس کا مفاد یہ تھا :۔

۱۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کر دیا جائے۔

۲۔ جن ملازمتوں کا فیصلہ بہ ذریعہ مقابلہ ہو، خصوصاً پولیس اور سول سروس، ان کے کامیاب امیدواروں کی دو فہرستیں تیار کی جائیں ایک غیر مسلموں کے لئے، دوسری مسلمانوں کے لئے :۔

۳۔ قابلیت کا کم سے کم معیار مقرر کر دیا جائے :۔

ملک صاحب نے اس کے متعلق ایک زبردست تقریر کی اور اس میں کہا جو وفد لارڈ منٹو کے پاس (۱۹۰۶ء میں) پیش ہوا تھا، اس نے بھی کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کے لئے جداگانہ نمائندگی کا انتظام نہ کیا گیا، تو وہ تباہ ہو جائیں گے یہ امر تسلی بخش ہے کہ مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا انتظام کر دیا گیا،

لیکن جب تک حکومت ملازمتوں میں ہمارے
لئے خاص قانون نہ بنا دے گی، ہم بدستور
نقصان میں رہیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان
مقابلے میں کیوں نہیں آتے؟۔ سن لیجئے،
پنجاب میں ہماری آبادی زیادہ ہے، اکثر
مسلمان زمیندار ہیں۔ اوّل زمینداری کا کام
ان کی تعلیم میں حارج ہوتا ہے۔ پھر بدقسمتی
سے دیہات میں سکول اور کالج نہیں، زمیندار
اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے شہر بھیجنے پر مجبور
ہیں، جہاں کالج ہیں، اس کے لئے روپیہ درکار
ہے، جو زمیندار کے پاس نہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔
..... قدرتاً مقابلے میں مسلمانوں کی کامیابی
کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مسلمان ان حالات میں دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے شہریوں کے بچے چند روپے ماہانہ خرچ کرکے اعلیٰ تعلیم پا سکتے تھے، زمینداروں کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوتا تھا، لہٰذا ملک صاحب نے مطالبہ کیا کہ یہ تمام حالات پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے حقوق کا انتظام کر دیا جائے اور یہ مطالبہ ہر لحاظ سے حق بجانب تھا۔

اسی طرح ریلوے سکریٹریٹ اور تمام دوسرے محکموں میں مسلمانوں کا تناسب پورا کرنے پر وہ برابر زور دیتے رہے۔

ہندوراج

مارچ ۱۹۲۷ء میں سر سنکرن نائر نے ایک قرارداد پیش کی تھی کہ جب تک ہندو اور مسلمان جداگانہ انتخاب ترک نہ کریں موجودہ قانون ساز مجلسوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے نہ ان کے دستور بدلے جائیں اور نہ ان کے اختیارات بڑھائے جائیں - ملک عمر حیات خان نے مسلمانوں کے سرگرم ترجمان کی حیثیت میں اس قرارداد کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ کوئی مسلمان، جسے اپنی قوم کی بہبود کا کچھ بھی درد ہے، یہ قرارداد منظور نہیں کر سکتا - پھر ہماری آرزو ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے اعتمادی پیدا ہونے کے مواقع سے احتراز کیا جائے - مجھے امید ہے کہ ہندو بھی اس کی تائید نہیں کریں گے:-

جناب والا! ہندوستان کی آبادی میں ایک چوتھائی مسلمان ہیں اور دو تہائی اچھوت، گویا ہم مل کر اکثریت میں تھے مگر کچھ دیر بعد ہمارے بھائیوں ("ہندوؤں") نے دو تہائی اچھوتوں کے لئے بھی دعوٰی پیش کر دیا - اس طرح ہم صرف ایک چوتھائی باقی رہ گئے اور مسلمانوں کو طبعاً خوف پیدا ہو گا کہ اکثریت کا جو بھی راج ہو گا حقیقتاً ہندو راج ہو گا - میں سمجھتا ہوں کہ آج ملک میں جو مصیبتیں رونما ہیں، وہ بڑی حد تک اسی سے پیدا ہوئیں، جب مسلمانوں کو شدھ کیا جاتا ہے - اور اس قسم کی چیزوں (جیسی

پیش نظر قرار داد تھی) کا مقصد بھی وہی ہے، یعنی ہماری تعداد گھٹائی جائے اور دوسری طرف تعداد بڑھائی جائے ۔ اس سے بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو مشکلات اور پریشانیاں پیش آئیں ان میں سے اکثر کا بنیادی سبب یہی ہے ۔ لہذا ہمارے ہندو بھائیوں میں سے جو بھی اس قرار داد کی حمایت کرے گا وہ مسلمانوں کے دل میں ایک قسم کی بے اعتمادی پیدا کرنے کا موجب ہو گا اور مجھے امید رکھنی چاہیے کہ ایوان بالاتفاق یہ قرار داد نا منظور کر دے گا ۔

مسلمان اور جداگانہ انتخاب

ظاہر ہے سر سنکرن نائر کی قرار داد اس لئے پیش ہوئی تھی کہ ۱۹۲۷ء کے اوائل میں مسلمان رہنماؤں نے دہلی میں سمجھوتے کے لئے ایک سکیم منظور کی تھی، جس کا مفاد یہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے برابر اصلاحات ملیں، مرکز میں مسلمان کے لئے ایک تہائی نیابت کا انتظام کر دیا جائے، پنجاب و بنگال میں ان کی اکثریتیں بحال ہو جائیں تو وہ جداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب قبول کر لینے پر غور کریں گے ۔ سر سنکرن نائر اور دوسرے ہندو لیڈر چاہتے تھے کہ مسلمان رہنماؤں کی مذکورہ بالا سکیم کے کسی جزو پر اس وقت تک عمل کی نوبت نہ آئے، جب

تک مسلمان مخلوط انتخاب کا اقرار نہ کریں، ملک عمر حیات خاں نے مسلئے کے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں سر سنکرن نائر کی قرارداد میں کوئی ترمیم پیش کرتا تو یہ ہوتی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اصلاحات میں اس وقت تک کوئی ترقی نہیں چاہتے جب تک ہمیں جداگانہ انتخاب کی حفاظت کا یقین نہ دلا دیا جائیگا

کیونکہ جداگانہ انتخاب ہی میں ہماری نجات ہے، میرے وطن میں صورت حال یہ ہے کہ اکثر مسلمان ووٹر ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہیں اور اگر کسی ہندو کو کسی غیر ہندو سے مقابلہ پیش آجائے گا تو وہ اپنے مسلمان ووٹروں کو یہ ہدایت دیدیگا کہ صرف اسے ووٹ دئیے جائیں ورنہ وہ قرضوں کے متعلق عدالت میں نالشیں کر دے گا۔ اس وجہ سے کوئی بھی حقیقی نمائندہ مسلمان دیہاتی حلقوں سے قانون ساز مجلسوں میں نہ آسکے گا اور تمام مجلسیں کم وبیش ایک ہی قوم کے نمائندوں پر مشتمل رہ جائیں گی۔

چودھواں باب

مختلف اہم معاملات

دارالحکومت کی تبدیلی بعض اسلامی مسائل کے متعلق ملک عمر حیات خاں کے خیالات ایک مستقل باب میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی ضرورتوں اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان پر گفتگو کا صحیح موقع تعلیم کے سلسلے میں آئے گا جو ایک مستقل باب کا موضوع ہے اور کچھ باتیں دوسرے ابواب میں آ چکی ہیں یہاں سب سے پہلے دو ایسے مسئلوں کا ذکر ضروری ہے، جو آگے چل کر ایک نوع کی پیشگوئی ثابت ہوئے۔ مطلب یہ نہیں کہ ملک عمر حیات خاں یا کسی دوسرے شخص کو یہ سب کچھ پیش آ جانے کا پہلے سے علم تھا، ہرگز نہیں، مطلب صرف یہ ہے کہ ملک کے حالات پر گہری نظر تھی، نشو و ارتقاء

کے انداز کو وہ بخوبی سمجھتے تھے، اس لئے کہہ دیا کہ فلاں فلاں چیزیں ہونی چاہئیں اور حالات کی طبعی رفتار نے وہ سب کچھ پورا کر دیا۔

ان میں سے پہلا مسئلہ دارالحکومت کی تبدیلی کا تھا۔ ملک عمر حیات خاں نے ۲۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا:-

حضور والا! ہندوستان کے باقی حصوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ کیوں کلکتہ جیسا مقام جو انگلستان سے بھی دور ایک گوشے میں واقع ہے اور جس کی آب و ہوا بھی خراب ہے، ہندوستان کا دارالحکومت بنانے کے لئے چنا گیا؟ میرے نزدیک مناسب یہی ہے کہ جب سرمایہ سازگار ہو تو بالائے ملک میں ایک ایسا شہر دارالحکومت کے لئے منتخب کیا جائے، جو اس وسیع ملک کے دور افتادہ حصوں سے تقریباً یکساں فاصلے پر واقع ہو:-

یہ صاف اور واضح طور پر دہلی کی طرف اشارہ تھا جو صدیوں تک ہندوستان کا طبعی دارالحکومت رہا ہے اور جس کا ماضی بھی دارالحکومت بننے کیلئے ہر اعتبار سے زیبا تھا۔ ملک عمر حیات خاں کی یہ آرزو تقریباً دس مہینے کے بعد یوں پوری ہوئی کہ جارج پنجم تاجپوشی کیلئے یہاں آیا تو دہلی میں یہ تقریب پوری شان سے منائی گئی اور وہیں دارالحکومت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان ہوا۔ حد درجہ دلچسپ اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ملک عمر حیات خاں ہی نے نقیب شہنشاہ کی حیثیت میں

بہ زبان اردو یہ اعلان سنایا - پھر نئی دہلی کی عالیشان عمارتیں بنیں، اس قدیم شہر کو مرکزیت کا درجہ مل گیا اور کلکتہ آبادی کی وسعت کے باوجود محض ایک صوبائی شہر رہ گیا، جس طرح مدارس، بمبئی، لکھنؤ، پٹنہ ناگپور لاہور وغیرہ صوبائی شہر تھے۔

بمبئی اور کراچی

ملک عمر حیات خاں نے جن مقاصد کیلئے سرگرم کوششیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھا کہ شمالی ہند خصوصاً پنجاب، سرحد اور سندھ کی بندرگاہ بمبئی کے بجائے کراچی بن جائے کیونکہ مذکورہ صوبوں سے تجارتی سامان کی درآمد و برآمد کے لئے یہ مقام بمبئی کے مقابلے میں قریب تر تھا اور اس راستے حمل و نقل پر کم روپیہ خرچ ہوتا تھا - مارچ ۱۹۱۳ء میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جہاں اور ضروری باتیں فرمائیں، وہاں یہ بھی کہا:۔

> دہلی اور پشاور کے درمیان ریلوے کا انتظام غیر تسلی بخش ہے، لاہور اور پشاور کے درمیان حالات اور بھی خراب ہیں اب دارالحکومت دہلی میں منتقل ہو چکا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ریلوے میں آس پاس کے نقائص دور ہو جانے چاہئیں، سمندر کے راستے کراچی و عدن کا درمیانی فاصلہ عدن و بمبئی کے درمیانی فاصلے سے کم ہے، اس طرح کراچی و دہلی کا درمیانی فاصلہ، بمبئی و دہلی کے درمیانی فاصلے سے کم ہے لہذا ساری ڈاک کراچی کے راستے آنی

حد درجہ ضروری ہے ۔"

گویا ملک صاحب بمبئی کے مقابلے میں کراچی کو شمالی ہند کی بندرگاہ بنانا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں ان کی تجویز مصارف میں کفایت کے معقول اصول پر مبنی تھی ۔ انھوں نے یہ بھی کہا:

"یہ کام (یعنی کراچی کو شمالی ہند کی بندرگاہ بنانے کا کام) ایک نہ ایک دن کرنا ہوگا لہٰذا جس قدر جلد یہ کر لیا جائے ، اسی قدر اچھا ہوگا ۔"

ملک صاحب کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ حالات ایسی صورت اختیار کر لیں گے کہ ناگزیر طور پہ ملک دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے گا اور شمالی حصّے کے لیئے کراچی ہی اہم بندرگاہ بن جائے گا ۔ چونتیس سال گزر گئے ، ملک تقسیم ہوا ، کراچی نے بہ لحاظ بندرگاہ نہایت اہم حیثیت حاصل کی اور وہ قول پورا ہو گیا ، جو خدا جانے کن تاثرات کے تحت ملک صاحب کی زبان پر جاری ہوا تھا ۔

حق و انصاف کی پیروی

ملک عمر حیات خاں نے حق و انصاف کے راستے سے کبھی انحراف نہ کیا ۔ وہ ہر معاملے میں ہر قوم اور ہر طبقے کے جائز حقوق کا احترام کرتے تھے اور ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ کسی کے طبعی دائرے میں مداخلت کی نوبت نہ آئے ۱۹۱۱ء میں ان لوگوں کا معاملہ زیر بحث آیا جنھیں "جرائم پیشہ" گروہ کہتے تھے ۔ ملک صاحب نے اس مسودۂ قانون پر اظہار اطمینان کیا اور کہا کہ جرائم پیشہ گروہوں کو ان کے خاص علاقوں میں محدود کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ معاش کے ناجائز وسائل چھوڑ کر محنت و مشقت یا زراعت پر متوجہ ہو جائیں گے ۔ ایسے کاموں کی سخت

ضرورت ہے ۔ ساتھ ہی فرمایا ان لوگوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا معاملہ خاص توجّہ کا محتاج ہے ۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ انہیں اصلاح کی غرض سے کہیں بھی رکھا جائے مگر ضروری ہے کہ انہیں اسی مذہب کی تعلیم دی جائے جس میں وہ پیدا ہوئے ۔

اس آخری انتباہ کا خاص سبب یہ تھا کہ ۱۹۱۱ء تک بھی پادریوں کو گورنر یا دوسرے بڑے عہدہ داروں کے ہاں خاص اثر و رسوخ حاصل تھا اور ان کے وسائل بھی بدرجہا وسیع تر تھے ، اس لئے وہی اثر و رسوخ سے کام لے کر ایسے بچوں کو سنبھال لیتے تھے اور انہیں مسیحی بنا لیتے تھے ۔ ملک عمر حیات خاں کو خوب معلوم تھا کہ قحط کے زمانے میں جابجا یہی ہوتا رہا ، اس لئے انہوں نے تاکید کی کہ ان بچوں کے اصل مذہب کی نگہداشت کا خاص اہتمام کیا جائے ۔

اقرار نامے کی بنا پر مزدوروں کی بھرتی

پاک و ہند میں ایسے آدمیوں کی خاصی کثرت تھی ، جنہیں مناسب مزدوری نہ ملتی تھی اور مختلف لوگ اقرار ناموں کی بنا پر مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد کو برطانوی نوآبادیوں میں لے گئے تھے کچھ مدّت کے بعد ان سے نامناسب سلوک ہونے لگا وہ غریب لوگ تھے اور ان کی کوئی منظم آواز نہ تھی ۔ جب ملکی لیڈروں پر یہ کیفیت منکشف ہوئی تو انہوں نے غور و مشورہ کے بعد اقرار نامے کی بنا پر مزدوروں کی بھرتی روک دینے کی تحریک کی ۔ مسٹر گوکھلے نے مارچ ۱۹۱۲ء میں ایک

قرار داد مرکزی مجلس میں پیش کی - ملک عمر حیات خاں نے اس کی پر زور تائید کی - انہوں نے کہا، لوگ ان غریب مزدوروں کو مزدوری کی خاص رقم پیش کر کے لے جاتے ہیں۔ انھیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ کس ملک میں جا رہے ہیں اور وہاں رہنے سہنے اور کھانے پینے پر کیا خرچ ہو گا - مزید بر آں اب ملک میں مزدوری کے اتنے مواقع پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی کو روزگار کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ آخر میں آپ نے کہا :-

میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں - میں سمجھتا ہوں کہ سو فی صد ہندوستانی مسٹر گوکھلے کے ہمنوا ہیں - جب ہم سو فی صد ایک طرف ہیں اور یہ حکومت ہماری ہے تو حکومت کو بھی ہمارا ساتھ دینا چاہیے ، ورنہ وہ ہماری حکومت نہ رہے گی۔

ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے مسٹر گھوکھلے کی پر زور تائید کی -

مشرقی افریقہ کے ہندوستانی

ستمبر ۱۹۲۱ء میں ایک قرار داد کونسل آف سٹیٹ میں پیش ہوئی تھی جس میں ہندوستانیوں کے لئے مشرقی افریقہ میں مساوی حقوق کا مطالبہ کیا گیا تھا ، اس پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ، ہندوستان جنگ میں شریک ہوا تھا تو اہل ملک کو بڑی امیدیں تھیں ، خیال تھا کہ جنگ کے اختتام پر انہیں بھی عراق یا افریقہ میں کوئی جگہ مل جائے گی ، لیکن افسوس یہ امیدیں بار آور نہ ہوئیں - عراق تو حقداروں کے

پاس چلا گیا لیکن :-

مشرقی افریقہ کو تو محض ہندوستانیوں ہی نے فتح کیا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب میں فرانس جا رہا تھا تو ایک فوجی دستہ کراچی سے مشرقی افریقہ بھیجا گیا تھا............ اس وقت خیال کیا گیا تھا کہ وہاں کی آب و ہوا یورپینوں کے لئے ساز گار نہیں، اسی لئے وہاں ہندوستانی بھیجے گئے - انہوں نے ملک فتح کر لیا تو معلوم ہوتا ہے، وہ زیادہ خوشگوار بن گیا ہے اور یورپینوں کے لئے زیادہ موزون ہو گیا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہاں ہندوستانیوں کو کوئی حق نہیں - چونکہ اسے حاصل کرنے میں ہندوستانیوں نے زیادہ تر حصّہ لیا - اور تعداد میں بھی وہ زیادہ ہیں............ لہذا اگر وہ یورپینوں سے زیادہ حقوق طلب کریں تو بھی ان کا مطالبہ ناجائز نہ ہوگا - اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم انہیں برابر کے حقوق تو ضرور ملنے چاہئیں -

اس سلسلے میں ملک عمر حیات خاں نے ایک دلچسپ قِصّہ سنایا کہ ہماری مثال اس بنئے کی ہے جس کی گائے ایک شیر نے پھاڑ ڈالی تھی، بنیا شیر کے پاس گیا اور اپنی بہی کھول کر اس سے بولا: بتاؤ کس حق کے مطابق تم نے میری گائے مار ڈالی؟ شیر جواب میں دھاڑا، دھاڑ سنتے ہی بنیا بولا - مہاراج ٹھیک ہے اب میں حساب سمجھ گیا ہوں -

بہ ہر حال ہندوستانیوں کو مشرقی افریقہ میں برابر کے حقوق ضرور ملنے چاہئیں۔

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

سنہ ۱۹۲۳ میں پھر مشرقی افریقہ خصوصاً کینیا میں ہندوستانیوں کے لئے مساوی حقوق کا معاملہ پیش ہوا تو ملک عمر حیات خاں نے اس "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" سے تقریر شروع کی۔ اس سلسلے میں بتایا کہ ہماری حکومت نے جنوبی افریقہ کے بوئرڈوں سے اس لئے جنگ کی تھی کہ وہاں انگریزوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہوتا تھا، اب وہی صورت کینیا میں ہندوستانیوں کو پیش آئی ہے، ہندوستانیوں نے وہاں جاکر جنگل صاف کئے، بہت سے وہاں بیمار ہوکر مرے یا مارے گئے، جب صلح کا وقت آیا تو کہہ دیا گیا، کہ تمہارا کام ہو چکا اب تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ:۔

حکومت ہمیں کینیا میں بچانے کا دم بھرتی ہے لیکن وہاں ہم بدستور غیر محفوظ ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اگر وہ پوری طاقت سے معاملہ ہاتھ میں نہیں لے سکتی تو ہمیں بتا دے ...... اگر ہم حکومت کے تابع نہ ہوتے تو ہمتِ مرداں مددِ خدا کے اصول پر کمر باندھ کر آج تک کچھ نہ کچھ کر چکے ہوتے:۔

جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

مشرقی افریقہ کی طرح جنوبی افریقہ کے

ہندوستانیوں کے حقوق بھی خطرے میں پڑے ہوئے تھے، جب ان کے حقوق کا معاملہ کونسل آف سٹیٹ میں پیش ہوا، تو ملک عمر حیات خاں نے اُن کے حقوق کی پُرزور حمایت کی۔ ساتھ ہی کہا، میں لمبی چوڑی تقریروں کا عادی نہیں، البتہ عملی سیاست ایک قصّے کی شکل میں پیش کرتا ہوں۔ دو آدمی تھے، ایک بولتا خوب تھا اور دوسرا لڑنا جانتا تھا، دونوں لڑ پڑے۔ بولنے والا زبان سے کام لیتا تھا، لڑنے والے کا انحصار زدو کوب پر تھا۔ جب زد و کوب کرنے والا تھک گیا، تو بولنے والے نے کہا:۔ اب تم نے ہاتھ اٹھایا تو دیکھنا میں تمہاری کسطرح خبر لیتا ہوں۔ لڑنے والا اٹھا اور بولنے والے کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا، جب وہ ہوش سنبھال کر گھر پہنچا تو بولا بلاشبہ اس نے مجھے بہت مارا، لیکن میں نے بھی تو گالیوں کی بمباری میں کسر نہ اٹھا رکھی۔

یہی حالت ہماری ہے، ہم بہت بولتے ہیں لیکن اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوتا، پھر پورے مسئلے پر بحث کر چکنے کے بعد تجویز پیش کی کہ جنوبی افریقہ کے تمام ہندوستانیوں کو یہاں لانے کا انتظام کر دیا جائے:۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ہزاروں بیگھے زمین پڑی ہے، اگرچہ اس کی آبیاری کا کوئی انتظام نہیں تاہم یہ زمین ہندوستانیوں کو دی جاسکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت ان کے لئے ضرورت کے وقت روپے کا انتظام کرے، مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کے

لئے عزت کا مقام مہیا کرے اور اتنا ضرور دیدے جو ان کے کھانے پینے کیلئے کافی ہو اگر وہ ہندوستان آنے سے انکار کریں اور کہیں، ہمیں یہاں روپیہ زیادہ ملتا ہے تو ہم کہیں گے :۔ طمع راسہ حرف است ہمہ تہی :۔ اگر وہاں وہ بے عزت ہو کر رہنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مرضی ہے، ہندوستان کو ان سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیے :۔

آخر میں فرمایا حکومت برطانیہ کو اس معاملے میں توازن قائم کرنا چاہیے ۔ اگر یہ ممکن نہیں تو ہمیں جنوبی افریقہ سے معاملہ طے کرنے کی اجازت دی جائے اور بہت جلد وہاں کی حکومت کے ہوش و حواس درست ہو جائیں گے :۔

پندرھواں باب

پنجاب

صوبے کی حیثیت

پنجاب ملک عمر حیات خاں کا وطن تھا۔ یہیں کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے انہیں دو مرتبہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں، اس کے بعد تقریباً دس سال تک مرکزی اسمبلی میں اور اتنی ہی مدّت کے لئے کونسل آف سٹیٹ میں مسلسل کام کرنا پڑا۔ پھر وہ اسی صوبے کی طرف سے انڈیا کونسل کے رکن نامزد ہوئے جہاں پانچ سال تک انتہائی سرگرمی سے خدمات نمائندگی انجام دیں۔ ملک صاحب فطرۃً کسی صوبے یا قوم یا ملک کے جائز حقوق میں مداخلت کے روادار کبھی نہ ہوئے، لیکن پنجاب سے انہیں گوناگوں رشتوں کی بنا پر گہرا تعلق تھا اور اس کی

اہمیت کا بھی انہیں پورا احساس تھا :۔

پنجاب ہندوستان کے دو بڑے صوبوں میں سے ایک تھا، جس میں مسلمانوں کو از روئے آبادی اکثریت حاصل تھی مگر میثاق لکھنؤ میں اس اکثریت کو عملاً برباد کر دیا گیا تھا، پھر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نافذ ہوئیں اور میثاقِ لکھنؤ کے مقررہ تناسب پر عمل ہوا تو صوبے میں مسلمانوں کی نمائندگی اور بھی گھٹ گئی، یہ حالات محض خواہش یا احتجاج سے بدلے نہیں جا سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اوّل اکثریت کی بحالی کے لئے مسلسل جدوجہد کی جاتی، دوم جو مواقع میسّر آ گئے تھے، ان سے کام لے کر مسلمانوں کی اور صوبے کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دی جاتی :۔

خدمت کا پروگرام

یہی حالات تھے، جب ۱۹۲۱ء کے بعد بالغ نظر مسلمان رہنماؤں نے سوچ بچار کر کے ایک طریقِ کار نکالا۔ اس پر پورے اہتمام اور احتیاط سے عمل کیا اور پندرہ بیس سال کے اندر اندر مسلمانوں کو پنجاب میں اس درجے پر پہنچا دیا کہ ہر دائرے میں وہ معتدبہ حقوق کے حامل بن گئے اور ان کی آواز اتنی موثّر ہو گئی کہ فرقہ دار فیصلے میں ان کی نمائندگی آبادی کے عین مطابق تو نہیں، لیکن تناسب آبادی کے قریب تر پہنچ گئی۔ صوبے کے اس تعمیری کام میں ملک عمر حیات خاں کا بھی بہت بڑا حصّہ تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ صوبے میں اکثریت اس دیہاتی آبادی کی تھی، جس کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آبادی کا تناسب صوبے میں اسّی فیصد سے اوپر تھا ان میں بھی اکثریت مسلمانوں

کی تھی، وہ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے اور ان کے حقوق کی صحیح ترجمانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۲۲-۱۹۲۱ء ہی کا تجویز کردہ پروگرام تھا، جس کے ذریعے سے ان کی اصلاح و فلاح کا کام شروع ہوا۔ ان کی زمینیں غیر زراعت پیشہ طبقوں کے حوالے ہونے سے بچیں۔ معلوم ہے کہ ۱۹۰۱ء کے قانونِ انتقال اراضی میں عدالتوں نے اتنے رخنے ڈال دیے تھے کہ اس قانون کی حقیقی حیثیت باقی ہی نہیں رہی تھی، اور ان عدالتوں پر سرمایہ دار شہری طبقے کے جج مسلط تھے، اسی پروگرام کے مطابق دیہاتی آبادی کے قرضوں کا بڑا بوجھ اُترا۔ ان کے قریب تر کالج اور سکول بنے، تاکہ تعلیم میں سہولت پیدا ہوا۔ سڑکیں بنیں، منڈیوں کے کاروبار میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔ ساہوکاروں کے لئے لائسنس ضروری قرار دیئے گئے، پنچائتیں بنیں، تاکہ ان کے چھوٹے چھوٹے مقدمات کا فیصلہ عدالتوں سے باہر ہو سکے، انجمن ہائے امداد باہمی کا جال پورے صوبے میں بچھ گیا۔ جا بجا دیہات سدھار اور اشتمال اراضی کا کام شروع ہوا۔ غرض پنجاب پورے ہندوستان میں صرف ایک صوبہ تھا جس کے اندر ۱۹۲۱ء سے ہمہ گیر ترقیات کا ایک ایسا شاندار دور جاری ہوا کہ اس کی مثال کوئی دوسرا صوبہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔ پھر مختلف طبقات کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لئے یکجائی و یکجہتی اور تعاون کی ایسی خوشگوار فضا پیدا ہوگئی جو ایک طبقے کی بہت بڑی اکثریتوں کے صوبوں میں بھی یقیناً نہیں مل سکتی۔ ان تمام امور کے متعلق ملک صاحب کے افکار مختلف عنوانوں کے تحت آئیں گے۔ ضروری ہے ان سب کو پیش

نظر رکھ کر اندازہ کیا جائے کہ اس ایک شخصیت نے گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ملّت و ملک اور صوبے کے نشوونما و ارتقاء کے لئے کتنا عظیم الشان اور پائیدار کام انجام دیا۔

ہندوستان پر خاص حقوق

ملک عمر حیات خاں نے اس پورے پروگرام کی پیش بردیں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے صوبے کا ذکر بار بار کرتے رہے اور ان کی جو تقریریں محفوظ رہ گئیں، ان میں بھی پنجاب کی نمایاں حیثیت روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

پنجاب کو ہندوستان پر خاص حقوق حاصل ہیں۔ باہر سے اس ملک پر جب کبھی یورش ہوئی تو سب سے پہلے پنجاب ہی اس کی زد میں آیا اور ہمارے جو دوست زیریں صوبوں میں آباد ہیں، انہیں کبھی کسی مصیبت سے سابقہ نہ پڑا۔

۱۹۱۰ء میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں اپنے آنریبل رفیق مسٹر فینٹن[ل] کے افکار و نظریات کی پرزور حمایت کرتا ہوں، جنہوں نے اس موسم کی بہترین تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ پنجاب کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہے ہم بنجر زمینوں کے وسیع علاقے زیر کاشت لے آئے ہیں اور نہروں کے کام کے لئے ہم نے مزدوروں کا انتظام کیا، گویا ہم ہندوستان کے لئے خوشحالی کا

ل Fenton.

موجب بنے ، لہذا ہمارا طبعی حق ہے کہ اس محنت
و مشقت کا معاوضہ لیا جائے ۔

کوہِ نور ہیرے کا صوبہ

ایک اور موقع پر (۱۹۱۱ء) انہوں نے فرمایا :-
میں اپنے صوبے کی طرف آتا ہوں .... یہی صوبہ ہے جہاں سے شہرۂ آفاق ہیرا کوہِ نور لیا گیا ، جو آج تاجِ انگلستان میں درخشاں ترین گوہر ہے ۔ یہی صوبہ ہے جو سلطنت برطانیہ کا درخشاں ترین گوہر نہیں تو کم از کم ہندوستان کا درخشاں ترین گوہر ضرور ہے ۔

ضروریات

لیکن ملک صاحب خواہ مخواہ پنجاب کا نام بار بار نہیں لیتے تھے ، انہیں پورا احساس تھا کہ پنجاب کو مختلف کاموں کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہے ، چنانچہ اسی تقریر میں انہوں نے فرمایا :- پنجاب کئی آفتوں کا شکار ہوا - طاعون نے تباہی پھیلائی - موسمی بخار انتہائی پریشانی کا موجب بنا رہا - ڈیرہ غازی خاں میں قحط کی بلا نازل ہوئی ، نو آبادیوں میں آبادکاری کے کام کو تقویت پہنچانا لازم ہے ، پنجاب کی تعلیم بھی خاص توجہ کی محتاج ہے - ان سب کاموں کے لئے روپیہ درکار ہے - چونکہ اس وقت تک صوبوں کو روپیہ مرکز سے ملتا تھا اس لئے ملک صاحب بار بار پنجاب کی ضرورتیں تفصیل سے پیش کرتے تھے ۔

اگرچہ کانگڑہ کے زلزلے پر پانچ چھ سال گذر چکے تھے مگر زلزلے کی تباہ کاریوں کا سلسلہ اتنا وسیع تھا کہ

اس کے لئے روپے کی اشد ضرورت تھی - چنانچہ ملک صاحب نے کانگڑہ کا ذکر بھی بہ طور خاص کیا - پھر فرماتے ہیں !

معاملے کا ایک پہلو حد درجہ نازک ہے اور ہیں اسے کونسل کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں - تازہ اعداد مردم شماری ملاحظہ فرمائیے، آشکارا ہو جائے گا کہ ہم نے طاعون موسمی بخار اور دوسری آفتوں سے انتہائی نقصان اٹھایا یہاں تک کہ گذشتہ دس سال میں اری آبادی کے اندر ۱۶۸ فی صد کمی ہو گئی -

دیکھئے ان کی توجہ اور نظر معاملات پر کتنی گہری تھی - وہ صوبے کے احوال و ضروریات کے ہر پہلو پر نظر رکھتے تھے اور فرائض نمائندگی میں ایسے اہتمام کی مثالیں بہت کم ملیں گی -

انصاف کا تقاضہ

اسی تقریر میں انہوں نے کہا :-

انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ افیون سے جو رقم نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر ہاتھ آئی اس کا سب سے بڑا حصہ ہمارے صوبے کے انتظامات حفظانِ صحت کی اصلاح پر صرف کیا جاتا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ حفظانِ صحت کے منصوبوں کے لئے جو رقیں لی گئیں، ان میں ہمارا حصہ استحقاق سے بہت کم ہے، یہاں تک کہ بنگال کو بھی اتنی ہی رقم دی گئی ہے جتنی پنجاب کے حصے میں آئی، حالانکہ بنگال کی آبادی گذشتہ دس سال میں بڑھی اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی آبادی میں کمی ہر گز پنجاب جتنی خطرناک نہیں تاہم بنگال کو بہت بڑی رقم دیدی گئی -

اس سلسلے میں تعلیم کا بھی ذکر آگیا، جس پر الگ بحث کی جائے گی، لیکن یہاں پنجاب کا معاملہ بہ طور خاص پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ملک صاحب فرماتے ہیں :-

> پنجاب کی نو آبادیوں میں نئے دیہات وجود پذیر ہو رہے ہیں، ان میں تعلیم اور دوسری اہم ملات کے لئے تمام صوبوں سے زیادہ روپیہ درکار ہے بہ ایں ہمہ بنگال کی تعلیمی گرانٹ (زرِ امداد) پنجاب سے تین گنا اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی رقم تقریباً دگنی ہے، یہ امر قرینِ انصاف نہیں، ہماری آبادی گھٹ رہی ہے۔ ہم تعلیم میں پسماندہ ہیں، لازم تھا کہ افیون کی رقم میں سے ہمیں بہت زیادہ روپیہ ملتا۔

آخر میں فرماتے ہیں کہ پنجاب سب کے بعد سلطنت برطانیہ کا حصّہ بنا، اس کی ترقی کیلئے احتیاط و اہتمام سے کام ہونا چاہیے تاکہ اس کے طبعی وسائل بھی نشو و ارتقا پا کر دوسرے صوبوں کے برابر ہو جائیں اور وہ ہندوستان کی وسیع مملکت میں علمدار کی پُر افتخار حیثیت بحال رکھ سکے۔

مسلمانانِ پنجاب

اگرچہ ملک صاحب کو پنجاب اور اسکی تمام قوموں سے محبت تھی تاہم مسلمانوں سے طبعاً زیادہ دلبستگی ہونی چاہیے تھی، چنانچہ ان کی فلاح و بہبود کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا، ۱۹۱۵ء کے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے کہا :-

> ادائے فرض میں کوتاہی ہوگی اگر میں مسلمانانِ پنجاب کے متعلق چند الفاظ عرض نہ کروں جن کا میں نمائندہ ہوں۔۔۔

مجھے امید ہے کہ حکومت ان کے لیۓ زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتوں کا انتظام کرے گی، تاکہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہمسایہ قوموں کا درجہ حاصل کریں اور انہیں حکومت آئندہ زیادہ ملازمتیں دے گی، وہ خود اپنی ترقی کے لیۓ انتہائی کوششیں کر رہے ہیں، مگر اس وقت تک سربلند نہیں ہو سکتے جب تک حکومت ان کا ہاتھ نہ بٹائے:۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو چکی تھی ستمبر ۱۹۱۹ء میں تقریر کرتے ہوئے ملک صاحب نے فرمایا :۔

ہندوستان کو پنجاب پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ پنجاب نے ہندوستان کی فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمی مہیا کئے اور اس فوج کے دستے سمندر پار جا کر جنگوں میں شریک رہے ان جنگوں میں پنجاب کے مسلمانوں نے سب سے بڑھ کر حصّہ لیا، ہندوستان میں جس شخص کو سب سے پہلے وکٹوریہ کراس کا نشان ملا، اس کا تعلق ملت اسلامیہ ہی سے تھا اور میرے لئے راولپنڈی ڈویژن کے کام کی تفصیلات پیش کرنا ضروری نہیں جس کا بڑا حصّہ پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا ۔

ایسے ہی کارنامے تھے جن کی وجہ سے پنجاب کو ہندوستان کا "بازوئے شمشیر زن" قرار دیا گیا ۔

پنجاب کی بالواسطہ خدمت

ملک عمر حیات خاں کی متعدد تقریروں میں سے یہ صرف چند اقتباسات ہیں جن سے ان کے جذبات و افکار کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ دارالحکومت کو کلکتہ سے دہلی میں منتقل کرانے پر جوزور دیتے رہے تھے وہ بھی ایک لحاظ سے پنجاب ہی کی خدمت تھی، جسطرح دوسرے صوبوں کی خدمت تھی، کیونکہ دارالحکومت ان سے قریب تر آتا تھا، اسی طرح کراچی کو شمالی ہند کی بندرگاہ بنانے پر زور دینے کا مدعا بھی یہی تھا کہ پنجاب، سندھ سرحد اور شمالی ہند کے دوسرے قریب تر علاقوں کی تجارت درآمد و برآمد کو فروغ حاصل ہو۔ بندرگاہ کے قریب تر آجانے سے درآمد و برآمد کے مصارف میں بھی تخفیف ہوتی تھی اور ڈاک بھی جلد پہنچ سکتی تھی :۔

سولہواں باب

تعلیم

نصب العین تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا مسئلہ نصب العین کا ہے، یعنی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ جب ہم عام تعلیم پر زور دیتے ہیں تو آیا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ محض پڑھ لکھ جائیں یا یہ ہوتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر مفید و کارآمد شہری بنیں۔ اپنے لئے عزت مندانہ روزی کا انتظام کر سکیں اور آئندہ کے لئے بہتر کنبوں کی تربیت کا ذریعہ بنیں؟ ملک عمر حیات خاں کو تجربہ ہو چکا تھا کہ جس تعلیم کا انتظام حکومت کے ذریعے سے ہوا، وہ غریب دیہاتی طبقوں کے لئے سود مند ثابت نہیں ہوئی۔ بلاشبہ ایک طبقے نے اعلیٰ تعلیم پاکر اچھی ملازمتیں حاصل کر لیں، لیکن ظاہر ہے کہ قومی ترقی چند افراد کی ترقی

کا نام نہیں ۔ ملک صاحب کی نظر ہمیشہ عام آبادی پر رہی، ان کے نزدیک قوم و ملک کی ترقی کا اصل معیار یہی تھا کہ اس کثیر آبادی کو فائدہ پہنچے۔

۱۵ فروری ۱۹۲۸ء کو انہوں نے تعلیم یافتہ اور دوسرے متوسط طبقوں کی بے روزگاری پہ ایک تقریر کی، تجویز یہ پیش تھی کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی طرف سے ایک کمیٹی مقرّر کی جائے جو ان طبقوں کو بے روزگاری کی مصیبت سے نجات دلانے کے وسائل و ذرائع دریافت کرے، اس تقریر میں ملک صاحب نے تعلیم کے متعلق اپنا نصب العین پیش کرتے ہوئے کہا :-

میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ہم کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جائیں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں اپنی دیکھ بھال کر سکیں"۔

پھر انہوں نے کہا کہ میں عوام میں زندگی بسر کرتا ہوں، ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جنہوں نے پرائمری یا مڈل کے درجے تک تعلیم پائی - پھر گھروں سے باہر نکل گئے، میں نے بارہا ان سے کہا کہ اپنے آباؤ اجداد کا پیشہ اختیار کر لو، مگر انہیں میرا مشورہ پسند نہ آیا کیونکہ وہ اچھے کمروں میں رہنے اور پنکھوں کی ہوا میں گرمی کا موسم گذارنے کے عادی ہو چکے تھے اور انہیں کب یہ مشورہ پسند آسکتا تھا کہ کھیتوں میں ہل چلائیں، محنت و مشقت کریں یا چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں بیٹھ کر سودا سلف بیچیں :-

پہلے پڑھے لکھے آدمی فوج میں شامل ہو جاتے تھے، مگر اب ہچکچاتے ہیں، کیونکہ فوجی سپاہی کو اپنا سامان اٹھا کر چھبیس چھبیس میل کی مسافت پیدل طے کرنی پڑتی ہے اور ہمارے تعلیم یافتہ

آدمیوں میں جفاکشی باقی نہیں رہی وہ تن آسان و راحت طلب ہو گئے ہیں ان کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں، نہ وہ کسی ملکی و انتظامی شعبے میں کام کے قابل رہے ہیں نہ ملک کے دفاع کا فرض انجام دے سکتے ہیں

میری تجویز یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے ان لڑکوں کو آبائی اجداد کے پیشوں کی تربیت دے یا کسی دوسرے موزون کام کے قابل بنائے۔

اس سلسلے میں انہیں مختلف محکمے یاد آئے۔ مثلاً ریلوے میں مسیحیوں اور اینگلو انڈینوں کی اکثریت تھی اور عموماً وہی بھرتی کئے جاتے تھے۔ دوسری قوموں کے تعلیم یافتہ افراد کو کم موقع ملتا تھا۔ ملک صاحب چاہتے تھے کہ اوّل تعلیم محض کتاب خوانی تک محدود نہ رہے، بلکہ تمام طلبہ کو ان کے ماحول، ضروریات اور آبائی پیشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم کے ساتھ تربیت کا انتظام بھی کیا جائے۔ ساتھ ہی وہ چاہتے تھے کہ ملازمتوں کے تمام شعبوں میں تمام قوموں کے لئے دروازے کھلے رکھے جائیں اور ہر قوم تناسب کے مطابق بھرتی ہو مسیحی اور اینگلو انڈین ریلوے کو اپنا اجارہ نہ بنا لیں بلکہ فوج وغیرہ میں بھی شامل ہوں:۔

تعلیم کیسی دی جائے؟

ملک صاحب ابتدا ہی سے نری نوشت وخواند کو صحیح تعلیم نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں بھی ویسے ہی خیالات کا اظہار کیا، جو ۱۹۲۶ء میں پیش کئے، ۱۹۱۰ء کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں!

میں چاہتا ہوں کہ نصاب تعلیم میں ایسی ترمیمیں کردی

جائیں، جو طلبہ کے آبائی پیشوں کے لحاظ سے مناسب ہوں، آج کل بچے مدرسوں میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے گذار دیتے ہیں اور دن کا بہترین حصہ مقررہ سبق اور مشقیں رٹنے ہی میں بسر ہو جاتا ہے، زمانہ ماضی میں ہندوستان کے اندر مکاتب کا نظام رائج تھا جو بہت مفید تھا اور ملک و عوام کی ضروریات کے عین مطابق تھا اس نظام میں طالب علم استاد کے سامنے سبق پڑھتے اور یاد کرتے تھے اور انہیں کتابوں اور نغتوں کی طرف متوجہ ہونے کی زحمت نہیں ہوتی تھی باقی وقت وہ اپنے پیشوں میں گذارتے تھے گویا اس تعلیم میں زندگی کے روزانہ کاروبار کا حرج نہیں ہوتا تھا۔

اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ملک صاحب مفید تعلیم کے داعی تھے، یہ نہیں چاہتے تھے کہ چند کتابیں پڑھنے کے قابل بن کر بچے آبائی پیشے اختیار کرنے یا روزی کمانے کے دوسرے وسائل سے بہرہ مند ہونے کے اہل نہ رہیں، ظاہر ہے کہ آج بھی تعلیم عام کی کوئی سکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک طلبہ کے لئے موزوں پیشوں کی تربیت کا انتظام نہ ہو گا، ملازمتوں کا دائرہ بہرحال محدود ہے اور ہمیشہ محدود رہے گا ان میں دو یا چار یا چھ فی صد لوگ شامل ہو سکتے ہیں صد فی صد کے لئے گنجائش نہیں۔ لہذا یہی کرنا چاہیے کہ ایک محدود طبقے کے لئے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنے کے علاوہ زیادہ تر

طلبا کے طبعی میلان کا اندازہ کرتے ہوئے مفید پیشوں کی تربیت دی جائے اور سب سے بڑھ کر اس امر کا خیال رکھا جائے کہ وہ چند سال تعلیم پا کر نکلیں تو جس پیشے میں بھی داخل ہوں، اپنے ناخواندہ ہم وطنوں سے بہتر اور مفید تر شہری ثابت ہوں۔ ملک عمر حیات خاں کا نقطۂ نگاہ ابتداء سے یہی تھا اور وہ عمر بھر اسی پر زور دیتے رہے۔

تعلیمی پروگرام

۱۹۱۱ء میں بجٹ پر بحث کا موقعہ آیا، تو ملک صاحب نے پھر تعلیم کے متعلق اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت تفصیل سے کی، انہوں نے فرمایا:-

اب میں وقت کے ایک بہت اہم مسئلے پر آتا ہوں، یعنی تعلیم، میں دوسرے امور کے سلسلے میں اس کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں باقی رہا خالص تعلیم کا موضوع تو اسے نئے محکمہ تعلیم، اپنے آنریبل دوست مسٹر گھوکھلے اور ان کے مسودہ قانون کے حوالے کرتا ہوں، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے باشندوں اور ان کے متوقع پیشوں کے متعلق ایک عام جائزہ لے لیا جائے، یعنی سرسری طور پر یہ معلوم کر لیا جائے کہ مندرجہ ذیل شعبوں کے سلسلے میں لوگوں کی کتنی تعداد درکار ہے:-

ا- زراعت

ب- کارخانے

ج- کانیں

د- مختلف پیشے

ھ - فوج

و - خوشحال آدمی جو اپنی تکمیل کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں

ز - وہ تعلیم یافتہ آدمی جن کی ضرورت سرکاری یا نجی ملازمتوں وغیرہ کے لئے ہے:-

مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ تاجر، دولتمند لوگ اور سرکاری ملازمت کے خواہاں مناسب طریق پر تعلیم پائیں - مگر جن لوگوں کو کھیتی باڑی کرنی ہے - یا کانوں اور کارخانوں میں کام کرنا ہے یا فوج میں شامل ہونا ہے یا چھوٹے چھوٹے تاجر یا کم مشاہرہ کے سرکاری یا نجی ملازم وغیرہ طبقوں کو اعلی تعلیم دینے کا مطلب کیا ہے ؟ انہیں پرائمری تک تعلیم بھی اس طریق پر نہ دینی چاہیے جیسے آج کل دی جا رہی ہے اور جس کے مطابق وہ آبائی کام انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ اوائل عمر میں ان کا سارا وقت تعلیم پر صرف ہو جاتا ہے - ان کے لئے یا تو مدارس شبینہ کا انتظام کیا جائے، یا اور کوئی ایسا انتظام کر دیا جائے جس سے ان کے آبائی کام میں خلل نہ پڑے۔ نیز ایسے مضامین پڑھائے جائیں، جن سے وہ اپنے اپنے پیشے اختیار کرنے کے زیادہ اہل بن جائیں:-

مذہبی تعلیم | مذہبی تعلیم کے متعلق آج کل گوناگوں پیچیدگیاں نظر آتی ہیں - ملک عمر حیات خاں کی پختہ رائے تھی، کہ طلبہ کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام حد درجہ ضروری ہے - انہوں نے ایک تقریر میں فرمایا، "میں ہمیشہ سے مذہبی تعلیم کا حامی رہا ہوں، کیوں کہ اس کے بغیر علم کا جہاز پتوار اور لنگر سے محروم رہتا ہے :-

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا، وہ نہ حکومت کے معنی سمجھتا ہے، نہ اپنے والدین یا دوسرے بزرگوں کی عظمت سے آشنا ہو سکتا ہے - ہندوستان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ جو لوگ نہیں جانتے، کس کا احترام کرنا چاہیے، انہیں کوئی بھی ساتھ ملا کر جہاں چاہے لے جا سکتا ہے -

پھر ایک بار فرمایا :-

جس شخص کو خدا کا احترام نہیں سکھایا جاتا اگر وہ والدین اور حکومت کی عزت نہیں کرتا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، ہم نے چیفس کالج میں تجربہ کیا تھا اور نتائج بہت عمدہ رہے"

یقیناً مذہبی تعلیم حد درجہ ضروری ہے اور اس کا انتظام تمام طلبہ کے لئے ہونا چاہیے، واقعی مذہبی تعلیم کے بغیر طلبا میں وہ روح پیدا نہیں ہو سکتی، جو افراد کو صحیح، قابلِ قدر اور ذمہ دار شہری بناتی ہے اور یہی چیز انسانیت کا جوہر ہے -

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

ملک صاحب کو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ہمیشہ زیادہ سے زیادہ خیال رہا، ایک مرتبہ ملازمتوں میں مسلمان امیدواروں کا مسئلہ زیر غور آیا تو بعض لوگوں نے اس امر پر زور دیا کہ مسلمان کیوں دوسرے طبقوں کے ساتھ کھلے مقابلے میں شامل نہیں ہوتے

ملک صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا :۔

یہ کہہ لینا بہت آسان ہے کہ مسلمان کیوں دوسری قوموں سے مقابلہ نہیں کرتے، پنجاب میں رہیں صرف پنجاب کے متعلق کہتا ہوں ما کیونکہ دوسرے صوبوں کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات حاصل نہیں) مشکل یہ ہے کہ اگرچہ ہم وہاں اکثریت میں ہیں، مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں زیادہ تر مسلمان زمیندار ہیں اوّل زمینداری کا کام انہیں سکولوں اور کالجوں میں جانے سے روکتا ہے، دوم بدقسمتی سے وہ دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کے اضلاع میں کوئی کالج نہیں اس طرح کوئی مسلمان اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہے تو ضروری ہے کہ اسے کسی ایسے بڑے شہر میں بھیجے، جہاں کالج موجود ہو، اس کے لئے گراں قدر خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عام زمیندار اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتے

اگر مقابلہ ہو تو ایک طرف سو آدمی ہوتے ہیں اور دوسری طرف سے تین یا چار آدمی آتے ہیں، اس چھوٹے گروہ کے لئے کامیابی کا بہت کم امکان باقی رہ جاتا ہے، ہمارے حالات ایسے ہیں کہ وہ کبھی درست نہ ہوں گے، اور ہم ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے۔

مسلمانوں کے لئے مقابلہ مشکل نہ تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ اوّل مقابلے کے امتحان ایسے افراد کی نگرانی میں ہوتے تھے، جو مسلمانوں کے بہی خواہ نہ تھے، دوم مسلمان جن خوفناک مشکلات میں تعلیم کا انتظام کرتے تھے، ان میں تخفیف کے امکانات بہت کم تھے، سوم مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ہر ملازمت کے لئے کم از کم تعلیمی معیار کا فیصلہ کر دیا جائے اور ہر قوم کا حصّہ آبادی کے لحاظ سے ملازمتوں میں مقرر ہو جائے جب ہر قوم آبادی کے مطابق مختلف شعبوں میں اپنے حقوق حاصل کرے تو کھلے مقابلے کا انتظام قابلِ اعتراض نہ ہو گا۔ ان تحفظات کے بغیر مسلمان اپنے حقوق سے مستفید ہو ہی نہیں سکتے اور ملک صاحب نے اسی تقریر میں فرما دیا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو کے پاس جو وفد گیا تھا، اس میں مَیں شامل تھا۔ ہم سب کو یقین تھا، کہ جب تک مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا انتظام نہ ہو گا وہ پنپ نہ سکیں گے، جداگانہ نیابت کی طرح ملازمتوں میں بھی ہر قوم کے لئے منصفانہ تناسب کا تعین ضروری ہے:-

مسلم یونیورسٹی ملک صاحب نے اپنی تقریروں میں اسلامیہ کالج لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا، یہی پورے ملک میں مسلمانوں کے دو بڑے تعلیمی ادارے تھے ایک موقع پر فرمایا، کہ مسلمان غریب اور پسماندہ ہیں، وہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے روپیہ جمع کر رہے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ ان کا خاص خیال رکھے اور ان کے لئے خاص مراعات کا انتظام کر دے۔ اس طرح مسلمان ترقی یافتہ ہمسایہ قوموں کے ہمسر بن جائیں گے اور ان کی ترقی کے پہیے میں رکاوٹ نہیں بنے رہیں گے۔

پھر ایک موقع پر فرمایا:۔

میرے نزدیک غیر مناسب نہ ہوگا اگر چند الفاظ مسلم یونیورسٹی کے متعلق عرض کر دوں، اگر اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا جائے تو یہ امر ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لئے مسرت کا باعث ہوگا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر ہمارے ہندو بھائیوں کو بھی ان کی مروجہ یونیورسٹی کے لئے معقول مراعات دی جائیں گی تو مجھے خوشی ہوگی:۔

دیکھئے یہاں بھی ملک صاحب نے اپنی قوم کے لئے جو کچھ ضروری سمجھا اس سے دوسری قوم کو محروم رکھنا قطعاً گوارا نہ کیا۔

سترھواں باب

زراعت پیشہ طبقے

تمہید ملک عمر حیات خاں کا اپنا تعلق زراعت پیشہ طبقے سے تھا اور وہ خود پنجاب کے بڑے زمینداروں میں سے تھے اس طبقے کی ترجمانی بھی انہوں نے کمال استقامت سے کی اور کوئی ایسا موقعہ نہ آیا جس میں اس طبقے کے حقوق کیلئے انہوں نے پرخلوص صدا بلند نہ کی ہو، وہ زراعت پیشہ طبقے کے مختلف درجوں سے براہِ راست آگاہ تھے، جانتے تھے کہ آبادی کا سب سے بڑا حصّہ انہیں لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ شہری طبقوں کیطرح ان کے لئے ضروری سہولتوں کے انتظامات ناپید ہیں، شہروں اور قصبوں میں ہسپتال، سکول و کالج موجود تھے،

دیہاتی آبادی کے لئے ایسی کوئی سہولت موجود نہ تھی، شہری نوجوان اگر دس بیس روپے خرچ کرکے اعلیٰ تعلیم پا سکتے تھے، تو دیہاتی نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کم از کم سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ خرچ کرنے پڑتے تھے، اسی طرح دیہاتیوں کے مقابلے میں شہریوں کو ملازمت کے اندر نمایاں تفوق حاصل تھا۔

خود ملک صاحب نے ہر موقع پر اس بے زبان طبقے کی نمائندگی کا فرض پیش نظر رکھا۔ ایک تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ اگرچہ زراعت پیشہ طبقے کو ریڑھ کی ہڈی قرار دیا جاتا ہے، تاہم وہی طبقہ سب کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، اور کسی سے اسے کوئی امداد نہیں مل رہی:۔

کاروبار اور زراعت

ملک صاحب کو حقیقت کے اعتراف میں کبھی تامل نہیں ہوا، ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ بڑے زمینداروں کی حالت چنداں خراب نہیں لیکن اگر ان کی زمینوں کی قیمت پیش نظر رکھی جائے تو واضح ہو جائے گا۔ کہ اس قیمت کے مقابلے میں وہ اتنا نفع حاصل نہیں کر سکتے۔ جتنا نفع کاروباری آدمی اتنا روپیہ لگا کر حاصل کر لیتا ہے:۔

گذشتہ سال میں نے زمینداروں کے مطالبات پر زور دیا تھا۔ مجھے اس مسئلے کو دوبارہ آپ کے سامنے لانے میں بھی قطعاً تامل نہیں، کیونکہ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر ایک ملک کے دو آدمی اپنے پیشوں سے یکساں نفع حاصل کرتے ہیں، تو میرے نزدیک کوئی منطقی جواز نہیں کہ ان پر

غیر مساوی ٹیکس عائد ہو، کون سی وجہ ہے کہ ایک شخص
دس روپے یا اس سے بھی کم آمدنی پر مالیہ ادا کرے
اور دوسرا آدمی نو سو ننانوے روپے پندرہ آنے
گیارہ پائی پر بھی کوئی ٹیکس نہ دے۔ کوئی زمیندار
اپنی زمین چھپا نہیں سکتا اور اسے مالیہ ادا کرنا
پڑتا ہے۔ اس کے برعکس غیر زراعت پیشہ طبقہ
کئی ہتھکنڈے استعمال کر سکتا ہے تاکہ اس کی آمدنی
اصل سے نصف نظر آئے

یہ معاملہ ملک عمر حیات خاں بار بار پیش کرتے رہے
کہ جس طرح غیر زراعت پیشہ لوگوں سے ایک خاص مقدار
آمدنی پر انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا، اسی طرح زراعت پیشہ
طبقے کے ایک حصے کو بھی مالیئے سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے

دو ہزار آمدنی اور ایک بیگھ زمین

ایک مرتبہ کونسل آف سٹیٹ میں قرار داد پیش ہوئی کہ ہندوستان سے بیلون یا بعض دوسرے
مقامات پر چاول بھیجنے کے سلسلے میں جو پابندیاں عائد ہیں
وہ ہٹا دی جائیں، ملک عمر حیات خاں نے اس قرارداد پر
تقریر کرتے ہوئے کہا :-

میں سچ کہتا ہوں کہ اس کشمکش میں ایک
طرف آبادی کا پچانوے فی صد حصہ ہے اور
دوسری طرف صرف پانچ فی صد۔ چاول کاشت کرنے
والے زمینداروں کی یہ حالت ہے کہ جس کسی
کے پاس ایک بیگھ بھی زمین ہے وہ مالیہ ادا کرتا

ہے، دوسری طرف دوکاندار یا تاجر یا دلّال جو دو ہزار روپے کی آمدنی پر بھی ایک حبّہ ادا نہیں کرتا، ہم لوگ بدقسمتی سے اس بلا کا شکار ہیں جسے بندوبست کہا جاتا ہے، اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ لوگوں کو مصیبت میں ڈالا جائے، بیس سال کی ہر مدت کے بعد حکومت مالیہ بڑھا لیتی ہے اس کے مقابلے میں ملکی استعمال کی خاطر چاول کی برآمد روک دیتی ہے جس سے اس جنس کا نرخ گر جاتا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ اس حالت میں ہم لوگ حکومت کو مالیہ کہاں سے دیں؟ مجھے یہ امید رکھنی چاہیے کہ حکومت پانچ فی صد آبادی کی خاطر ہمیں تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے مجبور نہ کرے گی:-

اجناس خوردنی کی برآمد

مارچ ۱۹۲۱ء میں سردار جوگندر سنگھ نے ایک قرار داد پیش کی کہ اجناس خوردنی پر جو پابندیاں عائد ہیں وہ فی الفور اٹھا دی جائیں اور اس موضوع پر بڑی مدلل تقریر کی، ملک عمر حیات خاں نے تقریر کی تعریف کرتے ہوئے سردار صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اصل قرار داد کی پُر زور حمایت کرتے ہوئے کہا۔

میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں زمینداروں اور

زراعت پیشہ لوگوں کا حصّہ بہت زیادہ ہے
مگر یہ بات عجیب ہے کہ ہمیں کہا جاتا ہے، اگرچہ
بہ لحاظ آبادی تم زیادہ ہو لیکن تمہیں اس آبادی
کے تابع رہنا پڑے گا ۔ جو غیر زراعت پیشہ
ہے یہ صورت حال آج سے نہیں مدّت سے
چلی آرہی ہے ۔ زمینداروں کو صرف اسی کا رونا
نہیں ہم اپنی زمین کی پیداوار بھی اپنی مرضی کے
مطابق فروخت نہیں کر سکتے ۔ فرض کیجیے میرے
ہاتھ میں کاغذ کا ایک پلندا ہے، جو میری ملکیت
ہے، میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں، ایک
شخص بیس روپے قیمت پیش کرتا ہے، اور دوسرا
دس روپے دیتا ہے مگر مجھے حکم دیا جاتا ہے
کہ وہ پلندا بیس روپے دینے والے کے ہاتھ
نہیں بلکہ دس روپے دینے والے کے ہاتھ فروخت
کروں :-

اسپر بھی اکتفا کیا جاتا تو شائد ہم خاموشی
سے سر تسلیم خم کر دیتے، مگر آئے دن ہم
غریبوں پر بھاری لگان اور مالیہ تجویز کیا جاتا ہے
اور یہ سلوک اس لئے روا رکھا جاتا ہے کہ ہم
بے زبان ہیں اور ہماری آواز میں کافی قوت
نہیں، جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ نہ
کاشتکار ہیں، نہ زمیندار ۔ وہ اپنی اولاد کو تعلیم
دلواتے ہیں اور ہر جگہ انہیں کا طوطی بولتا ہے۔

کونسلیں ان سے پٹی پڑی ہیں ۔ سرکاری محکموں میں وہ براجمان ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حکومت کو انگلیوں پر نچاتے ہیں ، چونکہ وہ اپنی تقریروں سے ملک میں بے اطمینانی پھیلا سکتے ہیں لہذا حکومت کے لئے بھی ان کا منہ بند کرنا مشکل ہے :۔"

زمینداروں کا طبقہ خاموشی اور بے شر طبقہ ہے لہذا اس کی کوئی نہیں سنتا ، انصاف انصاف کا ذکر سنتے سنتے ہمارے کان بہرے ہو گئے مگر بیچارے زمیندار انصاف سے محروم رکھے جاتے ہیں ، اور ہر شخص کی نگاہِ حرص ہمیں پر پڑتی ہے :۔

"نمبردار" ذیلدار" پٹواری " اور بہت سے ایسے ہیں ، جن کا گذارہ صرف زمینداروں پر ہے ، اگر ایک طرف ہم غلّہ فروخت نہ کر سکیں اور حکومت ہمیں اچھی قیمتوں پر فروخت نہ کرنے دے ، دوسری طرف کم تنخواہ دار سرکاری ملازم ہمیں گذر اوقات کا وسیلہ بنائیں تو آپ ہی انصاف کریں کہ یہ حالت کیونکر قابلِ برداشت ہوگی ؟ پھر " بندوبست " ہمارے لئے الگ مصیبت کا سرچشمہ ہیں :۔

اس تقریر کے آخر میں پھر ملک صاحب نے اپنا وہی مطالبہ دہرایا کہ غیر زراعت پیشہ لوگوں سے دو ہزار روپے کی آمدنی تک ایک حبہ بھی نہیں لیا جاتا اور زمینداروں کی

چھوٹی سے چھوٹی ملکیت پر بھی مالیہ لے لیا جاتا ہے :-

گیہوں کی برآمد

اسی سال کونسل آف سٹیٹ میں ایک قرار داد پیش ہوئی کہ آئندہ فصل ربیع تک (جون ۱۹۲۲ء) ہندوستان سے گیہوں یا آٹے کی برآمد روک دی جائے اور دوسری اشیائے خوردنی کی قیمتیں گھٹانے کی مناسب تجویزیں عمل میں لائی جائیں - ملک عمر حیات خاں نے اس قرارداد کے خلاف بھی صدا بلند کی، کیونکہ یہ زمینداروں اور زراعت پیشہ طبقوں کے جائز حقوق کے خلاف تھی - پھر فرمایا کہ ہمارے ملک میں جب کوئی ٹیکس لگتا ہے تو ہمیشہ زمینداروں پر لگتا ہے، زمیندار اور زراعت پیشہ لوگ ملک کا امیر ترین طبقہ نہیں، کیا وجہ ہے کہ دوسرے دولتمند طبقوں سے برابر کے ٹیکس نہ لئے جائیں ؟

حکومت نے ایسی دوکانیں کھولنے کا وعدہ کیا ہے، جن میں گیہوں ارزاں فروخت ہوں گے، اس کے لئے حکومت کے پاس سرمایہ قحط موجود ہے، جس کے صرف کرنے کا موزوں وقت یہی ہے، اگر آبادی کے کسی طبقے سے کچھ لینا منظور ہے تو زیادہ مالدار طبقوں پر توجہ کی جائے، جن کے پاس روپیہ حاضر ہے، وہ سستی قیمت پر جنسیں خرید لیتے ہیں اور انہیں روک رکھتے ہیں، تاکہ نرخ بڑھ جائے تو فروخت کریں - انہیں طبقوں سے روپیہ حاصل کرکے سستی دکانیں کھولنی چاہئیں :-

ہندوستان کا افلاس

فروری ۱۹۲۴ء میں ایک قرار داد کونسل آف سٹیٹ کے

سامنے پیش ہوئی تھی کہ ہندوستان کے لوگوں، خصوصاً زمینداروں کی مالی حالت کی مفصل تحقیقات کی جائے اور ہر شخص کی سالانہ اوسط آمدنی دریافت کی جائے، تاکہ افلاس کو کم کرنے اور لوگوں کی مالی حیثیت بڑھانے کے لئے تجاویز پیش کی جا سکیں

ملک عمر حیات خاں نے اس تقریر کے سلسلے میں فرمایا کہ میں اس بحث میں حصّہ لینا اپنا فرض سمجھتا ہوں، اس قرار داد پر عمل پیرائی کے سلسلے میں جو رقم صرف ہو گی وہ بہترین کام میں صرف ہو گی۔ زمینداروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ہر دس بیس سال کے بعد بندوبست آجاتا ہے اور مالیہ بڑھا دیا جاتا ہے، حالانکہ زمین کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ پانی میں بھی کمی آ رہی ہے اور جنسوں کی قیمتیں گر رہی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمینداروں میں بھی دولت مند آدمی ہیں، مگر وہ بمشکل پانچ فی صد ہوں گے۔ باقی لوگوں میں سے ہزاروں ایسے ہیں، جنہیں چوبیس گھنٹوں میں بہ مشکل ایک مرتبہ روٹی نصیب ہوتی ہے:۔

پہلی جو حکومتیں تھیں، وہ پیداوار میں سے مالیہ لیا کرتی تھیں۔ اگر کسی کاشتکار کی فصل اچھی ہوتی اور اسے زیادہ دینا پڑ جاتا تو وہ بالکل پرواہ نہ کرتا۔ برٹش راج کے آغاز میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اپنی زمینوں سے اس لئے دستبردار ہو گئے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا، سرکار کو مالیہ

میں نقد روپیہ دینا پڑے گا - چنانچہ آج سینکڑوں خاندان ہیں جن کے پاس کچھ بھی جائداد نہیں اگر ہندوستان مفلس نہ ہوتا تو اس کے باشندے مزدوری کے لیئے نو آبادیوں میں کبھی نہ جاتے اور اس ذلت خیز برتاؤ کو کبھی برداشت نہ کرتے، جو نو آبادیوں میں ان سے ہو رہا ہے - ہندوستان کے لوگوں کے لیئے روٹی کا بندوبست ہو جائے تو یہ بہت بڑا کام ہو گا - جو پورا ہو جائے گا :-

زمینداروں کی مصیبت یہ ہے کہ اوّل انہیں آمدنی کا خاصا حصّہ سرکار کو دینا پڑتا ہے، پھر وہ اہل کار پہنچ جاتے ہیں جن کی تنخواہیں تھوڑی ہوتی ہیں اور وہ زمینداروں ہی سے جنسیں لے کر گذارہ کرتے ہیں، پھر ساہوکار آ جاتا ہے جس سے زمیندار نے مالیہ ادا کرنے کی غرض سے روپیہ لیا تھا، غرض اکثر حالتوں میں زمیندار کی پیداوار میں سے صرف اس قدر بچ رہتا ہے، جس سے سال بھر میں صرف دو ماہ کا گذارہ بہ مشکل ہو سکے - باقی دس مہینے وہ محنت مزدوری پر مجبور ہو جاتا ہے

ہر انسان جو اس ملک میں پیدا ہوا، زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے، اگر اس کی پیداوار سالانہ گذارے کے لیئے کافی نہ ہو تو اسے مالیئے وغیرہ سے مستثنا کر دینا چاہیئے

ٹیکس کمیٹی اور زمیندار

ستمبر ١٩٢٤ء میں ایک ٹیکس کمیٹی بنی تھی پھر فیصلہ ہوا کہ

اس کمیٹی میں زراعت پیشہ لوگوں کی طرف سے بھی ایک نمائندہ ہونا چاہیے ۔ ملک عمر حیات خاں نے زمینداروں کے معاملات میں ہمیشہ ان کی حمایت کی تھی، مگر اس مرتبہ وہ قرارداد کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے کیونکہ ان کے تجربے کے مطابق حکومت زمینداروں کو سوتیلے بیٹے سمجھ رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ زمینداروں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے ۔ پانی سر سے گذر چکا ہے ۔ غرق ہونے سے پہلے ان کا واویلا بیجا نہ ہوگا :-

مالئے کے اضافے سے ان کی حالت بہت ابتر ہو رہی ہے، اس کا کیا علاج کیا گیا ؟ اور اب آبیانہ بڑھا دیا گیا ہے تو ان کے لئے صورت حال بالکل ناقابل برداشت ہو گئی۔ ہم چاہتے تھے کہ ہماری حکومت اور زمینداروں کے تعلقات خوشگوار رہتے، کیونکہ زمیندار ہی ہیں جنہوں نے لڑائی میں اپنا خون بہایا انہیں کے حسن خدمات کے صلے میں ملک کو اصلاحات ملیں، لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ جب کبھی ان کے متعلق کوئی مطالبہ کیا جاتا ہے تو کانوں میں روئی ٹھونس لی جاتی ہے ۔ مجھے بار بار یہ بات دہرانی پڑی ہے، مگر ہے حقیقت کہ حکومت کے سگے بیٹے دو ہزار روپے کی آمدنی تک بھی کچھ ادا نہیں کرتے ، زمیندار بیچارے ایک کنال زمین پر بھی مالیہ دیتے ہیں، میں محرک قرارداد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اسے واپس لے لیں

کیونکہ نہ حکومت ہماری امداد کے لئے تیار ہے
اور نہ ساہوکار ذہین، ہمیں صرف خدا سے مدد مانگنی
چاہیے :-

اس تلخ تقریر سے کونسل کے ارکان اس درجہ متاثر ہوتے کہ تمام صوبوں کے مختلف طبقوں نے اصل قرارداد کی حمایت کی اور حکومت نے بھی اسے منظور کر لیا :-

غریبوں سے گہری ہمدردی

ملک عمر حیات خاں کو ملک کے غریب طبقوں سے برابر گہری ہمدردی رہی، خصوصاً غریب زراعت پیشہ طبقوں سے جن کی حالت بہت خراب تھی سرمایہ داروں کی کوشش یہ تھی کہ جن آمدنیوں کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے، انہیں دو ہزار سے بڑھا کر تین ہزار تک کر دیا جائے۔ ملک صاحب کہتے تھے ایسی آمدنیوں کو دو ہزار سے گھٹا کر پانچ سو پر نہیں لایا جاسکتا تو ایک ہزار پر ہی لایا جائے۔ ہندوستان میں مختلف لوگ مختلف ذریعوں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں اور جب تک ایک ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی خاص ذریعے سے آمدنی حاصل کرتا ہے تو کونسی وجہ ہے کہ اس کی کم سے کم آمدنی پر بھی ٹیکس وصول کیا جائے، مگر دوسرے سے ویسی آمدنی پر کوئی ٹیکس نہ لیا جائے :؟

محرکِ قرارداد نے کہا کہ میں ان لوگوں کو بچانا نہیں چاہتا ہوں، جن کی آمدنی ایک سو بہتر روپیہ

ماہانہ ہے (یعنی دو ہزار سالانہ کی آمدنی پر انکم ٹیکس نہ لیا جائے)۔ میں ان لوگوں کی حمایت میں آواز بلند کر رہا ہوں، جن کی آمدنی چھ یا سات روپے ماہانہ ہے۔"

میں کونسل کے تمام ممبروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایک سو پچھتر روپے کی ماہانہ آمدنی والے کے مقابلے میں چھ یا سات روپے ماہانہ آمدنی والے بھائیوں کی امداد کیوں نہیں کرتے؟

معلوم ہے کہ ایک ہل صرف بیس بیگھے یا دس ایکڑ زمین کاشت کرسکتا ہے۔ بیس بیگھے یا دس ایکڑ زمین کی آمدنی تیس روپے فی ایکڑ یا تین سو روپے سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی پھر اس شخص کے ساتھ دو تین کھانے والے بھی ہوں گے۔ اگر ایک کنبے کے افراد بالا وسط چار رکھے جائیں تو انہیں صرف چھ یا سات روپے سالانہ ملیں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حکومت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ آمدنی دو ہزار سے گھٹا کر پانچ سو پر نہیں لے آتی؟

پھر ایک موقعہ پر ملک صاحب نے فرمایا کہ زمیندار کو زراعت کی اصلاح کی تلقین آپ کر سکتے ہیں، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسے بہتر ہل سے کام لینا چاہیے اور مویشی بھی اچھی نسل کے ہونے چاہئیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ وہ غریب ان چیزوں کے لئے روپیہ کہاں سے لائے گا:۔

جب اس کے پاس روپیہ نہیں تو خود ہی سوچئے وہ کیا کرے گا؟ ہم لوگ دیہات میں

رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گردوپیش کی
حالت کیا ہے:-

اٹھارھواں باب

غریب اور پس افتادہ طبقے

مزدوروں سے ہمدردی ملک عمر حیات خاں کو غریب اور پس افتادہ طبقوں سے بھی گہری ہمدردی رہی، ۱۹۱۱ء کی تقریر میں بھی انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ تنخواہیں اونچے درجے کے ملازموں کی نہیں، بلکہ نیچے طبقے کے ملازموں کی بڑھانی چاہئیں - سر مانک جی دادا بھائی نے صنعت فولاد کے تحفظ کے لئے جو قرار داد پیش کی تھی اس پہ تقریر کرتے ہوئے مزدوروں کے معاملے پر بھی ملک عمر حیات خاں نے بہ طور خاص زور دیا - انہوں نے فرمایا :-

اس مسودۂ قانون میں مزدوروں کی حفاظت کے لئے کوئی دفعہ

موجود نہیں ، میرے دل میں مزدوروں کے
لئے ہمدردی کیوں پیدا ہوئی -؟ اس لئے
کہ جب پنجاب میں قانون انتقال اراضی موجود
نہ تھا ، تو زراعت پیشہ لوگوں کی زمینیں
ساہو کاروں کے قبضے میں جارہی تھیں اورجن
لوگوں کا آبائی پیشہ زراعت تھا ، وہ مزدور
بن رہے تھے ، مزدور لوگ زمینداروں کا
گوشت پوست ،ہیں ، لہٰذا ہمیں ان سے ہمدردی
ہے ! جناب والا ! اب وہی طبقہ اس قانون
کی تعبیریں کر رہا ہے ،جس کے خلاف یہ بنایا
گیا تھا - مجھے ڈر ہے اور میں کہہ دینا چاہتا
ہوں کہ یہ طبقہ اس قانون کو عملاً ختم کئے بغیر
دم نہ لے گا اور ہم پھر زمینداروں کے بجائے
مزدور بن جائیں گے ، لہٰذا میرے نزدیک ضروری
ہے کہ پیش نظر مسودۂ قانون میں مزدوروں
کی حفاظت کا انتظام کیا جائے :-

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملک صاحب نے غریب
کاشتکاروں کے لئے بہتر طریق کاشت ، بہتر ہلوں اور بہتر
نسل کے مویشی کی تجاویز کے سلسلے میں کہا تھا کہ جب
ان لوگوں کے پاس روپیہ نہیں تو وہ ان تجاویز پر عمل
کس طرح کریں گے ، گویا غریبوں کی حمایت کا کوئی موقع
ملک صاحب نے نظر انداز نہ ہونے دیا - خواہ ان غریبوں کا
تعلق کسی بھی طبقے سے تھا ، اسی طرح وہ غریب ملازموں

کی حمایت میں ہمیشہ سرگرم رہے، برابر فرماتے رہے کہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیے

ریلوے کا تیسرا درجہ

پھر ریلوے میں تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے انہوں نے بار بار صدا بلند کی۔ ایک موقع پر فرمایا کہ میں تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے بہتر انتظامات کی طرف توجہ دلاتا ہوں اور مجھے امید رکھنی چاہیے کہ ان کے لئے ایسے انتظامات کر دیئے جائیں گے جن میں انہیں زیادہ آسائش مل سکے۔ ۱۹۲۶ء کی ایک تقریر میں فرمایا :-

تیسرے درجے کے مسافروں کو جو تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا علم ہم سب کو ہے وہ لوگ ریلوے کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کی آسائش پر زیادہ توجہ کرنی چاہیے، خصوصاً بعض میلوں کے موقعہ پر، میلے معمولی بھی ہو سکتے ہیں ارباب اختیار کو ان کے متعلق علم بھی نہیں ہوتا اور تکلیفیں پیش آتی رہتی ہیں، باقی رہا درمیانہ درجے کا معاملہ تو اب اینگلو انڈین اور دوسرے طبقے بھی چاہتے ہیں کہ انہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملازمتیں دی جائیں، کیونکہ وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو جگہیں ریلوے میں ان کے لئے

مخصوص رکھی جاتی ہیں، آئندہ نہیں رکھی جائیں گی - کیونکہ اگر وہ ہم میں شامل ہو کر ملازمتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یقیناً انہیں ہمارے پہلو بہ پہلو بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے :-

چھوٹے زمینداروں کا معاملہ

ملک عمر حیات خاں ہر موقع پر چھوٹے زمینداروں کا معاملہ ارباب حکومت کے سامنے پیش کرتے رہے - یہ بھی دراصل غریبوں اور درماندہ لوگوں ہی سے ہمدردی کا مظاہرہ تھا - چنانچہ انہوں نے مختلف تقریروں میں کئی مرتبہ فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس صرف اتنی زمین ہے جس کی پیداوار ایک معمولی مزدور کی آمدنی سے ایک چوتھائی بھی نہیں ہو سکتی اسے مالیہ بالکل معاف کر دینا چاہیے ورنہ اس کی حالت قلی سے بھی بد تر ہو جائے گی :-

پھر جب نہری نوآبادیوں میں زمینداروں کی طرف سے حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج ہوا تو ملک عمر حیات خاں اس احتجاج کو بالکل درست سمجھتے تھے انہوں نے پے در پے یہ کہا کہ ان زمینداروں کے حالات پر خاص توجہ کرنی چاہیے - انہوں نے ہزاروں مشقتیں برداشت کر کے بنجر زمینیں آباد کیں - لازم ہے کہ اب حکومت ان کے مالکانہ حقوق کے لئے نئی شرطیں عائد نہ کرے، یہ بھی غریبوں اور پریشاں حال لوگوں کے حقوق ہی کی حمایت تھی -

فوجی طبقے ملک عمر حیات خاں مدت العمر فوجی طبقوں کے حقوق کے لئے زیادہ سے زیادہ سرگرمی کا اظہار فرماتے رہے ۔ ان کی خواہش یقیناً یہ بھی تھی کہ فوج کی اعلیٰ حیثیت قائم رہے اور وہ ملک کی حفاظت کے تمام واجبات بہتر سے بہتر طریق پہ پورے کر سکے ، لیکن غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان کی نظر بڑے بڑے افسروں پہ نہیں ، بلکہ عام فوجیوں اور سپاہیوں ہی پہ رہی :۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے ملک کی حفاظت اور ناموری کے لئے کیسی جوانمردی سے جانیں لڑائیں اور ہر قسم کی تکلیفیں صابرانہ برداشت کیں ، اگر ان کے حقوق پوری طرح محفوظ نہ ہوئے تو یہ صریح ظلم ہوگا :۔ چنانچہ ملک صاحب نے ان سپاہیوں کی اعانت و دستگیری میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا ۔ جب ان سپاہیوں کے بچوں کے لئے تعلیم کے خاص انتظامات پہ زور دیتے تھے تو یہ بھی حقیقت میں غریبوں کی ہی امداد و اعانت تھی :۔

جنوبی افریقہ پاک و ہند سے لوگوں کی خاصی تعداد جنوبی افریقہ پہنچ گئی تھی اس زمانے میں وہاں کے گوروں کو مزدوروں اور کارکنوں کی ضرورت تھی لہذا ان کا خیر مقدم کیا گیا ، لیکن جب پاک و ہند کے ان باشندوں کی محنت و مشقت سے پورا فائدہ اٹھایا جا چکا تو ان سے نہایت برا سلوک ہونے لگا ۔ ملک عمر حیات خاں نے ان کے لئے بھی بار بار مناسب تجویزیں پیش کیں۔

ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا :- ہم لوگ جوش میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں، جو کسی بھی حالت میں ہمیں فائدہ نہیں پہنچا سکتیں - مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے ہموطنوں سے جنوبی افریقہ میں جو بدسلوکی ہو رہی ہے، اس کا بدلہ لیا جائے - سوچئے کہ بدلا کیا ہو سکتا ہے ؟ جنوبی افریقہ کے گورے اگر یہاں ہوں گے، تو ڈیڑھ دو سو ہوں گے، ہم انہیں اپنے وطن سے نکال دیں گے - نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ کل ہمارے ہم وطنوں سے بھرے ہوئے جہاز یہاں پہنچنے لگیں گے :-

ہم موجودہ حالت میں اپنے بھائیوں کی کیا خدمت کر رہے ہیں، جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ہم ان کے سامنے غلط امیدیں پیش کرتے ہیں - میرے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ وہاں سے آنا چاہتے ہیں ہماری حکومت کا فرض ہے کہ ان کے لئے زمینیں مہیا کرے - یہاں لاکھوں ایکڑ غیر مزروعہ اراضی موجود ہے، اس کی آبیاری کا انتظام کر کے ہم جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے ہم وطنوں کو بسا سکتے ہیں اور وہ اپنے وطن میں عزت کی زندگی گزار سکتے ہیں :-

گفتار نہیں کردار | یہ بھی در اصل غریبوں ہی کی نہایت موزوں اور مثبت عملی خدمت تھی۔

غریبوں سے ملک عمر حیات خاں کی ہمدردی محض ان تقریروں پر موقوف نہ تھی، جن کے حوالے جا بجا دیئے جا چکے ہیں۔ وہ خود مدت العمر غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد اس پیمانے پر کرتے رہے کہ شائد دور حاضر میں اس کی مثال مشکل سے مل سکے۔ لیکن اس بارے میں بعض مثالیں پیش کرنا ضروری ہے، جن کا موزوں محل یہ نہیں بلکہ ان کی ذاتی سیرت ہے، جو کتاب کی مجوزہ ترتیب کے مطابق آخری ابواب میں بیان ہوگی انہوں نے ہمیشہ امداد ایسے طریقے پر کی کہ کبھی دوسرے کو معلوم نہ ہو مگر جن لوگوں نے ان کے جذبہ ہمدردی سے فائدہ اٹھایا، ان میں سے بعض نے خود یہ داستانیں بیان کر دیں۔ اس طرح یہ راقم الحروف کے علم میں آئیں:-

ایک ضروری گزارش

ملک عمر حیات خاں کو زندگی میں مختلف گروہوں سے سابقہ پڑا۔ بعض افراد اور گروہوں سے اختلاف کرنا پڑا اور بعض کی تائید و حمایت کے لئے انہوں نے اپنی سرگرمیاں برابر وقف رکھیں، لیکن یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ انہیں کسی بھی فرد یا گروہ سے مستقلاً کبھی پرخاش نہیں ہوئی وہ اصلاً محبت پرور انسان تھے البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ معاشرے میں توازن قائم رہے مسکینوں کے حقوق صرف اس وجہ سے ضائع نہ ہونے پائیں کہ وہ بے دست و پا یا بے زبان تھے اور انہیں کسی ذی اثر فرد سے نصرت و یاوری کی امید نہیں ہو سکتی تھی:- ایک حقیقت پسند

اور محب انسانیت فرد کیطرح انہیں یہ ضرور خیال تھا کہ جن جن گروہوں سے خود انہیں تعلق تھا اور جن کے حقوق ان کے علم کے مطابق خود غرضوں کے ہاتھوں پامال ہوئے تھے ان کے نقصان کی تلافی ہو جائے اور تحفظات کے ایسے انتظامات بروئے کار آجائیں کہ دوبارہ انہیں نقصان نہ پہنچایا جا سکے ۔ اخلاقی مصطلحات کے مطابق ان کا جذبۂ مخالفت و موافقت جیسا بھی تھا، عدل کے تابع تھا اور یہ یہ جذبہ ہر لحاظ سے قابل قدر تھا :۔

انیسواں باب

فوج

تمہید ملک عمر حیات خاں کو اسلامی صوبہ پنجاب اور بعض دوسرے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ فوج سے گہری دلبستگی تھی، وہ خود مدت العمر ہر نازک موقع پر فوجی خدمات انجام دینے میں پیش پیش رہے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ وطن کا دفاع تھا اور اس کے لئے وہ انتہائی ایثار و قربانی پر ہمیشہ آمادہ رہے، چنانچہ معلوم ہے کہ انہوں نے سمالی لینڈ، تبت سرحد کی جنگوں کے علاوہ پہلی عالمی جنگ میں رضا کارانہ خدمات انجام دیں، اپنے ساتھیوں کا خرچ خود برداشت کرتے رہے فرانس و بلجیم میں ان مورچوں پر ثابت قدمی سے دشمن

کا مقابلہ کرتے رہے، جہاں ہر لمحہ زندگی کے لئے انتہائی خطرے کا موجب تھا، ان کے پاؤں برف کیوجہ سے خراب ہو گئے اور ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ انہیں رخصت لے کر واپس چلے جانا چاہیے، مگر انہوں نے انکار کر دیا اور لندن میں بھی ۱۴ - ۱۵ دن سے زیادہ نہ ٹھہرے بلکہ محاذ جنگ پر واپس چلے گئے اور جب تک ان کے بریگیڈ کو یورپ سے عراق نہ بھیجا گیا، وہ وہاں سے واپس نہ آئے عراق میں بھی انہوں نے ہر خطرے کو بہ طیب خاطر قبول کیا - سپاہیوں کے روبرو تقریر کرتے ہوئے ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا :-

> میں نے کبھی سپاہیوں سے کوئی ایسا کام کرنے کی خواہش نہیں کی، جس کے لئے، پہلے خود تیار نہ ہوا، میں خطرناک گولہ باری کے اوقات میں بارہا سپاہیوں کے ساتھ رہا - میں جہاں بھی تھا اور جس حیثیت میں بھی تھا زندگی بھر سپاہیوں کی بہتری اور بہبود کے لئے کوشاں رہا :-

غرض دفاعِ وطن ان کے نزدیک ہمیشہ ایک اہم فرض رہا اور ظاہر ہے کہ اہل ملک کو وطن کی حفاظت کے لئے صحیح اصول پر تیار کرنے کی صورت اس کے سوا کچھ نہ تھی۔ اگر ہندوستانیوں میں جنگ کا جذبہ پیدا نہ ہوتا اور وہ اعلیٰ پیمانے پر جنگی تربیت حاصل نہ کر لیتے تو سوچئے کہ آزادی کے بعد حفاظت وطن کا کام کیونکر

انجام پا سکتا تھا؟

ہر پہلو پر نظر ملک صاحب کی نظر فوج کے ہر پہلو پر تھی، جب تک بکتر بند دستے وجود میں نہیں آئے تھے، موٹروں جیپوں اور ٹینکوں کا رواج نہیں ہوا تھا، صرف گھوڑوں ہی سے تیز نقل و حرکت اور بھاگتی ہوئی دشمن فوج کے تعاقب کا کام لیا جاتا تھا۔، حکومت نے نو آبادیوں میں اچھے گھوڑوں کی پرورش کا انتظام کیا تھا، چنانچہ بعض نوآبادیوں میں اچھی نسل کے گھوڑے پالنے کے لئے مربعے تقسیم کئے تھے، رسالے کے لئے جتنے گھوڑوں کی ضرورت ہوتی، وہ ہر سال انہیں نو آبادیوں سے خرید لئے جاتے، اس طرح ایک طرف اہل ملک کے ایک حصے کو زمینیں ملیں اور ان کے لئے کھیتی باڑی میں مشغولیت کا انتظام ہوا، دوسری طرف بنجر زمینیں آباد ہوئیں اور ملک کی پیداوار بڑھی، تیسری طرف رسالے کے لئے گھوڑے باہر سے خریدنے کی ضرورت نہ رہی اور گھوڑے پالنے والوں کو معقول رقمیں ملنے لگیں، مگر ملک عمر حیات خاں سمجھتے تھے کہ ایک ہی قسم کے گھوڑے پالنے سے اصل ضرورت پوری نہیں ہوتی، چنانچہ ایک تقریر میں (۱۹۱۱ء) انہوں نے فرمایا :-

گھوڑے پالنے کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اس پر جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ ہر

لحاظ سے فائدہ مند نہیں، جو گھوڑے پالے جاتے ہیں، وہ صرف میدانی علاقوں میں کام دے سکتے ہیں، حالانکہ جنگ پیش آ جائے تو کوہستانی علاقوں میں بھی گھوڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضروری ہے گھوڑے پالنے کے طریقے میں اس حد تک ترمیم کر دی جائے کہ ہمارے ہاں کے گھوڑے کوہستانی علاقوں میں بھی کام دے سکیں:۔

فوج کی اہمیت

ملک صاحب سراپا حقیقت پسند اور عملی آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ملک کا داخلی نشوونما امن و تحفظ پر موقوف ہے اور امن و تحفّظ صرف اچھی فوج کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے، انہوں نے فرمایا:۔

تمام اطراف میں ملک کے داخلی نشوونما کا انحصار امن اور تحفّظ پر ہے اور امن و تحفظ کی ضامن فوج ہے، چنانچہ میری تجویز یہ ہے کہ جب کہیں سے روپیہ ہاتھ آئے تو وہ فوج کو دینا چاہیے، مثلاً ملک کی شمالی و مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ بھی دفاعی تدابیر اختیار کرنے کی ویسی ہی ضرورت ہے، جیسی شمالی و مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ ہے، شمالی و مشرقی حصے میں بھی فوج کے لئے بارکیں بنانے کے لئے روپیہ درکار ہے۔"

دیکھئے ملک صاحب کو کچھ معلوم نہ تھا کہ دو تین سال بعد یورپ میں ایسی جنگ چھڑ جائے گی، جو عالمی جنگ کی شکل اختیار کرے گی۔ نیز اس کے بعد دوسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی جس میں جاپان ہندوستان پر حملہ کرکے ملک کے مشرقی حِصّے کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائے گا، ان میں قدرت نے سپہ گری کا ایک خاص جوہر رکھ دیا تھا، جس کی بنا پر وہ سب کچھ پیش کرتے رہے اور دوسری عالمی جنگ میں ان کی پیش بینی درست ثابت ہوئی، پھر انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ تیس چالیس سال بعد ہندوستان دو حِصّوں میں تقسیم ہو جائے گا اور شمالی و مغربی حِصّے کی طرح، شمالی و مشرقی حصہ بھی اسلامی آبادی کی اکثریت کے باعث مسلمانوں کے حوالے ہو جائے گا، اگر ملک صاحب کی تجاویز کے مطابق ۱۹۱۱-۱۲ء سے عمل شروع ہو جاتا تو ۱۹۴۷ء تک مشرقی پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بھی وسیع دفاعی استحکامات موجود ہوتے :-

بحری بیڑے کی ضرورت

ملک صاحب کو بڑی فوج کیطرح بحری فوج کو بھی ترقی دینے کا ہمیشہ گہرا احساس رہا اور بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے ذمہ دار لیڈروں نے جتنے بیانات دفاع ملک کے لئے دیئے، ان میں سے ملک عمر حیات خاں کے سوا کسی نے بحری

قوت کی ضرورت واہمیت پر بار بار زور نہیں دیا۔ ان کے ابتدائی دور میں ہوائی جہاز بھی اڑنے لگے تھے، اگرچہ ان کی ترقی کا خاص دور پہلی عالمی جنگ کے بعد شروع ہوا، چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۱ء کی تقریر میں فرمایا :-

یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستان کی اپنی بحری قوت ہو، ساتھ ہی ہوائی جہاز یا ڈرجیبل[1] ہونے چاہئیں۔ ملک کا ہر مخلص بہی خواہ دیکھ سکتا ہے کہ دوسری قومیں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور انہیں ہندوستان کی پسماندگی کے احساس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یقیناً ہماری حفاظت کے لئے اس دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت موجود ہے (یعنی برطانیہ) مگر ہمیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس بڑی بحری قوت کو بہ یک وقت مختلف سمتوں سے طلب کیا جا سکتا ہے اور اس حالت میں یہاں خاصی بحری قوت موجود رکھنے میں مشکلات پیش آئیں گی۔ ہم اس وقت تک سلطنت کے مفید رکن نہیں بن سکتے جب

---

[1] Dirigible. یہ لفظ ان غباروں کے لئے استعمال ہوتا تھا جنہیں قابو میں رکھا جا سکتا تھا، جرمنی کے ابتدائی ہوائی جہاز زیادہ تر ڈرجیبل یا زیپلن کہلاتے تھے :-

تک ہم کفیل بالذات نہ ہو جائیں یا کم از کم بڑی حد تک اپنی ضرورتوں کا بار خود نہ اٹھالیں ۔

دیکھئے ساحل ہند کی حفاظت اور اس ملک کے لئے بحری قوت کی تاسیس کا جیسا جذبہ ملک عمر حیات خاں میں کارفرما تھا اس کی نظیر بہ آسانی نہیں مل سکتی ۔

جنگی کارخانوں کی ضرورت

ملک صاحب کو یہ احساس بھی تھا کہ ملک میں جنگی کارخانے جلد سے جلد بن جانے چاہئیں، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ایک تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :-

پنجاب کی طرف سے میں ایک چیز کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم سلطنت کا ہراول ہیں۔ جب لڑائی کا وقت آتا ہے تو ہم لڑتے ہیں لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ روپیہ تقسیم کرنے والے کو ہمارا زیادہ خیال رکھنا چاہیے ۔ جناب میں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی ملک اس وقت تک ترقی کی امید نہیں رکھ سکتا، جب تک وہ بیرونی خطروں سے محفوظ نہ ہو جائے جیسا کہ ایوان کو معلوم ہے، میں اسی لئے فوج کی ہمیشہ حمایت کرتا رہا ۔ فوج ہی ملک کو محفوظ رکھنے کی ذمہ دار ہے ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ فوج کا

خرچ سال بہ سال بڑھتا جا رہا ہے، لیکن جن عوامل پر خاص توجّہ ہونی چاہیے، وہ صرف سازو سامانِ جنگ اور باقاعدہ فوج ہی نہیں، بعض اور چیزیں بھی ہیں، جب تک ہم ان کی طرف متوجّہ نہ ہونگے ہمیں کفیل بالذات نہیں سمجھا جا سکتا، جناب والا سب کو علم ہے کہ ہر توپ اور ہر دوسرے اسلحہ کی ایک خاص معیاد ہے انہیں ایک وقت تک استعمال کیا جا سکتا ہے، پھر وہ بیکار ہو جاتے ہیں اور جب تک انہیں از سر نو ڈھالا نہ جائے، کوئی کام نہیں دے سکتے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں ایسی مشینری ہو، جس میں اسلحہ ڈھل سکیں، کیونکہ ہم ہمیشہ کے لئے باہر سے سامان نہیں خرید سکتے اور اگر کوئی نازک صورت حالات پیش آ گئی تو ہمارے لئے باہر سے بر وقت سامان حاصل کرنا غیر ممکن ہو جائے گا - علاوہ بریں مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ جب تک مشینیں تیار کرنے کے لئے مشینری موجود نہ ہو گی ــــــ مشینری بھی ایک ایسی چیز ہے جو استعمال سے گھِس جاتی ہے ــــــ ہم نہ صرف فوج کے لئے ضرورت کا سازو سامان، بلکہ دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے بھی اہل نہ رہیں گے

اس غفلت کی تلافی میں کئی سال لگ گئے، دوسری عالمی جنگ کے دوران میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑا اور اس زمانے میں ملک کے لئے خطرہ موجود رہا۔ اگر برّی فوج کی طرح بحری قوّت بھی پہلے سے منظم ہو جاتی تو پاکستان اور ہندوستان کی بحری قوتیں آج بدرجہا زیادہ وسیع ہوتیں۔ اسی طرح اگر اسلحہ سازی کے کارخانے بہت پہلے قائم ہو جاتے تو آج ان ملکوں کو دفاعی ضرورت کی کوئی چیز شائد ہی باہر سے لینی پڑتی :-

افسروں کی تربیت

ایک ضروری مسئلہ یہ تھا کہ فوج کے لئے اعلیٰ افسروں کی تربیت کا مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ملک عمر حیات خاں کی برابر یہ رائے تھی کہ برطانیہ کے سینڈہرسٹ[1] اور وولچ[2] جیسے فوجی کالج ہندوستان میں بن جانے چاہیئں۔ چنانچہ الیشیر کمیٹی نے جو سکین کمیٹی کی پیشرو تھی، ایسی ہی تجاویز پیش کی تھیں۔ ملک صاحب دونوں کمیٹیوں میں شریک تھے

---

[1] :- Sandhurst برک شائر (انگلستان) کا ایک مقام ہے، جہاں مشہور رائل ملٹری کالج تھا۔ اس میں ہندوستان کے لئے فوجی افسر تربیت لیتے تھے :-

[2] Woolwich ٹیمز کے کنارے کا ایک مقام جو شاہی توپ خانے کا مرکز ہے اور یہاں توپ چلانے کی تربیت دی جاتی ہے :-

انہیں یہ احساس بھی تھا کہ فوجیں جن طبقات پر مشتمل ہیں زیادہ تر افسروں کا تعلق بھی انہیں طبقات سے ہونا چاہیے :-

اگر آپ فوجی افسر ان طبقوں میں سے لیں گے، جو فوجی خدمات کے عادی نہیں ....اور سپاہیوں کا تعلق انہیں طبقوں سے ہے تو اس میں دقت محسوس ہو گی، کیونکہ ہندوستان کی افواج میں یہی دستور پیشِ نظر رہا، ہندوستانی افسر اسی طبقے سے ہونے چاہئیں، جس طبقے سے فوجیوں کا تعلق ہے .... لہٰذا جناب والا! جب آپ کسی ایسے طبقے سے افسر چن کر لائیں گے جو کبھی فوج میں نہیں رہا اور جب سپاہیوں کو علم ہو گا کہ جس افسر کے ماتحت وہ کام کر رہے ہیں اس نے گذشتہ عالمی جنگ یا پیشتر کی جنگوں میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا تو مجھے خوف ہے وہ اسے پسند نہ کریں گے :-

ضروری فوجی مسائل

ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے ملک صاحب نے فرمایا :-

میں عوام کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب سے میں ممبر بنا ہوں، ہر ممکن موقع پر فوجی معاملات کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا رہا اور ہمیشہ ان لوگوں کی مخالفت کی۔ فوجی خرچ میں تخفیف کے مجوز تھے میں گذشتہ چھ سال سے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء

حکومت پر زور دیتا رہا کہ وہ رضا کار فوجیں تیار کرے جنگی جہاز بحری جہاز وغیرہ بنوائے اور کئی ایسے منصوبے پیش کئے جو ہندوستانی فوج کی بحری تعداد و صلاحیت بڑھانے کے لئے ضروری تھے، میں نے سپاہیوں کی پنشنوں اور زمینوں کے عطیات میں اضافے کی کوشش بھی کی ۔ اب حالات سے مجبور ہو کر ان میں سے اکثر چیزیں کی گئیں تاکہ ہنگامی ضرورت پوری ہو جائے :-

متفرق امور ملک صاحب کو فوجیوں کی دوسری ضرورتوں کا بھی احساس رہا، مثلاً یہ کہ فوجیوں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام بہتر طریق پر کیا جائے ۔ وہ میدانِ جنگ پر جائیں تو ان کے اہل و عیال کو کوئی تکلیف پیش نہ آنی چاہئے ۔ پھر سپاہیوں کی تنخواہیں اور پنشنیں بڑھانے پر وہ زیادہ سے زیادہ زور دیتے رہے اور ملک صاحب ہی کی کوشش سے سپاہیوں کے لئے خاصے پیمانے پر زمینوں کا انتظام ہوا ۔ اس طرح لوگوں کے اندر فوجی خدمت کے جذبے نے نشوونما پائی، مثلاً انہوں نے ۱۹۱۴ء کی ایک تقریر میں فرمایا کہ اگر عام سپاہیوں کی پنشنیں بڑھا دی جائیں تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا، جس کے ہم سب آرزومند ہیں :-

تقریباً ایک صدی سے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی گئی، سب لوگ مانتے ہیں

کہ مصارف معاش میں دگنا اضافہ ہو گیا ہے
لہٰذا ضروری ہے کہ پنشنوں کے اضافے پر
خاص غور کیا جائے، سپاہی زندگی کا
بہترین حصّہ ملک کی وفادارانہ خدمت میں گذار
دیتے ہیں۔ کسی کی بھی یہ خواہش نہیں ہو سکتی
کہ بڑھاپے میں وہ عسرت کا شکار بنیں۔
انہیں زمینیں دینے کا انتظام ایک نعمت غیر مترقبہ
تھا۔ اگرچہ مختلف رقبے ان کے لئے الگ کر دیئے
گئے مگر اب یہ رقبے پیشِ نظر ضرورت پوری
نہیں کر سکتے :-

ملک صاحب کی تقریروں اور تحریروں کا جو
ریکارڈ موجود ہے، اس میں فوجیوں کی فلاح و
و بہبود کے متعلق بہت سی تجویزیں اور منصوبے
شامل ہیں، انہوں نے مارشل طبقوں کی طرف سے
سائمن کمیشن کے سامنے جو یادداشت پیش کی
تھی اور جو شہادت دی تھی، وہ بھی اہل فوج
کی فلاح و بہبود کی ایک عمدہ اور قابل قدر
دستاویز ہے جو صرف اجنبی حکومت کے لئے نہ تھی
اگرچہ اسے اجنبی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا،
کیونکہ اس وقت اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہر فوجی حکومت
اس دستاویز کے بنیادی اصول سے فائدہ اٹھا
سکتی ہے۔

بیسواں باب

دلچسپ کہانیاں اور ضرب الامثال

نمائندگی کا طویل زمانہ

ملک عمر حیات خاں دو دو سال کے لئے دو مرتبہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ یہ منٹو مارلے کی اصلاحات سے پیشتر کے زمانے کا واقعہ ہے۔ جب یہ اصلاحات نافذ ہوئیں تو وہ سنہ ۱۹۱۱ سے سنہ ۱۹۲۱ تک امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ پھر مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات نافذ

ہوئیں تو انہوں نے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ کونسل آف سٹیٹ کے ممبر کی حیثیت میں گذارا ۔ اس اثناء میں انہوں نے جو تقریریں کیں، ان کا مجموعہ خاصا ضخیم ہے ۔ وہ بجٹ پر عموماً ایک جامع تقریر فرمایا کرتے تھے اس کے علاوہ ہر ضروری مسئلے کے متعلق جچی تلی رائے مدلّل طریق پر پیش کیا کرتے تھے ۔ ان تمام مباحث کے سلسلے میں ان کے آراء و نظریات جداگانہ ابواب میں خاص ترتیب سے پیش کئے جا رہے ہیں، یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں بعض اوقات نقطۂ نگاہ کی توضیح کے لئے کوئی نہایت دلچسپ کہانی یا پنجابی فارسی اور اردو کی موزوں ضرب المثل بھی پیش کیا کرتے تھے جس سے تقریریں خاصی دلآویزی پیدا ہو جاتی تھی ۔

یہ واضح کر دینا چاہیے کہ وہ عربی یا فارسی کے بڑے عالم نہ تھے ۔ لیکن جو کچھ بھی انہوں نے پڑھا تھا، ذہن میں محفوظ تھا اور استحضار کی یہ کیفیت تھی کہ جب ضرورت پیش آتی کوئی نہ کوئی موزوں شعر رباعی ضرب المثل یا مقولہ ضرور پیش کر دیتے تھے، ذیل میں ان کی تقریروں سے چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

گریۂ مسکین اور کنجشک

ایک موقعہ پر یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جن وسائل نشر و اشاعت کو بے ضرر سمجھا جاتا ہے، انہیں موقع مل جائے تو مخالفین کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں ۔ وہ

بہ ظاہر بڑے حلیم اور امن پرور معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی مضرت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے سعدی کا یہ مشہور شعر بے تکلف پیش کر دیا۔

گربۂ مسکیں اگر پر داشتے
تخم گنجشک از جہاں برداشتے[1]

یعنی اگر مسکین بلی کے پر ہوتے تو وہ چڑیوں کی نسل کا استیصال کر دیتی۔

ہندوستان کی مختلف قومیں اور فوجی خدمت

امپریل لیجسلیٹو کونسل میں ایک قرارداد پیش ہوئی تھی، جس کا مدعا یہ تھا کہ جبری فوجی ترتیب اور خدمت کے لئے ایسا انتظام کیا جائے جو ملک کے حالات کے پیش نظر موزون ہو، ملک عمر حیات خاں کو اصل مقصد سے اصولاً اختلاف نہ تھا لیکن وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس سے فوج کی صلاحیت و استعداد کو نقصان پہنچے گا اور جن قومی و ملکی گروہوں نے پشت ہا پشت سے فوجی خدمات کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، ان کی جگہ ایسے گروہ لائے جائیں گے، جنہیں ان خدمات کا نہ کوئی تجربہ ہے اور نہ وہ خطرے کے مقام پر ملکی دفاع کا فرض انجام دے سکتے ہیں ایک مرتبہ ایسا تجربہ کیا جا چکا تھا اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا اور تجربہ زک کرنا پڑا تھا۔ ملک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے یہ تمام تفصیلات بیان کیں پھر عربی کی اس

---

[1] ملک عمر حیات خاں کی تقریروں کا مجموعہ صفحہ ۲۹

مشہور ضرب المثل کا حوالہ دیا کہ :-

من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ[1]

یعنی جس نے آزمودہ کو آزمایا اسے یقیناً ندامت سے سابقہ پڑے گا۔

بنیا اور گائے

کینیا میں ہند... پناہ ... کی حیثیت کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ملک صاحب نے فرمایا، اس مسئلہ پر ہندوستانیوں کی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ صرف باتیں کرتے رہتے ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ اس پر بنیے کی حکایت یاد آ گئی جس کی گائے پر شیر نے حملہ کیا اور مار کر اسے کھانے لگا۔ بنیے نے اپنی کتابیں نکالیں اور شیر سے کہا :- تمہیں کیونکر یہ حق حاصل ہوا کہ میری گائے کھا جاؤ؟ شیر نے جواب میں دھاڑنا کافی سمجھا، بنیے نے شیر کی یہ کیفیت دیکھی تو بولا کہ اگر تمہارے نزدیک انصاف یہی ہے تو بہت اچھا میں اپنا دعویٰ واپس لیتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ اس بارے میں ایک ہندوستانی مثل بھی ہے :-

جس کی لاٹھی اس کی بھینس[2]

خانۂ انوری کجا باشد

۱۹۲۵ء میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوتے ملک صاحب نے سب سے پہلے مسلمانوں کا معاملہ پیش کیا اور کہا کہ میں ان کا نمائندہ ہوں اور ان کی نمائندگی مجھ پر واجب ہے

---

[1] تقریروں کا مجموعہ ص۱۰۹ - [2] ایضاً ص۱۰۸ -

ساتھ ہی کہا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت اس حصّہ ملک میں زراعت پیشہ ہے ۔ جس سے میرا تعلق ہے ، یعنی پنجاب اور ان کی نازک حالت کے سلسلے میں مجھے بے اختیار فارسی کے ایک بڑے شاعر کے شعر یاد آ گئے ۔

ہر بلائے کز آسمان آید
گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پرسد
خانہ انوری کجا باشد[1]

یہ انوری کے شعر ہیں ۔ مطلب یہ کہ آسمان سے جو بلا نازل ہوتی ہے ، اگرچہ وہ دوسرے کیلئے مقدر ہو ، لیکن زمین پر پہنچنے سے پیشتر ہی پوچھتی ہے کہ انوری کا گھر کہاں ہے تاکہ اسپر جا گرے ؟

گریہ اور پلنگ

۱۹۳۶ء میں بجٹ پر عام بحث شروع ہوئی تو ملک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں اتنے مسائل پیش کئے تھے ، جن سے زیادہ مسائل اب تک میرے رفیقوں میں سے کوئی شخص پیش نہ کر سکا ، میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا :۔ ہندوستان کے سواحل کی حفاظت کے لئے خود اس کی بحری قوّت ہونی چاہیئے ، ممکن ہے کسی وقت انگلستان کو اپنے سواحل کی حفاظت کے سلسلے میں اتنے جہازوں کی ضرورت پیش آجائے کہ وہ ہندوستان کے لئے زیادہ جہاز نہ دے سکے ، میں خوش ہوں کہ ہمارے

---

[1] تقریروں کا مجموعہ صفحہ ۱۴۹

لئے بحری قوت کا انتظام ہو گیا ہے - اس طرح ہمارے نوجوانوں کے لئے روزگار کا ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے - خشکی پر لڑنے والے لوگ پیچھے بھی ہٹ سکتے ہیں لیکن بحری جنگ میں کسی کے لئے پیچھے ہٹنے کا امکان نہیں اور ایسے مواقع پر تھوڑی قوت بھی زیادہ قوت کا بے پناہ مقابلہ کر سکتی ہے جیساکہ فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے :-

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود
برآرد نہ چنگال چشم پلنگ

یعنی جب بلی کے لئے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہے تو وہ اتنی جری بن جاتی ہے کہ پنجہ مار کر چیتے کی آنکھیں نکال دیتی ہے -

لذیذ مٹھائیوں کے رسیا مریض کا قصہ

حکومت نے محاصل کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی - اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو گئی جو انگریزی میں تھی اور اس کا نہ تو ترجمہ شائع ہوا تھا اور نہ اس پر اخبارات میں بحث ہوئی تھی - حکومت چاہتی تھی کہ یہ رپورٹ زیر غور رہے - ملک صاحب فرماتے تھے کہ جس طبقے سے میرا تعلق ہے وہ اسّی فیصد ہے - اس تک یہ رپورٹ ابھی پہنچی ہی نہیں - جب اس کا ترجمہ ہو گا میرے طبقے کے لوگ اسے پڑھیں گے، اس کے مختلف پہلوؤں پر اخباروں میں بحث ہو گی تو پھر کوئی رائے قائم کرنے کا موقعہ آئے گا - حکومت نے اس رپورٹ کے بارے میں وہی طریقہ اختیا

کیا ہے، جو ڈاکٹر مریض کے متعلق اختیار کیا کرتا ہے یعنی یہ کہ وہ مریض کو بچا نہیں سکتا تو کوشش کرتا ہے کہ جس حد تک ممکن ہو اسے زندہ رکھا جائے۔ اس پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک شخص گر پڑا اور اسے سخت چوٹ آئی، لوگ مختلف تدبیریں پیش کر رہے تھے، ایک نے کہا کہ اسے لذیذ میٹھی چیزیں کھانے کو دو تاکہ اس کے جسم میں قوت آ جائے۔ مریض بولا کہ دواؤں کو چھوڑو اور اس شخص کی بات پر کان دھرو[۱]، ہمارے لئے بھی ایسا ہی نسخہ تجویز ہو رہا ہے :-

متفرق مثالیں

اسی طرح ان کی تقریروں میں جا بجا مقولے اشعار اور ضرب الامثال موجود ہیں مثلاً :-

۱ - کھادا پیتا لاہے دا، باقی احمد شاہے دا[۲] :-

۲ - چہ بر تخت مردن، چہ بر روئے خاک[۳]

۳ - تنگ آمد بہ جنگ آمد[۴] :-

۴ - ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے[۵] :-

دلچسپ حکایتیں

ملک صاحب کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ تھی کہ مختلف مسائل کو دلچسپ

---

[۱] تقریروں کا مجموعہ ص ۱۹۵ [۲] - ایضاً ص ۱۱۶ [۳] - ایضاً صفحہ ۱۳۱
[۴] ایضاً ۱۳۶ [۵] ایضاً

حکایات کے ذریعے سے اس درجہ واضح کر دیتے تھے کہ زیادہ تشریح کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، مثلاً ایک موقعہ پر وہ سر فیروز سیٹھنا کو جنگ کی اہمیت جتانا چاہتے تھے، اس موقعہ پر ایک دلچسپ حکایت سنائی۔ فرمایا:-

ایک اندھا آدمی تھا اس کے ایک دوست نے پوچھا، انڈا کھاؤ گے؟ اندھے نے پوچھا، انڈا کیا ہوتا ہے؟ دوست نے جواب دیا ایک سفید اور گول چیز ہوتی ہے۔ اندھے نے پھر پوچھا سفید کیا چیز ہے؟ دوست نے جواب دیا کہ وہ آرٹستانی پرندے کے رنگ کا ہوتا ہے، اندھے نے تیسری مرتبہ سوال کر دیا وہ پرندہ کیسا ہوتا ہے؟ دوست نے پرندہ پکڑ رکھا تھا، اس کی گردن اندھے کے ہاتھ میں دے دی تاکہ وہ چھو کر اندازہ کرے۔ اندھے نے گردن کو چھوا اور کہا کہ اگر انڈا ایسا ہی ہوتا ہے تو افسوس کہ میں اسے نگل نہ سکوں گا، ملک عمر حیات خاں نے یہ حکایت سنا کر فرمایا کہ جس شخص نے جنگ نہیں دیکھی اس کے ذہن میں جنگ کا تصور پیدا کرنا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا اندھے کے دل میں انڈے کا تصوّر پیدا کرنا:-

اور یہ بالکل درست ہے کہ جن لوگوں نے جنگ کے حالات صرف اخباروں میں پڑھے تھے اور اس سے زیادہ انہیں قطعاً آگاہی نہ تھی وہ جنگ کی ہولناکیوں، تباہ کاریوں یا ملک و قوم کے لئے اس کی اہمیت کا اندازہ کیوں کر کر سکتے

تھے۔ یہ اندازہ تو انہیں جانبازوں کو ہو سکتا تھا، جنہوں نے خود میدانِ جنگ کی مشقتیں اٹھائیں، اور سختیاں جھیلیں، جنہوں نے آگ اور خون کے طوفان میں قدم جما کر جابرانہ اقدامات کا مقابلہ کیا۔



فری میسن تنظیم میں ملک صاحب کو "قابل احترام" ماسٹر کا عہدہ تفویض کرنے کی رسم کا ایک منظر



ملک صاحب ہیسٹنگز (انگلستان) میں منعقد ہونے والے شطرنج کے عالمی میچ میں

اکیسواں باب

ملک عمر حیات خاں کا روزنامچہ

تمہید

ملک عمر حیات خاں کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ انہوں نے اپنا روز نامچہ باقاعدگی سے لکھا اگرچہ بعض اندراجات بہت مختصر ہوتے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے لکھنا ترک کیا ہو۔ مگر افسوس کہ بعض روز نامچے سوء اتفاق سے مل نہ سکے

گویا ان کی زندگی کے واقعات اور مشغولیتوں کا یہ ریکارڈ مکمل نہ رہا میرے سامنے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کے متفرق روزنامچے موجود ہیں، جن میں سے بعض واقعات یہاں نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں ان سے ان کی زندگی کے بعض واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو کسی عنوان کے تحت نہیں آئے میں ان واقعات کو مختلف عنوانوں کے ذیل میں درج کرتا ہوں :-

عالمی جنگ

مثلاً عالمی جنگ کے متعلق چند اندراجات ملاحظہ فرمائیے۔

۱- ۱۱ راگست ۱۹۱۴ء :- درخواست کی کہ میں ..... رضاکارانہ بلا تنخواہ لڑائی کے سلسلے میں فرانس جانا چاہتا ہوں درخواست منظور ہوئی۔

۲- ۱۴ اگست :- شملہ میں کمانڈر انچیف سے مل کر جنرل ایجرٹن کے پاس فیروز پور پہنچا جو فیروز پور بریگیڈ کے کمانڈنگ افیسر تھے۔ مجھے جنرل موصوف ہی کے سٹاف پر متعین کیا گیا تھا :-

۳- ۲۶ راگست گھر پہنچ کر سفر کی تیاری کی پھر جنرل ایجرٹن کے پاس کراچی پہنچ گیا۔ ۲۶ر کو کراچی سے ہمارا جہاز روانہ ہوا۔ اسی جہاز میں ۱۲۹ بلوچی پلٹن تھی۔

۴- ۱۷ ستمبر: سویز سے ریل پر قاہرہ گئے۔ ۱۷ تک وہیں رہے۔ تمام پرانے مقامات اور حنوط کردہ لاشیں دیکھیں انہیں میں

سے ایک لاش (ممّی) اس فرعون کی تھی جو حضرت موسےٰ علیہ السلام کے وقت میں تھا۔

۵ ۔ یکم اکتوبر :۔ ۱۸ ستمبر کو اسکندریہ سے جہاز پر سوار ہو کر ۲۶ ستمبر کو مارسائی پہنچے اور ۱۹ ستمبر کو مارسائی سے ریل کے ذریعے اورلیان پہنچے۔ اسی طرح مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے ۲۹ اکتوبر تک مورچوں میں جا پہنچے۔ اور ۳۱ دسمبر تک مورچوں ہی میں رہے اس اثناء میں سخت گولہ باری ہوتی رہی۔ جس میں ۱۲۹ بلوچی پلٹن کا سخت نقصان ہوا ایک لڑائی کے بعد صرف اڑھائی سو آدمی بچے۔

۶ ۔ ۲۵ فروری ۱۹۱۵ء :۔ یکم جنوری تک میرا پاؤں برف کیوجہ سے بہت خراب ہو گیا لہذا چودہ دن کی رخصت لے کر فرانس سے لندن گیا، پھر محاذ جنگ پر واپس آ گیا۔

۷ ۔ ۱۵ جون :۔ پاؤں کی تکلیف دور نہ ہوئی ۹ جون کو دوبارہ لندن جانا پڑا۔ ایک میڈیکل بورڈ نے میرے پاؤں کا معائنہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے رخصت پہ واپس بھیج دینا چاہیے میں نے رخصت لینے سے انکار کیا اور تین روز لندن ٹھہر کر پھر فرانس واپس آ گیا۔

۸ ۔ ۱۴ دسمبر :۔ ۱۱ دسمبر تک محاذ جنگ پر رہا پھر مجھے عراق بھیج دیا گیا اپنے بریگیڈ کے ہمراہ مارسائی پہنچا۔ وہاں سے آرکیڈیا جہاز پر روانہ ہوا۔ ۱۲۹ بلوچی

پلٹن نمبر ۴۰ پٹھان پلٹن نمبر ۱۱ ہاسپٹل پلٹن اور گھاگرا پلٹن بھی اسی جہاز میں سوار تھی۔

۹ - ۸ جنوری ۱۹۱۶ء کو بصرہ پہنچے اور وہاں کی لڑائی میں شرکت کی۔

اسی طرح باقی جنگی سرگرمیوں کی کیفیت تفصیل سے بیان کی ہے یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں جنگ افغانستان کی کیفیت بھی ترک نہیں کی۔

اسلامی معاملات ملک صاحب کی سرگرمیوں کا ایک اہم دائرہ اسلامی معاملات تھے ان کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے:۔

۱- ۷ر اگست ۱۹۰۸ء:۔ انجمن اسلامیہ شملہ کا وفد گورنر کی خدمت میں جانے والا تھا۔ میرے ذمہ یہ کام لگا تھا کہ اس وفد کے تمام معاملات ترجمان کی حیثیت سے پیش کروں - چنانچہ میں نے انجمن کے سکرٹری کے علاوہ میاں فضل حسین، میاں محمد شفیع نواب ذوالفقار علی خاں اور دوسرے اصحاب کے مشورے سے تیاری کی اور ۸ ر کو ساڑھے گیارہ بجے صبح انجمن کی طرف سے سپاس نامہ گورنر کے پاس پیش کر دیا۔

۲- ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شامل ہوا۔

۳- ۲۳ر اپریل ۱۹۱۶ء:۔ مجھے انجمن حمایت اسلام کے ایک اجلاس کی صدارت دی گئی۔ میں نے اس موقعہ پر ایک تقریر کی اسے پسند کیا گیا۔

۴ - ۱۱ر مئی ۱۹۱۹ء :- برکت علی محمڈن ہال میں شاہی مسجد کی کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا میں نے بھی اس میں شرکت کی :-

۵ - ۹ر جولائی ۱۹۲۵ء :- پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے ایک وفد شملہ میں گورنر کے پیش ہوا - میں اس وقت وفد کا رئیس تھا -

۶ - ۳۱ر مئی ۱۹۲۷ء :- ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر ہوئی تھی کہ غور کرے آیا مرکزی بنک صرف حکومت کا ہو یا اس میں حصہ دار بھی شامل کئے جائیں ؟ میں نے اس مسئلے پر بحث کی نیز مسلمانوں اور زمینداروں کے تناسب بہ لحاظ آبادی پر زور دیا -

۷ :- ۲ر جولائی مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ایک وفد گورنر کے پاس شملہ لے گیا -

۸ :- ۲۰ جولائی :- بنک کمیٹی میں میں نے مسلمانوں اور زمینداروں کو بہ لحاظ آبادی حصہ دینے کی تجویز پیش کی اور اس پر سخت بحث ہوئی -ہندو ممبروں نے میری سخت مخالفت کی :-

۹ - ۲ر ستمبر:مسلمانوں کی طرف سے شملہ میں ایک اعلان پہ دستخط کرائے جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم جداگانہ نیابت کے حق میں ہیں اور مخلوط نیابت کے خلاف ہیں -

۱۰ - ۱۷ ستمبر ۱۹۲۸ء: مسلمانانِ شملہ کی تکالیف کے متعلق میں ایک وفد گورنر کے پاس لے گیا۔

۱۱ - ۵ نومبر ۱۹۲۸ء:- میں نے مسلم لیگ کے وفد میں شرکت کی۔

ذاتی: روز ناموں میں ایسے حالات کا بھی خاصا ذکر ہے جن کا تعلق محض اُن کی ذات سے تھا۔ مثلاً وائسرائے کا جلوس دہلی میں نکلا (دسمبر ۱۹۱۲ء) تو میں نے قلعہ میں پولیس کا انتظام کیا۔ یا بادشاہ کے تاجپوشی کے سلسلے میں مجھے لندن بھیجا گیا اور جب بادشاہ کی تاجپوشی دہلی میں ہوئی تو مجھے ڈپٹی ہیرلڈ بنایا گیا اور میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر بلند آواز سے بادشاہ کے اعلان کا اردو ترجمہ سنایا۔ بعض چیزیں بالکل ذاتی ہیں:-

۱ - ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء :- عزیزی خضر حیات خاں کو چیفس کالج میں داخل کیا۔

۲ - یکم نومبر ۱۹۱۲ء:- وائسرائے (لارڈ ہارڈنگ) میرے چک خضر آباد میں آیا اس غرض سے میں نے اٹھائیس دن کے اندر ایک نئی کوٹھی تیار کرا لی۔ وائسرائے کے ہمراہ پنجاب کا گورنر اور دوسرے افسر بھی تھے۔

۳ - ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۲۴ء :- عزیزی خضر حیات خاں کی شادی ہوئی میں نے تمام مزارعین اور برادری میں کپڑے تقسیم کرائے۔

۴ - ۱۴ ر جولائی ۱۹۲۵ء :- میں شملہ میں تھا کہ عزیزی خضر حیات خاں کے بیٹے کی ولادت کی تار مظفر آباد سے رات کے بارہ بجے ملا - میں نے بارگاہ حقیقی کی بارگاہ میں.... شکرانے کے نفل ادا کئے - اور بچے کا نام نصر حیات خاں رکھا -

۵ - ۱۸ ر اگست ۱۹۲۷ء : عزیزی نصر حیات خاں کی وفات کا تار ملا - جو افسوس ہوا - وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا :-

۶ - ۱۷ نومبر ۱۹۲۷ء : عزیزی خضر حیات خاں کے دوسرا بیٹا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پیدا ہوا - شکرانے کے نفل ادا کئے بچے کا نام نظر حیات خاں رکھا گیا -

۷ - ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء :- سر جان سائمن (سائمن کمیشن کا صدر) اور لارڈ برہم مجھ سے ملنے کے لئے میری کوٹھی (دہلی) میں آئے - سر جان سائمن نے میرے ساتھ شطرنج کھیلی - میں ہار گیا اور اس پر وہ بہت

خوش ہوئے۔

۸ - ۱۹ فروری :- دہلی سے میں شکار کے لئے گیا۔ تو مہاراجہ بڑودہ اور جنرل جرسی نیز .... متعدد افسر میرے ساتھ تھے۔

۹ - ۲۱ مارچ :- مارشل کلاسز (فوجی خدمت انجام دینے والے طبقے) کا ایک وفد لاہور میں سائمن کمیشن کے پاس گیا۔ میں اس کا رئیس تھا اور اس وفد کی طرف سے ایک سپاس نامہ بھی کمیشن کے سامنے پیش کیا اس کے بعد اسی روز چیفس ایسوسی ایشن (انجمن روساء پنجاب) کی طرف سے بھی ایک سپاس نامہ پیش ہوا۔

۱۰ - ۶ نومبر :- میں زمیندار ایسوسی ایشن کا آنریری سیکرٹری تھا اور میں نے خود ایک وفد زمینداروں کی طرف سے لے جا کر سائمن کمیشن کے روبرو پیش کیا۔

۱۱ - ۶ نومبر :- میں نے فوجی خدمات انجام دینے والے طبقوں کی طرف سے ایک وفد کی سرکردگی کی اسے سائمن کمیشن کے روبرو پیش کیا۔ ایک یادداشت پہلے سے تیار کر لی گئی تھی وہ کمیشن کے روبرو پیش کر دی مگر کسی نے اس پر

جرح نہ کی۔

۱۲ - ۶ نومبر ۱۹۲۸ء :- میں نے چیفس الیوسی ایشن کے وفد کی بھی سرکردگی کی۔ صرف ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے جرح کی میں نے جرح کے ایسے جوابات دیئے۔ جو ڈاکٹر نارنگ کے افکار کی پرزور تردید تھے۔

بائیسواں باب

ملک عمر حیات خاں انڈیا کونسل میں

انڈیا کونسل کی رکنیت

ملک عمر حیات ابھی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے کہ ۱۹۲۹ء میں انہیں انڈیا کونسل کی رکنیت کے لئے چن لیا گیا اور ۱۹۳۴ء تک وہ اس رکنیت پر فائز رہے۔ پانچ سال کی اس مدت میں انہوں نے جو خدمات انجام دیں وہ بہ لحاظ نوعیت سابقہ خدمات سے مختلف یا جداگانہ نہیں، زیادہ تر وہی مسائل ان کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و مرجع رہے جن میں ان کی پبلک زندگی کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا اور اس سلسلے میں

کوئی نیا معاملہ بہ ظاہر سامنے آ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ صوبائی قانون ساز مجلس یا مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ یا انڈیا کونسل کے دوائر کار یقیناً الگ الگ تھے، مگر جو مسائل ملک و قوم کے متعلق ان میں پیش ہوتے تھے، وہ مختلف نہ تھے۔

انڈیا کونسل کا طریقِ کار

سب سے پہلے انڈیا کونسل کا طریقِ کار پیش نظر رکھ لینا چاہیے۔ مختلف معاملات کے متعلق اس کے ارکان کی سب کمیٹیاں (ماتحت مجالس) بنا دی جاتی تھیں، ان سب کمیٹیوں کے فیصلے کونسل کے ارکان کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے۔ جن فیصلوں پر سب متفق ہوتے، وہ وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کے فیصلے سمجھے جاتے، جن مسائل پر اختلاف ہوتا صرف ان کے متعلق کونسل میں بحث کی جاتی۔ ارکان کے نوٹوں کو وہی حیثیت دی جاتی، جو قانون ساز مجلسوں میں تقریروں کو یا کابینہ میں وزرا کی تصریحات کو حاصل ہوتی ہیں۔

اسی وجہ سے ممبروں کے مرتبہ نوٹ محفوظ رکھے جاتے تھے، لیکن انہیں بہ صیغہ راز رکھا جاتا تھا، ملک صاحب کی جو یادداشتیں ہم تک پہنچ سکیں۔ ان میں سے بہت کم نوٹوں کے مسودے محفوظ رہ سکے اور ان میں سے بعض نوٹ ایسے ہیں، جن کا پورا مفہوم واضح نہیں، لیکن جو کچھ بھی محفوظ رہ گیا، اس سے قطعی طور پر واضح ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے اپنا وہ کام برابر جاری رکھا جو پیشتر بیس اکیس برس تک ہندوستان کی مختلف

قانون ساز مجالس میں انجام دیتے رہے تھے۔

کام کی نوعیت و اہمیت

اس سلسلے میں ایک بالغ نظر اور واقف حال مبصر نے چند فقرے تحریر فرمائے ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان کا مفہوم یہاں پیش کر دیا جائے، ملبصر لکھتا ہے:

اس دور میں ملک صاحب کی پالیسی چند معین اور واضح اصولوں پر مبنی رہی جب انہیں احساس ہوتا کہ زمیندار ـــــــ جنہیں ہندوستان جیسے زرعی ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی ـــــــ مالیے کی بھاری شرح کے بوجھ سے ہیجیخ رہے ہیں یا غلط قوانین کا ہدف بن گئے ہیں تو وہ حکومت یا ہر دوسری پارٹی کے خلاف بے تامّل زمینداروں کا ساتھ دیتے رہے۔ اس کے برعکس جب انہیں احساس ہوتا کہ بعض ایسے اثرات بھی کارفرما ہیں، جن سے ملک کے نظم و امن میں خلل پیدا ہوگا تو وہ امن و نظم اور قانون کی قوتوں کو تقویت پہنچاتے رہے۔ جب کبھی انھیں موقع ملتا تو وہ اپنے علاقے میں مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کے بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرتے اور انہیں پُر زور تلقین کرتے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات ختم کرکے اپنے ملک کی بہبود عامہ کے لئے متحدہ طریق پر کام کریں۔ اگر ان پر واضح ہو جاتا کہ حکومت کے موجودہ و مروجہ قوانین اہل ہند کی راحت کے ضامن نہیں بن سکتے تو وہ سب سے پہلے ان قوانین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے۔

جو ملک آزادی کے لئے جد و جہد کر رہا ہو، اس میں رائے اور فکر و نظر کا اختلاف غیر اغلب نہیں، لیکن اگر ملک کے مفاد اور اس کی بہبود عامہ کو اصولاً پیشِ نظر رکھا جائے تو ملک صاحب کی محولہ بالا پالیسی کو اعتدال و توازن کے نقطۂ نگاہ سے محکم قرار دینے میں کیسے تامل ہو سکتا ہے؛ بہرحال اس سے اندھا دھند اختلاف کی تو بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں۔

کاغذات کی حیثیت

انڈیا کونسل کے متعلق ملک صاحب کے جو کاغذات یا نوٹ محفوظ رہ گئے وہ سینتیس ۳۷ مختلف عنوانوں کے تحت مرتب ہوئے۔ ان سب پر تبصرہ ممکن نہیں، لیکن چند ضروری نوٹ خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً چند نوٹوں کا تعلق فوج سے ہے اور فوج کے ساتھ ملک صاحب کا تعلق محض نظری نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ عملی ہے۔ کم و بیش چار نوٹ زمینداروں کے متعلق ہیں اور کم از کم پانچ اسلامی حقوق سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان نوٹوں میں زیادہ تر وہی باتیں کہی گئیں ہیں، جو ہم سابقہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ زراعت کے متعلق جتنے نوٹ ہیں، ان میں زمینداروں خصوصاً غریب کسانوں کے حقوق پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ایک موقع پر کسان یا زمیندار کی ساڑھے گیارہ ایکڑ زمین فرض کر کے تفصیل سے بتایا ہے کہ حقیقی آمدنی کے مقابلے میں خرچ زیادہ ہوتا ہے اور جب تک چھوٹے زمینداروں کے لئے زیادہ سے زیادہ رعایت کا انتظام نہ کیا جائے۔ وہ اپنی..

حالت بہتر بنانے کے بجائے اس کا تحفظ بھی نہیں کر سکتے اور اس سے زراعت پر جو ضرب لگے گی، وہ اس طبقے کو تباہ کر دے گی، جسے ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، یعنی جس پر ملک کی زندگی کا انحصار ہے :-

مسلمانوں کے حقوق

مسلمانوں کے حقوق پر گفتگو کرتے ہوئے ملک صاحب نے نہایت دلیری سے میثاق لکھنؤ کی مذمت کی ہے، جس میں برادران ہنود نے مسلم اقلیت والے صوبوں کے لیڈروں کی ہمنوائی کرتے ہوئے ہندوستان کے دو بڑے صوبوں کی مسلم اکثریتیں تباہ کر ڈالی تھیں اور ان کے بدلے میں مسلم اقلیتوں کو زیادہ حقوق دے دیئے تھے، حالانکہ مسلم اقلیتیں زیادہ حقوق لے کر بھی اقلیتیں ہی رہیں اور مسلم اکثریتوں کی بربادی سے ملت اسلامیہ کی عمومی حیثیت پر شدید ضرب لگی،

یہ میثاق ۱۹۱۶ء میں بہ مقام لکھنؤ تجویز ہوا تھا۔ سیاسی حقائق کا صحیح اندازہ رکھنے والے مسلمانوں نے ۱۹۱۶ء ہی سے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ حکومت نے مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کی بنا پر ملک کا جو دستور مرتب کیا، اس میں فرقہ دار معاملات کے متعلق میثاق لکھنؤ ہی کا تناسب پیش نظر رکھا اور ایک مزید خرابی پیدا کر دی یعنی میثاقِ لکھنؤ میں تو مسلموں غیر مسلموں کے تناسب کا فیصلہ ہوا تھا، حکومت نے اس تناسب میں انگریز اور سرکاری ممبروں کا حصہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حصے میں سے نکال کر الگ کر لیا اس طرح مسلمانوں کے تناسب میں مزید کمی ہو گئی خصوصاً بنگال اور پنجاب میں :-

غرض میثاق لکھنؤ کے وقت سے مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ اس کی مخالفت اور پنجاب و بنگال میں اکثریتوں کی بحالی کے لئے وقف رہا اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۲ء تک (جب فرقہ دار فیصلہ جاری ہوا) یہ جدوجہد پوری سرگرمی سے جاری رہی بلکہ اِسی جدوجہد نے آگے چلکر تحریک پاکستان کی شکل اختیار کی کیونکہ برادران وطن کسی بھی منصفانہ فیصلے پر آمادہ نہ تھے۔

ملک عمر حیات خاں نے مسلمانوں کی طرف سے جتنے مطالبات پیش کئے ان میں سے پہلا بڑا مطالبہ یہی تھا جو دراصل ملت اسلامیہ کی متفقہ صدا تھا۔

ملازمتوں کا معاملہ

اسی طرح مسلمانوں کی ملازمتوں کا مسئلہ برابر ملک صاحب کے سامنے رہا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان تعلیم میں پسماندہ رہ گئے اور ملازمتوں میں اس وقت شامل ہونے لگے، جب برادران وطن بیشتر چھوٹے بڑے عہدوں پر قابض ہو چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کا شمول طبعاً پسند نہیں کرتے تھے، اس وجہ سے کشمکش شروع ہوئی۔ برادران وطن نے مسلمانوں کی مخالفت میں کبھی یہ صدا بلند کی کہ ملازمتیں قابلیت کی بنا پر ملنی چاہئیں، کبھی یہ کہا کہ مسلمان فرقہ پرست ہیں اور وہ ملکی معاملات میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا رہے ہیں، حالانکہ اصل معاملہ بالکل دوسرا تھا یعنی ملازمتوں پر ملک کا نظم ونسق موقوف تھا اور جب نظم ونسق میں مسلمانوں کو ان کے تناسب کے مطابق حیثیت حاصل نہ تھی۔ اسے کوئی بھی شخص منصفانہ

نقطۂ نگاہ سے ملکی نظام قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی حیثیت تو یہ تھی کہ پہلے انگریز تمام معاملات پر قابض تھے۔ پھر اقتدار کے جتنے عہدے انگریزوں نے اہل ملک کے حوالے کئے۔ ان پر برادران وطن قابض ہو گئے اور مسلمان جہاں تھے وہی رہے۔

ملک صاحب نے اپنے نوٹوں میں بعض بڑے دلچسپ حقائق پیش کئے مثلاً یہ کہ ریلوے کی بیشتر ملازمتوں پر یوریشین اور مسیحی قابض تھے پھر انہوں نے دوسری ملازمتوں کے لئے بھی مطالبہ شروع کر دیا۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ یقیناً ان کے بھی حقوق ہیں۔ مگر یہ تو مناسب نہیں کہ ایک خاص دائرے میں وہ تنہا اجارہ دار بن جائیں اور دوسرے دائروں میں جداگانہ حقوق کے طلبگار ہوں۔

فوج فوج کے سلسلے میں کئی مسائل سامنے آئے۔ مثلاً پہلی عالمی جنگ میں حکومت نے فوجی بھرتی کے لئے ان لوگوں کو ترجیح دی تھی جو پیشتر سے فوجی خدمات انجام دینے میں خاص شہرت حاصل کر چکے تھے اور مارشل قوموں میں شمار ہوتے تھے۔ جنگ ختم ہو گئی تو رفتہ رفتہ ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جن کا مدعا یہ تھا کہ مختلف صوبوں کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے ملک عمر حیات خاں کو اس نظریئے سے اصولاً اختلاف نہ تھا مگر وہ کہتے

تھے کہ دو بنیادی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔
۱۔ اُن لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے۔ جو فوجی خدمات انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یعنی میدان جنگ کی "طبعی" مشقتوں اور زحمتوں کا مقابلہ صبر سے کر سکیں اور جنگ میں بہادروں کی طرح لڑیں:۔
۲۔ ان طبقوں اور قوموں کا خاص خیال رکھا جائے، جو نہایت نازک وقت میں ملک کی حفاظت اور جنگی شہرت کی بقا کے لئے شاندار خدمات انجام دے چکے ہیں انہیں باتوں پر وہ خاص زور دیتے رہے، ساتھ ہی یہ فرمایا کہ فوجی معاملات کو سیاسیات سے الگ رکھنا چاہیے۔ جسمانی صحت اور خاندانی روایات کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ان امور کو بہر حال مقدم رکھنا چاہیے۔ جو نئے طبقے فوج میں آنا چاہیں، ان کا خیر مقدم ہم تہ دل سے کریں گے مگر پہلے انہیں اپنی صلاحیتوں کے لئے محکم ثبوت بہم پہنچانا چاہئے۔
اسی طرح وہ ہندوستان کے لئے زبردست بحری اور فضائی قوت کی تعمیر پر زور دیتے رہے اور اپنے نوجوانوں کو تلقین کرتے رہے۔ کہ ہم یقیناً آزادی کے حق دار ہیں۔ لیکن آزادی کے

لوازم و واجبات نظر انداز نہیں کرنے چاہئیں اور اس سلسلے میں فوجی بحری اور ہوائی قوت کو سب چیزوں پہ تقدم حاصل ہے :-

---



ملک صاحب کی اس کتیا نے انگلستان میں کتوں کی دوڑ جیتی تھی



سالسبری (انگلستان) کے میدان میں بازداری کے مقابلے کے لئے اپنی
بہری کو لیجا رہے ہیں - ملک صاحب Falconers' Club
کے صدر تھے -

تیئسواں باب

سفرِ حج

حج کا ارادہ

۱۹۳۵ء میں ملک صاحب نے حج کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس زمانے میں انہیں ایک عارضہ ہو گیا تھا، جس کے باعث وقتاً فوقتاً پاؤں میں سخت تکلیف شروع ہو جاتی۔ درد بھی ہوتا اور پاؤں متورّم بھی ہو جاتے دراصل اس بیماری کا آغاز پہلی عالمی جنگ میں ہوا جب ملک صاحب کے پاؤں برف باری سے ماؤف ہو گئے تھے اور انہیں بہ اصرار لندن بھیجا گیا تھا تاکہ علاج کرائیں، ڈاکٹروں نے خاصے عرصے تک علاج کیا مگر مستقل افاقہ نہ ہوا، کبھی کبھی بیماری عود کر آتی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتے۔ اقربا، کی خواہش تھی کہ بیماری کی حالت

میں سفر نہ کیا جائے کیونکہ جہاز اور حجاز میں اعلیٰ طبی امداد ملنے کی امید کم تھی اور سفر کٹھن تھا، جس میں ملک صاحب کے لئے پریشانیوں کا سخت اندیشہ تھا، وہ علاج کی غرض سے یورپ جانا چاہتے تھے، مگر فیصلہ یہی تھا کہ فریضہ حج ادا کئے بغیر نہیں جائیں گے۔ چنانچہ فروری ۱۹۳۵ء (ذیقعد ۱۳۵۳ھ) میں کراچی روانہ ہو گئے جہاں سے جہاز پر جدہ جانا منظور تھا۔

جہاز کا سفر

۲۸ر فروری کو جہاز کراچی سے روانہ ہوا اور عدن کے قریب ٹھہرتا ہوا ۸ر اور ۹ر مارچ کی درمیانی شب میں یلملم کے برابر پہنچا، جو پاک و ہند کی طرف سے جانے والے عازمین حج کے لئے احرام باندھنے کا مقام ہے، چنانچہ وہاں سے احرام باندھا اور ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو ملک صاحب جدہ پہنچ گئے۔

معمول کے مطابق ملک صاحب کے ساتھ ان کے خاص چند افراد بھی تھے۔ مثلاً ملک غلام محمد خاں بیرسٹر ایبٹ آباد، عطا محمد خاں، ولی محمد، شیخ فضل کریم۔ گاماں، کھانے کا پورا انتظام کر کے گئے تھے، جہاز پر خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ اور ان کے ایک ساتھی مل گئے، خان بہادر صاحب ملک عمر حیات خاں کے عزیز دوست تھے چنانچہ وہ جہاز پر سوار ہوتے ہی ملک صاحب کی خاص پارٹی میں شامل ہو گئے۔ دورانِ حج و زیارت میں ساتھ رہے اور قاہرہ پہنچ کر الگ ہوئے۔

جدّہ اور مکّہ معظّمہ

ملک صاحب ٹمک کے ممتاز اصحاب میں سے تھے اور ان کے دوستانہ روابط کا سلسلہ نہایت وسیع تھا، حکومت نے اپنے سفارتخانہ جدّہ کو پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ ملک صاحب حج کے لئے آرہے ہیں اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ جہاز جدّہ پہنچا تو مولوی احسان اللہ لانچ لے کر پہنچ گئے۔

مولوی صاحب موصوف وزیر آباد یا آس پاس کے کسی مقام کے باشندے تھے ابتداء ہی میں مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کر لیا، بڑے قابل، فہیم اور سرگرم آدمی تھے۔ برطانوی قونسل خانے میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کرتے کرتے نائب کونسل بن گئے۔ شریف حسین اور جلالۃ الملک عبدالعزیز بن سعود کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تو مولوی احسان اللہ نے بڑی سرگرمی سے صلح کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ شریف حسین تو طائف کے مسخّر ہوتے ہی بادشاہی سے دستبردار ہو کر قبرص چلا گیا۔ اس کا فرزند اکبر امیر علی حجاز کا بادشاہ بنا مگر اس کی حکومت صرف جدّہ میں محدود رہ گئی۔ مولوی احسان اللہ نے فریقین کے درمیان صلح کی گفتگو میں نمایاں حصّہ لیا، یہاں تک کہ امیر علی جدّہ چھوڑ کر اپنے بھائی شاہ فیصل کے پاس بغداد چلے گئے اور جلالۃ الملک عبدالعزیز نجد کے علاوہ حجاز کے بھی بادشاہ بن گئے۔

بہرحال مولوی احسان اللہ نے ملک صاحب اور ان کے تمام ساتھیوں کو جہاز سے اتارا اور ان کے لئے مکہ معظمہ

پہنچ جانے کا پورا انتظام کر دیا - ساتھ ہی معلم مقرر کرا دیا - چنانچہ ملک صاحب جدہ پہنچتے ہی شام کے وقت موٹر میں مکہ معظمہ روانہ ہو گئے، معلم نے قیام گاہ کا انتظام کر دیا ملک صاحب اور ساتھیوں نے طواف و سعی کے بعد عمرے کا احرام کھول کر حج کے لئے تیاری شروع کر دی -

منیٰ عرفات اور واپسی

اس سال ۱۴ مارچ کو حج تھا - جمعرات کا دن تھا - جلالۃ الملک عبدالعزیز سے ملک صاحب کے دوستانہ تعلقات ۱۹۱۶ء میں شروع ہوئے تھے - جب جلالۃ الملک کو اطلاع ہوئی کہ ملک صاحب حج کے لئے آئے ہیں تو فوراً حکم دے دیا کہ ایک عمدہ سٹیشن ویگن ملک صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا دی جائے اور ایک عسکری ساتھ جائے - جب تک ملک صاحب حجاز میں قیام فرما رہیں، سٹیشن ویگن برابر ان کی خدمت میں حاضر رہے، چنانچہ اسی سٹیشن ویگن میں وہ اور ان کے ساتھی ۱۳ مارچ کو منیٰ پہنچے - رات وہاں گذاری ۱۴ مارچ کو علی الصباح عرفات چلے گئے - دن بھر وہاں قیام کیا اور پورا دن نمازوں اور دعاؤں میں گذارا - شام کو واپس ہوئے - سنت کے مطابق رات مزدلفہ میں بسر کی - ۱۵ مارچ کو مزدلفہ سے منیٰ پہنچے مسنون قربانی کے بعد احرام کھولا - ۱۵ اور ۱۶ مارچ منیٰ ہی میں قیام رہا - ۱۷ مارچ کو مکہ معظمہ واپس ہوئے وہاں جلالۃ الملک سے بھی ملاقات کی - دوسرے بزرگوں اور اکابر سے بھی ملے - مکہ معظمہ کی زیارتوں سے بھی مشرف ہوئے

سفرِ مدینہ منورہ ۲۳ر مارچ ۱۹۳۵ھ کو ملک صاحب اور ان کے رفیق سٹیشن ویگن میں مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ رات رابغ میں گذاری جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک مشہور مقام ہے ۲۴ر کو مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں بھی قیام کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ آٹھ دن مدینہ منورہ میں قیام رہا اور اس اثناء میں انہوں نے تمام مقدس مقامات کی زیارتیں کیں۔

ایک دعا مدینہ منورہ میں نمازیں مسجد نبوی کے اندر ادا کرتے تھے اور ہر نماز کے بعد حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مزاراتِ مقدسہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے تھے۔ ملک صاحب کے پاؤں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ ایک روز حضرت فاروقِ اعظم کے مرقدِ منور کے روبرو کھڑے ہو کر انتہائی عجز و خلوص سے دعا کی۔ حضرت مجھ مسکین کو آپ کے ہم نام ہونے کا شرف حاصل ہے کیونکہ مسکین کے نام کا پہلا جزو بھی عمر ہے بارگاہ خداوندی میں دعا فرمایئے کہ مجھے اس بیماری سے نجات حاصل ہو اور زندگی کی جتنی بھی مہلت عطا ہوئی ہے۔ وہ معذوری کی حالت میں نہ گذرے :-

دعا خلوص سے مانگی گئی تھی اور ملک صاحب کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دعا شرف قبول حاصل کر چکی ہے۔ وہ یکم اپریل کو مدینہ منورہ سے جدہ روانہ ہوئے۔ رات پھر رابغ میں گذاری۔ ۲ر اپریل کو جدہ پہنچے تو وہاں کے ڈاکٹر نے

پاؤں کے لئے ایک معمولی سا مرہم تجویز کر دیا۔ اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ معذوری کی حالت جاتی رہی اور ملک صاحب کا باقی سفر بڑی حد تک اطمینان سے گذرا۔ یہ اس دعا کا اثر تھا جو مدینہ منورہ میں خلوص کے ساتھ مانگی گئی تھی۔

جدہ میں قیام

جدہ میں ملک صاحب ۶ر اپریل تک قیام فرما رہے۔ اس زمانے میں سر اینڈریو ریان وہاں انگریزی سفیر تھے۔ اس سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ چائے بھی پی۔ مشہور مصنف و مکتشف سینٹ جان فلبی بھی ملک صاحب کا عزیز دوست تھا۔ وہ جدہ میں رہتا تھا اور معلوم ہے کہ بعد ازاں مسلمان ہو گیا تھا۔ ملک صاحب اس سے ملاقات کے لئے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ یورپ گیا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی ۷ر اپریل کو وہ مصری جہاز زمزم میں سوار ہو کر جدہ سے مصر روانہ ہو گئے۔ کیونکہ وہاں سے ولایت جانا منظور تھا

طور اور قاہرہ

۹ر اپریل کو ۷ بجے صبح اس بندرگاہ پر پہنچے۔ جو کوہ طور کہلاتی ہے وہاں حکومت مصر کی طرف سے قرنطینہ قائم کر دیا گیا تھا۔ اور جہاز سے جانے والے تمام مسافروں کو چند روز وہاں ٹھہرایا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی متعدی وبا سے متاثر ہو تو اس کے اثر سے مصر کو محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ ملک صاحب اور ان کے ساتھیوں

نے ۹ اپریل سے ۱۴ اپریل کی مدت قرنطینہ میں گذاری
پھر سویز میں جہاز سے اتر کر قاہرہ پہنچ گئے۔ تین روز
قاہرہ میں گذارے۔ خان بہادر مولوی ظفر حسن وہاں سے
روما اور ترکی چلے گئے۔ ملک صاحب ۱۸ اپریل کو
پورٹ سعید سے جہاز پر سوار ہو کر مارسائی روانہ
ہو گئے۔

چوبیسواں باب

بادشاہ کی سلور جوبلی اور سیرِ یورپ

عزمِ یورپ پاؤں کی تکلیف کے باعث اقربا، ملک صاحب کو سفر سے روک رہے تھے، مگر انہیں ادائے فریضۂ حج کا خاص خیال تھا پھر یہ بھی چاہتے تھے کہ یورپ جائیں تاکہ بادشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی میں بھی شریک ہوں اور پاؤں کے متعلق بھی ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کریں۔ اس غرض سے وہ خصوصیت کے ساتھ وی آنا جانے کے آرزومند تھے۔ جو اس زمانے میں ماہرینِ طب کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔

وہ یورپ کے مختلف حِصے بارہا دیکھ چکے تھے، متعدد



شاہی دربار بکنگھم کورٹ میں شرکت کے لئے یونیفارم میں



آلڈر شاٹ (انگلستان) میں شہنشاہ جارج پنجم - پرنس آف ویلز اور شہنشاہ
کے اے - ڈی - سی (ملک صاحب - مہاراجہ پٹیالہ وغیرہ)
شاہی پریڈ دیکھ رہے ھیں -

مرتبہ انگلستان گئے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک وہاں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر رہے ۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ کے لئے فرانس پہنچے تھے تو اس زمانے میں بھی خاصا وقت یورپ کے اندر گذارا تھا انہیں عملی کاموں سے اتنی گہری دلچسپی تھی کہ سیر و سیاحت کے وہ چنداں مشتاق بھی نہ تھے ۔ یہی دو مقصد بادشاہ کی سلور جوبلی میں شرکت اور پاؤں کے متعلق طبی مشورے ان کے یورپ جانے کا باعث بنے ۔

بادشاہ کی سلور جوبلی میں شرکت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے ساتھ ولیعہدی کے زمانے سے دوستانہ تعلقات تھے، اور ملک صاحب کو بادشاہ نے اپنا اعزازی ایڈی کانگ بھی بنا لیا تھا ۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اگر جوبلی کی تقریب میں شریک نہ ہوا تو بادشاہ شاید اسے اچھا نہ سمجھے ۔ چونکہ پاؤں کے متعلق طبی مشورے کے لئے انہیں جانا ہی تھا اس لئے ایسا موقعہ منتخب کیا کہ جوبلی کے سلسلے کی تقریبات میں بھی شریک ہو سکیں ۔

ورودِ لندن اور تقریبات

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ۔ ملک صاحب ۱۸ اپریل کو پورٹ سعید سے روانہ ہوئے، جہاز ۲۱ ر کو مارسائی پہنچا اترتے ہی ریل کے ذریعے سے ۲۲ ر کی صبح کو لندن پہنچ گئے ۔ چونکہ وہ سرکاری مہمان تھے ۔ اس لئے سرکاری انتظامات کے مطابق انہیں کوئین اینز مینشنز[1] میں ٹھہرایا گیا :-

۱- ۶ ر مئی کو سلور جوبلی کا جلوس بکنگھم پیلس (شاہی محل) سے نکلا اس روز شام کا کھانا کلیریجز[2] میں کھایا :-

---

۱ Queen Anne's Mansions ۲ Claridges لندن کا مشہور ہوٹل

۲۔ ۷ر مئی شہزادہ ولیعہد نے سینٹ جیمز پیلس میں ایک عظیم الشان پارٹی دی۔

۳۔ ۹ر مئی پارلیمنٹ کی طرف سے سپاسنامہ پیش ہوا اور اسی شام کو بکنگھم پیلس میں شاہی دعوت کا اہتمام کیا گیا:۔

اس سلسلے میں متعدد مشغولیتیں پیش آئیں، جن کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ مثلاً بکنگھم پیلس میں سٹیٹ بال گلڈ ہال میں دعوت اور بال۔ جنوبی افریقہ کی حکومت کی طرف سے سیوائے میں دعوت طعام۔ اسی طرح راجاؤں مہاراجاؤں، وزیر اعظم اور انگلستان کے دوسرے اکابر کے ہاں دعوتیں ہوئیں۔ جلسے اور جلوس ہوتے رہے۔ ملک صاحب فوج اور بحریات کی تمام تقریبات میں شامل ہوئے۔ مئی کے علاوہ جون کا پورا مہینہ لندن میں گذارا اور جولائی کے تیسرے عشرے میں وی آنا کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں آپ کے صاحبزادے ملک خضر حیات خاں اور نواب اللہ بخش خاں ٹوانہ سلور جوبلی کی تقریبات سے فارغ ہو کر پہلے پہنچ چکے تھے اور ملک صاحب کے لئے بجلی کے علاج کا انتظام کر لیا تھا:۔

وی آنا چنانچہ ملک صاحب ۱۲ر جولائی کو لنڈن سے روانہ ہوئے۔ ڈوور سے جہاز پر سوار ہو کر بلجیم کی بندرگاہ آسٹنڈ پہنچے۔ پھر ریل کے ذریعے سے برسلز ہوتے ہوئے ۲۲ر کو وی آنا وارد ہوئے۔ وہاں انتظام کے مطابق بجلی کا علاج کرا رہے تھے کہ ۲۷ر جولائی کو گھر سے دن کے ایک بجے تار ملا کہ ملک صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ ساتھ ہی فیصلہ کر لیا کہ جلد سے جلد وطن پہنچ جائیں



حج سے مشرف ہونے کے بعد روزانہ تلاوت کلام پاک جنرل صاحب کا معمول رہا



سینٹ پال میں جارج پنجم کی سلور جوبلی کی رسم کا ایک منظر -
ملک صاحب اے - ڈی - سی کی حیثیت سے شہنشاہ کے جلوس میں -

وہیں سے سفر کا انتظام کیا ۸ر اگست کو وہ دی آنا سے مارسائی پہنچ گئے۔ ۱۰ر اگست کو جہاز پر سوار ہو گئے۔ سمندر میں کہیں طلاطم آیا کہیں حالت اچھی پائی ۲۲ر اگست کو ان کا جہاز بمبئی پہنچ گیا۔

ورودِ وطن اور رسمِ فاتحہ خوانی

۲۳ر اگست کو بمبئی سے روانہ ہو کر ملک صاحب ۲۴ر کو لاہور اور ۲۵ر کو کالرا پہنچ گئے۔ اس وقت سے برابر لوگ فاتحہ خوانی اور ماتم پرسی کے لئے ان کے پاس آتے رہے۔ ملک خضر حیات خاں بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے تھے اور ۷ر ستمبر کو وہ بھی کالرا آ گئے:۔

ملک عمر حیات خاں کے لئے واپسی کا یہ سفر جتنا غمناک و الم افزا ہوگا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ چار سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا تھا، والدہ ہی کی سرپرستی اور پرخلوص دعاؤں نے انہیں دنیوی اعزازات کے اس درجے پر پہنچایا، جو انگریزوں کے طویل دورِ حکومت میں صرف چند آدمیوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ والد کی وفات کے وقت وہ متوسط درجے کے زمیندار تھے، لیکن اپنی محنت حسنِ انتظام، مستعدی اور دانش مندی سے اتنے بڑے زمیندار بن گئے تھے کہ ویسے لوگ بہت ہی کم ہوں گے، یہ سب کچھ انہیں والدہ کے شفقت پرور سائے میں نصیب ہوا۔ تقریباً ساٹھ برس کے بعد یہ سایہ ان کے سر سے اٹھا یقیناً دنیا ان کی

منظر میں تاریک ہوگی۔

ملک صاحب کے مشاغل

پھر انہوں نے کوئی لمبا سفر اختیار نہ کیا اور زندگی کے باقی آٹھ نو سال عام فلاحی اور انتظامی سرگرمیوں ہی میں گذار دیئے۔ فرض شناسی ان کی زندگی کا خاص جوہر تھی۔ وہ جن انجمنوں یا اداروں سے اعزازی طریق پر وابستہ ہو جاتے تھے، ان کی تمام سرگرمیوں اور اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور یہ کیفیت ان کے روز ناموں سے واضح ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے سلسلے میں ملک کے اندر تمام ضروری سرگرمیاں برابر انجام دیتے رہے البتہ پہلی عالمی جنگ کی طرح خود شریک نہ ہو سکے۔ کیونکہ صحت اچھی نہیں رہی تھی اور عمر بھی پینسٹھ سے اوپر ہو چکی تھی، پھر رفاہی اخلاقی اور اصلاحی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ مثلاً کنبے اور برادری کے جھگڑوں کا تصفیہ۔ علاقے کے مختلف افراد و جماعت کے تنازعات کا فیصلہ، غریبوں کی امداد۔ ان کا پتہ ان روزناموں سے چلتا ہے جن کی تحریر و تسوید کا سلسلہ انہوں نے زندگی بھر برابر جاری رکھا اور ان کی تقریروں کے علاوہ انہیں روز ناموں سے ان کی سرگرم زندگی کے مختلف مشاغل کا سراغ لگایا جا سکا۔

پچیسواں باب

وفات

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید
ز جام دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

ملک صاحب کی زندگی ملک عمر حیات خاں کی عمر مستعار ستر سال کے مرحلے پر پہنچ گئی تھی، لیکن انہوں نے پوری زندگی بڑی احتیاط سے بسر کی تھی اور زیادہ تر ان سرگرمیوں سے سروکار رکھا جن میں جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ورزش کے مواقع

حاصل تھے۔ مثلاً جنگی سرگرمیاں یا سواری اور شکار یا اپنے وسیع املاک کی دیکھ بھال، جس میں انہیں برابر دورے کرنے پڑتے علاوہ بریں وہ متعدد تعمیری، انتظامی اور فلاحی اداروں اور مجلسوں کے رکن تھے۔ ان کے روزنامچوں سے آشکارا ہوتا ہے کہ ان مجلسوں کے اجلاسوں میں مستعدی سے شریک ہوتے تھے اور ان تمام کاموں میں پوری تن دہی سے حصّہ لیتے تھے، جو ان کے ہموطنوں کے لئے عموماً پس ماندہ دہقانی طبقوں اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً فائدہ مند تھے۔ پھر بظاہر ان کی صحت بھی اچھی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختلف جنگوں میں انہوں نے بہ طیب خاطر حد سے زیادہ مشقت و جفاکشی برداشت کی اور اس سے ان کی صحت پر اندر ہی اندر خاصی ضرب لگی، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان جنگوں میں وہ کسی مجبوری کے باعث شریک نہیں ہوئے تھے، بلکہ رضاکارانہ طریق پر شرکت کی تھی مثلاً، صومالی لینڈ کی جنگ، تبت کی مہم یا ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ۔ پھر ان کے پیش نظر اموال و مناصب کی بھی کوئی کشش نہ تھی بلکہ ہر جنگ میں انہوں نے اپنا اور رفیقوں کا خرچ خود برداشت کیا اور حکومت سے کوئی چیز لینی گوارا نہ کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی جفاکشی نے ان کی صحت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

املاک کا انتظام

جب ملک صاحب انڈیا کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو انہوں نے املاک کا انتظام اپنے اکلوتے فرزند ملک خضر حیات خاں

کے حوالے کر دیا۔ اس سے پیشتر ملک خضر حیات خاں پورے انتظامی کاروبار میں ہر ممکن اعانت کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں ملک عمر حیات خاں انڈیا کونسل کی ممبری سے سبکدوش ہوئے تو انتظام املاک بدستور ملک خضر حیات خاں ہی کی تحویل میں رہا۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کا نظام جاری ہوا اور ملک خضر حیات خاں متحدہ پنجاب کی وزارت میں شامل ہو گئے تو املاک کی دیکھ بھال کے لئے انہیں طبعاً زیادہ توجہ کا موقعہ حاصل نہ رہا، اس لئے ملک عمر حیات خاں پھر ایک حد تک انتظامی امور میں مدد دینے لگے لیکن وہ اس دوران میں بھی زیادہ وقت عوام کے فلاحی اور رفاہی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ ان کا شیوہ ابتدا ہی سے یہ رہا کہ کسی کام میں بہ طور نمائش یا بہ طریق اعزاز کبھی شریک نہ ہوئے۔ جب کسی میں شرکت گوارا کی تو دل و جان سے اس میں مصروف ہو جاتے اور اس کے لئے مشوروں میں شرکت اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ان کے روز ناموں میں ایسے کئی اندراجات موجود ہیں کہ کسی مجلس کے اجلاس کی تاریخ درج ہے اور کہیں کہیں بہ طریقِ مجبوری لکھنا پڑا کہ بخار آ گیا، اس وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔

آخری بیماری

آخری بیماری کی ابتدا ۷ مارچ ۱۹۴۴ء سے ہوئی، شروع میں معمولی بخار تھا۔ ۹ مارچ کو لائل پور میں ایک کمیٹی کا اجلاس تھا، جس میں شامل ہونے کا قصد تھا، مگر نہ جا سکے۔ صبح جلاب لیا جس سے بخار میں کسی قدر افاقہ ہوا لیکن ساتھ ہی خسرہ نمودار ہو گئی جس سے ضعف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں اور بھی مصروفیتیں تھیں، وہ سب ملتوی

کرنی پڑیں -

ملک صاحب سرگودھا والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ بیماری کا پورا زمانہ وہیں گذارا، چند روز کے بعد خسرے سے شفا ہو گئی، مگر ضعف میں کوئی خاص کمی نہ آئی تاہم خود انہیں یا اقربا و احباب کو ان کی عام صحت دیکھ کر خیال بھی ہو سکتا تھا کہ آخری مفارقت کا وقت آگیا ہے ۔ یہی اندازہ ہوتا تھا کہ چند روز میں طبیعت بالکل بحال ہو جائے گی -

وفات ۲۴ مارچ کی صبح کو وہ بظاہر بالکل تندرست نظر آتے تھے ۱۰ بجے کے قریب بیگم صاحبہ نے کہا کہ آپ پسند فرمائیں تو انڈا اور دودھ ملا کر فلپ تیار کر دوں ملک صاحب نے فرمایا، بہتر۔ چنانچہ فلپ کی ایک پیالی آپ نے پی، پھر لیٹ گئے، تھوڑی ہی دیر میں نیند آ گئی - اسی حالت میں روح مالک حقیقی سے جا ملی۔ نہ نزع کی حالت طاری ہوئی نہ آخری وقت کی کوئی تکلیف انہوں نے دیکھی، بڑے اطمینان سے سوتے سوتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اناللہ و انا علیہ راجعون۔ بیگم صاحبہ نے کچھ دیر بعد جگانے کی غرض سے جسم کو ہاتھ لگایا۔ تو بالکل ٹھنڈا تھا اس وقت بیگم صاحبہ اور تمام متعلقین و متوسلین کی جو حالت ہوئی، بیان سے باہر ہے ملک خضر حیات خاں اس وقت متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم تھے وہ دوسرے تیسرے روز لاہور سے سرگودھا چلے جاتے تھے اور ملک صاحب کو دیکھ آتے تھے۔ اچانک وفات کی اطلاع ملی تو ان کے لئے بھی دنیا اندھیر ہو گئی - وہ بھی جلد سے جلد سرگودھا پہنچے، اعزہ برادری اور اطراف کے ہزاروں اصحاب

کے علاوہ بے شمار افراد ملک صاحب کے فضائل اخلاق اور عظمت کے قائل تھے وہ بہ تعدادِ کثیر موقع پر جمع ہو گئے شہر والوں نے کاروبار ختم کر دیا اور ملک صاحب کی کوٹھی کے اندر اور باہر دور دور تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے سب اس عظیم القدر انسان کی موت پر رنج و اندوہ کے پیکر بنے ہوئے تھے۔

غسل اور جنازہ ملک خضر حیات خاں کے پہنچنے پر کوٹھی میں غسلِ میّت کا انتظام کیا گیا، پھر وہیں جنازے کی نماز پڑھی گئی، کوٹھی کا وسیع صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر سڑک کے آخر تک آدمی ہی آدمی تھے پھر میّت کو کالرا لے گئے، وہاں ملک صاحب کی کوٹھی کے پاس پولو گراؤنڈ میں دوبارہ جنازے کی نماز پڑھی گئی پولو گراونڈ بہت وسیع ہے، وہ پوری کی پوری آدمیوں کی بھر گئی۔ سرگودھا سے روانہ ہوتے وقت اہلِ شہر کی خدمت میں عرض کر دی گئی تھی کہ تکلیف نہ فرمائیں، لیکن اکثر اصحاب ری ماونٹ تک ساتھ گئے جو سرگودھا کے باہر خاصے فاصلے پر ہے اور خاصی تعداد کالرا تک ساتھ گئی کل اندازہ یہ ہے کہ پولو گراونڈ میں نماز جنازہ ادا کرنے والے پچیس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔

مقبرہ قبر کا انتظام اس باغ میں کیا گیا تھا، جہاں پہلے بھی خاندان کی قبریں تھیں۔ نو بجے شب کے قریب میّت قبر میں اتاری گئی۔ اُسی وقت قرآن خواں مقرر ہو گئے جو اب تک برابر وہاں قرآن پڑھتے رہتے ہیں ان کے قیام کا انتظام باغ ہی میں ہے، وہیں کھانا پہنچتا ہے۔

پھر ملک خضر حیات خاں نے ایک خوبصورت اور عالیشان مقبرہ تعمیر کرا دیا، قبر کی عام وضع قطع جہانگیر بادشاہ کی قبر سے ملتی جلتی ہے اور جہانگیر کی قبر کی طرح ملک صاحب کی قبر کے ارد گرد بھی اسمائے حسنیٰ مکتوب ہیں۔ جو نہایت خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں :-

فاتحہ خوانی کا سلسلہ تقریباً مہینہ بھر جاری رہا۔ ملک صاحب کے تعلقات نہایت وسیع تھے، وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں، بڑے بڑے عہدہ داروں جلیل القدر فوجی افسروں، گورنروں، نوابوں، راجاؤں مہاراجاؤں، امیروں اور رئیسوں کے علاوہ عوام میں بھی ملک صاحب مرحوم کو خاص رسوخ حاصل تھا، اکثر لوگ خود فاتحہ خوانی کے لئے آئے، تعزیت کے خطوط اور برقی پیغامات کا شمار نہیں ہو سکتا :-

ایک نادر شخصیت

یوں اس نادر شخصیت کا دورۂ حیات اختتام کو پہنچا، جو اگرچہ امیر گھرانے میں پیدا ہوئی تھی، مگر عمومی حیثیت سے غیر معروف سمجھی جاتی تھی لیکن زندگی میں گوناں گوں کارناموں کی بدولت اس نے وہ درجہ حاصل کیا، جس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ زمانے کے حالات بدلتے رہتے ہیں، ساتھ ہی افراد کے متعلق معیاروں میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے مگر ملک عمر حیات خاں اپنے گوناں گوں ذاتی اوصاف و محاسن کی بدولت ہزاروں لاکھوں افراد کے نزدیک ہمیشہ معزز و محترم رہیں گے کیونکہ انہوں نے دانستہ کبھی کسی فرد کو نقصان نہ پہنچایا یا کبھی کسی سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا، ہر موقع پر

سب کی ہر ممکن امداد کی۔ ہمیشہ خدا پر بھروسہ رکھا، عزیمت کے کاموں میں سب سے آگے رہے۔ ایثار میں بھی کسی موقعہ پر حتی الامکان دریغ نہ کیا۔ ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت فرمائے اور ان کے اچھے اوصاف پر کاربندی کی توفیق ارزانی کرے۔ آمین ثم آمین!!

چھبیسواں باب

سرگرم کامیاب زندگی

تمہید گذشتہ ابواب میں ملک عمر حیات خاں کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ ان کی شخصیت کے تمام خاص جوہروں اور خصوصیتوں کو آشکارا کر دینے کے لئے بالکل کافی تھا۔ بہ ایں ہمہ ضروری معلوم ہوا کہ ان کے بعض ممتاز ذاتی محاسن و اوصاف کی طرف سرسری اشارے ایک جداگانہ باب میں کر دیئے جائیں، خصوصاً ان اوصاف کے متعلق جن کی بنا پر انہیں عوام میں ہمیشہ خاص ہر دلعزیزی حاصل رہی اور وہ لوگ آج بھی مرحوم کا ذکر دلی ربط و تعلق کی بنا پر کرتے ہیں۔

ملک صاحب ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو گرد و پیش کے علاقے میں ثروت و املاک کے اعتبار سے خاصا نمایاں تھا۔

بس اس ایک خصوصیت کے سوا ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو زندگی میں ان کے لئے ایک اچھا سہارا ثابت ہو سکتی یا جس کی بنا پر وہ معیار زمانہ کے مطابق ایک بلند درجے پر پہنچ سکتے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف چار سال کی تھی اور وہ گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ ان حالات میں یہی اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے دولت ان کے لئے ایسے مشاغل کا ذریعہ بن جائے گی جنہیں کسی بھی دور میں اچھا نہیں سمجھا گیا۔ اور جن کی وجہ سے ہمارے ہاں کے اکثر دولتمند گھرانے نیچے گرتے گرتے بالکل ختم ہو گئے۔ لیکن ملک صاحب میں اللہ تعالیٰ نے ایسے جوہر ودیعت کئے تھے جن کا خاصہ ہی یہ تھا کہ وہ جس دائرے میں بھی جاتے عزم و ہمت کا راستہ اختیار کرتے، اس طریق پر کبھی گامزن نہیں ہوئے جسے بدیہی طور پر تنزل یا تباہی کا طریق قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بلند مقاصد کے لئے دولت کو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھا۔ یہ نہ کیا کہ اس کی وجہ سے بلند مقاصد چھوڑ دیتے اور تن پروری و فارغ البالی کی ان بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے جو آج بھی اہل ثروت میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ ملک صاحب کے ابتدائی عہد میں یہ بیماریاں عام تھیں اور ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

چند روشن حقیقتیں

جیسا کہ گذشتہ ابواب میں بار بار واضح کیا گیا، ملک صاحب کا نصب العین مدت العمر یہ رہا کہ وہ ایک مفید اور فرض شناس شہری کی حیثیت میں بلند ترین درجہ حاصل کر لیں، اور اپنے ملک

اپنی قوم اور اپنے ہم جلسوں کے لئے عمل کا ایسا نمونہ بن جائیں جو واقعی قابلِ قدر سمجھا جائے، ان سب کو فائدہ پہنچے، ملکی و قومی نقطۂ نگاہ سے جتنے کام ضروری ہیں وہ بطریقِ احسن انجام پائیں، عوام کی حالت بہتر ہو۔ تمام قوموں میں حق شناسی اور خیر سگالی کی روح پیدا ہو جائے، پسماندہ طبقے ترقی کر سکیں اور اجتماعی اعتبار سے جن سہولتوں کی بہم رسانی ضروری ہے۔ ان سے تمام طبقے پورا فائدہ اٹھائیں اس طرح ملک میں صلح و امن کے ساتھ قدم آگے بڑھانے کے تمام ضروری اسباب بروئے کار آ جائیں۔

گذشتہ ابواب میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ غور فرمائیں گے تو صاف صاف واضح ہو جائے گا کہ ملک صاحب زندگی بھر انہیں مقاصد کے لئے کوشاں رہے۔ کوئی دور ایسا نہیں کہ انہوں نے ان مقاصد سے سرِمو انحراف کیا ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوشش کے ہر دائرے میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے وسائل بے دریغ صرف کئے اور اپنی ذات کے لئے ان کاموں کے لئے کبھی کسی منفعت کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ یہاں تک کہ جن کاموں کے لئے وہ اپنا خرچ بالکل بجا طریق پر حکومت سے حاصل کر سکتے تھے (جو در اصل عوام کا خزانہ تھا) وہاں بھی انہوں نے اپنا اور اپنے متوسلین کا پورا خرچ خود برداشت کیا اور یوں عملاً ثابت کر دیا کہ مال و زر کو ان کے تحرکاتِ عمل میں قطعاً کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی بھر مالی اعتبار سے فارغ البال رکھا اور وہ اپنا وقت بے دریغ

عوامی، قومی ملی اور فلاحی کاموں میں صرف کرتے رہے اور ہر دائرے میں اپنا خرچ آپ برداشت کیا۔ موجودہ دور اغراض میں یہ چیز غالباً عجیب معلوم ہو لیکن اس کے حقیقتِ ثابتہ ہونے سے انکار کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔

ایک ضروری نکتہ ان کی پالیسی کے جو بنیادی اصول تھے ان پر غور و فکر کے لئے آج کے حالات پیش نظر رکھ لینا بالکل مناسب نہیں بلکہ وہ حالات سامنے لانے چاہئیں جو ان کی زندگی کے اوائل میں موجود تھے۔ سرسیّد احمد خاں مرحوم کی طرح ملک مرحوم کا بھی عقیدہ یہی تھا کہ خود اختیاری یا ملک کی آزادی کے لئے جو بھی قدم اٹھایا جائے، وہ مسلمانوں اور دوسری پسماندہ قوموں کے تحفظ پر مبنی ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خود اختیاری حکومت یا آزادی کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ برادرانِ وطن کے چند اونچے طبقے تمام اختیارات کے مالک بن جاتے اور مسلمان جو اس برِصغیر میں ایک مستقل قوم کا درجہ رکھتے تھے، اپنی حقیقی امتیازی حیثیت گم کر بیٹھتے۔ ملک عمر حیات خاں کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ممتاز مسلمانوں کا ایک وفد جداگانہ انتخاب کے مطالبے کے لئے لارڈ منٹو وائسرائے کے پاس شملہ میں پیش ہوا تھا (۱۹۰۶ء)۔ اس وقت سے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے مستقل کوششیں شروع ہوئیں اور ملک عمر حیات خاں زندگی بھر برابر اسی

مسلک پر قائم رہے۔ وہ جانتے تھے کہ خود اختیاری حکومت یا آزادی کی ذمہ داریاں جلد سے جلد اہل ملک کو اٹھانی پڑیں گی اور اس سے پیشتر وہ سب کچھ ہو جانا چاہیئے جو آئندہ حالات میں ملت و قوم کی حیثیت بحال رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ یہی بنیادی نکتہ ان کی پوری پالیسی کا مرکز و محور بنا رہا، اگر وہ یا دوسرے اکابر یہ مسلک اختیار نہ کرتے تو یقیناً بعد کے دور میں مسلمانوں کے تحفظ کے لئے جو جو قدم اٹھائے گئے، ان کے ممکن العمل ہونے کی بھی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔ یہی مسلک تھا جس نے آگے چل کر تحفظ مسلمین کے لئے جداگانہ وطن کے مطالبے کی گنجائش پیدا کی اور یہ وسیع سرزمین دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

مردِ دُور اندیش

غرض انہوں نے ایک مفید فرض شناس شہری کی طرح اپنے اوپر ایسی مشقتیں پے در پے برداشت کیں جن کا تصور عام سپاہی بھی نہیں کر سکتے۔ پہلی عالمی جنگ، صومالی لینڈ کی لڑائی اور تبت، کی مہموں نیز دوسرے وقائع کے سلسلے میں جو کچھ اوپر پیش کیا جا چکا ہے وہ ہمارے دعوے کی قاطع شہادت ہے۔ ملک، اہلِ ملک، خصوصاً مسلمانوں دوسرے پسماندہ طبقوں زمینداروں اور اہل فوج کے لئے ان کی تقریروں کے جو اقتباسات جا بجا پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان سے واضح ہو سکتا ہے کہ ملک صاحب کے دل میں ان سب کے لئے محبت ہمدردی اور بہبود کے کیسے قابلِ قدر

جذبات موجزن تھے - پھر ایک عملی مدبر کی طرح انہیں یہ احساس بھی تھا کہ مرکز حکومت کلکتہ کی جگہ دہلی ہونا چاہئے - مغربی سرحد کی طرح مشرقی سرحد کی حفاظت کو بھی درجہ کمال پہ پہنچنا چاہئے - بمبئی کی طرح کراچی کے نشوو ارتقاء کا انتظام بھی ضروری ہے جو پورے شمالی ہند کے قریب تر اور اس لئے موزوں تر بندرگاہ تھی - ملک کے لئے بحر قوت کی تنظیم بھی لازم ہے ، جس کے لئے اس کے وسیع سواحل کی حفاظت نہیں ہو سکتی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران میں یہ ٹھوس حقیقت سب پر آشکارا ہو گئی - جس فرد نے سرگرم عملی زندگی کے پچاس سال ان مقاصد کے لئے جدو جہد کرتے ہوئے گزارے اور اپنے لئے معمولی سی منفعت بھی گوارا نہ کی ، اس کے حالات کا جائزہ لیتے وقت نقطۂ نگاہ عامیانہ نہ ہونا چاہیے اور کچھ نہیں تو یہ حقیقت ضرور پیش نظر رکھ لینا چاہئے کہ اہل ملک میں سے ان مقاصد کے لئے پچاس سال تک بے غرضانہ جدوجہد کی کوئی دوسری مثال شائد ہی مل سکے -

میدانِ جنگ اور کونسل

ملک صاحب کو زندگی میں جتنی مہمیں پیش آئیں - اُن میں وہ سب سے پہلے اپنی خدمات بے توقف کار فرماؤں کے حوالے کرتے رہے ، ان مہموں میں شرکت ان کے نقطۂ نگاہ سے حفاظتِ وطن کے لئے ضروری تھی اور یہی حفاظت ان کے ایثار کی اصل بنیاد بنی رہی پھر ۱۹۰۶ء میں وہ پہلی مرتبہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل

کے رکن بنے اس کے بعد کم و بیش تیس سال تک مسلسل انہوں نے مختلف آئین ساز یا مشاورتی کونسلوں میں رکنیت کے فرائض ادا کئے ۔ مثلاً پنجاب کونسل کے بعد مرکزی اسمبلی میں پھر کونسل آف اسٹیٹ میں اور سب کے آخر انڈیا کونسل میں ۔ تیس سال کی اس مدت میں وہ جہاں بھی رہے اپنی مقاصد کے لئے سرگرمی سے کام کرتے رہے جو ان کے نزدیک ملک اور قوم کے لئے حد درجہ ضروری تھے اس کی شہادت وہ بے شمار تقریریں پیش کرتی ہیں جن کے اقتباسات مختلف عنوانوں کے تحت مختلف ابواب میں پیش کئے جا چکے ہیں — یقیناً ایسی شخصیت بدرجہا زیادہ قدر و منزلت کی مستحق ہے ۔ فارغ البال طبقے میں سے ملک عمر حیات خاں ایک یگانہ اور یکتا مثال بن گئے اور یقیناً سعی و تلاش سے بھی ہمیں ایسی اچھی مثالیں بہ آسانی نہ ملیں گی اور ملیں گی بھی تو بہر حال بہت ہی کم ہوں گی ۔

ستائیسواں باب

اخلاق و عادات

حرفِ آغاز ملک عمر حیات خاں کے فضائل اخلاق کا باب بہت وسیع ہے جو لوگ ان سے ملتے رہے یا ان کے ساتھ بسلسلہ ملازمت وابستہ رہے انہوں نے اتنی حکائتیں سنائی ہیں جنہیں ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے ۔ سیاسی و جنگی خدمات کا صحیح اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ملکی و قومی معاملات میں ان خدمات کی اہمیت کا احساس ہے، عام لوگوں کے نزدیک تو ملک عمر حیات خاں کی خصوصیت یہی تھی کہ انہوں نے سب کے ساتھ نہایت اچھا اور قابل قدر برتاؤ کیا، کبھی کسی کے ساتھ درشت کلامی سے پیش نہیں آئے، کبھی کسی کی ضرورت کا اندازہ کر لینے کے

بعد اس کی امداد میں دریغ نہ کیا اور سب کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ لوگ ان کا ذکر زبان پر لاتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دل و دماغ پر ان کی شفقت و محبت کا اثر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک ملک صاحب کی عظمت ان کے ذاتی برتاؤ اور شفقت و ہمدردی پر مبنی تھی، انہوں نے عام حالات کے اعتبار سے بڑے بڑے دنیاوی اعزازات حاصل کئے یہاں تک کہ وہ ۱۹۳۵ء میں لفٹنٹ جنرل بنا دیئے گئے اور یہ عہدہ اعزازی طور پر ان کے سوا کسی کو نہیں ملا۔ لیکن کوئی اعزاز یا دولت و ثروت کی کوئی فراوانی ابتدا سے آخر تک ان کی روش، برتاؤ، کردار اور شفقت و محبت میں خفیف سا تغیر بھی پیدا نہ کرسکی، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ابتدا میں کم شفیق تھے اور آخر میں بدرجہا زیادہ شفیق ہو گئے، ابتدا ہی سے ان کے اخلاق کا ایک سانچہ تیار ہو گیا تھا۔ اس سانچے میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، یہ خصوصیت بہت کم افراد میں پائی جاتی ہے۔

مذہب سے دلبستگی

مدت العمر انہیں مذہب سے گہری دلبستگی تھی ۱۹۰۵ء میں انہوں نے اپنے معاملات سنبھالے تھے، تو روزانہ مشاغل کی ایک فہرست مرتب کر لی تھی جس میں مختلف قسم کے مشاغل شامل تھے، ان میں سب سے پہلا کام کلام الہیٰ کی تلاوت رکھا اور یہ مشغلہ زندگی بھر ان کے ساتھ رہا۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ ہمیشہ مدارس میں مذہبی

تعلیم جاری کرنے کے حامی رہے - علی مردان شاہ قریشی ان کے اتالیقوں میں سے تھے، ملک صاحب چیفس کالج میں پہنچے تو ڈاکٹر کرتی سنگھ کو ان کا انگریزی اتالیق مقرر کر دیا گیا تھا کرتی سنگھ کی تعلیم و تربیت انگلستان میں ہوئی تھی اور وہ مذہب کا چنداں قائل نہ تھا اس کے اور ملک صاحب کے درمیان ایک مرتبہ عجیب واقعہ پیش آیا - جس سے ملک صاحب کی مذہب سے دلبستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے -

چیفس کالج ہی کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خاص مدت تک بارش نہ ہوئی اور لاہور کے مسلمانوں نے شہر سے باہر نکل کر منٹو پارک میں نماز استسقاء کا انتظام کیا - کرتی سنگھ نے بیٹھے بیٹھے کہا کہ دیکھئے مسلمان بھی کس قدر سادہ لوح ہیں - موسم شناسوں نے بتا دیا ہے کہ بارش نہیں ہو گی لیکن یہ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں - گویا اس طرح بارش ہو جائے گی، قریشی صاحب بھی اس وقت ملک عمر حیات خاں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ملک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا آپ نے بھی مذہب کی تعلیم حاصل کی ہے، چپ کیوں بیٹھے ہیں ؛ ڈاکٹر صاحب کے جواب میں کچھ کہیئے -

ملک عمر حیات خاں بولے :- خدا مسبب اسباب ہے، وہ اپنی رحمت سے ایسے اسباب پیدا کر سکتا ہے کہ موسم شناسوں کی پیش گوئی غلط ثابت ہو جائے -

غرض جب نماز پڑھی گئی تو اس کے بعد خدا کی رحمت سے موسلا دھار بارش ہو گئی یہاں تک کہ ڈاکٹر کرتی سنگھ

بول اٹھا :۔ دیکھئے اب خدا غصے میں آگیا ہے ۔

غرض زندگی کا کوئی ایسا دور نہیں جس میں مذہب کے ساتھ ملک صاحب کی گہری وابستگی نمایاں نہ رہی ہو ۔ وہ میدان جنگ میں زیادہ سے زیادہ خطرناک حالات دیکھ کر بھی نہیں گھراتے تھے ہمیشہ ان کا بھروسا خدا پر رہا ۔ یہ ان کی مذہبیت ہی کا ایک کرشمہ تھا ۔

فراخ حوصلگی

ملک عمر حیات خاں کم سن تھے اور ان کی جائداد کا انتظام کورٹ آف وارڈز کے ہاتھ میں تھا ۔ اس زمانے میں کوٹ آف وارڈز نے جمع شدہ روپیہ ان مختلف رہن جائدادوں کی واگذاشت کے لئے دیا تھا جو ملک صاحب کی جائداد کی طرح کورٹ آف وارڈز کے زیر حکمرانی تھیں ۔ مقصد یہ تھا کہ جائدادیں ساہوکاروں کے قرض سے پاک ہو جائیں اور جب حسن انتظام سے ان کی حالت بہتر ہو جائے تو آہستہ آہستہ قرضہ واپس لے لیا جائے ۔

جب ملک عمر حیات خاں نے اپنی جائداد کا انتظام سنبھال لیا تو پنجاب کے ایک مشہور خاندان سادات کی جائداد بھی ملک صاحب کے پاس مرہون تھی جس کے لئے روپیہ کورٹ آف وارڈز کے زمانے میں دیا گیا تھا، اس جائداد کے مالک ملک صاحب سے ملنے کے لئے آئے ۔ غرض یہ تھی کہ روپیہ کا ایک حصہ معاف ہو جائے اور باقی روپیہ دے کر وہ جائداد واگذار کرا لیں ۔

وہ ملک صاحب کے پاس کالرا پہنچے - ان کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا گیا - ساتھ ہی ملک صاحب نے کہہ دیا کہ اگر کوئی خاص بات کرنے کی ہے تو اسے رخصت کے وقت پر اٹھا رکھئے چندروز کے بعد اُن سادات کو رخصت کرنے کا وقت آیا - تو ملک صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک تحریر لکھ کر دے دی کہ میں اصل کی پوری سود کی رقم وصول کر چکا ہوں - اصل کے متعلق بھی کہہ دیا کہ آپ اپنی سہولت کے مطابق جو قسطیں مناسب سمجھیں، مقرر کر لیں - ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بولے خدا کرے اسی طرح میری بخشش کا انتظام بھی ہو جائے ، سادات سراپا متحیر رہ گئے اور کہا رسول اللہ صلعم کا دین سچا ہے اور آپ یقیناً بہشتی ہیں -

اس باب میں ملک صاحب کی فراخ حوصلگی کی اتنی داستانیں سنی ہیں کہ ان سب کو بیان کرنا مشکل ہے ۔

سب سے حُسن سلوک

علی مردان شاہ قریشی کے بھتیجے عبداللہ شاہ قریشی نے خود مجھے سنایا کہ میں جب کبھی جاتا تھا تو کوئی نہ کوئی چیز ضرور دے دیتے تھے - ایک مرتبہ ان کے پاس شملہ گیا - تو شملہ کی سیاحت کا پورا خرچ حوالے کر دیا - ایک مرتبہ ان کے پاس دہلی پہنچا، چھ سات آدمی ساتھ تھے - ہمارے جاتے ہی دو ٹیکسیاں منگوا لیں اور آدمی ساتھ کر دیئے کہ دہلی کے تمام مقامات کی سیر کراؤ - پھر دو سو روپے دیکر آگرہ کی سیر کیلئے بھیج دیا اور رخصت کے وقت مزید تین سو روپے دیئے -

اسی طرح ایک مرتبہ رمضان شریف میں ملک صاحب کے

کے پاس پہنچا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد ان کے فیصلوں کی مثلیں دیکھتا رہا۔ پھر مجھے اجازت دی تو ایک قیمتی پوستین بخش دی اور پھر موٹر میں سوار کرا کے بھیجا۔

عدالتی اختیارات

ملک صاحب کو ابتدا ہی سے اپنے علاقے میں عدالتی اختیارات حاصل تھے ان کے پاس مقدمات پیش ہوتے تھے تو تمام فریقوں کے لئے کھانے کا انتظام خود کرتے تھے ان کی یہ خصوصیت رہی کہ مقدمات میں عدل کے تقاضے سے کبھی انحراف نہ کرتے، غریب لوگوں کو جرمانے کی سزا دیتے تو جس جس کے متعلق یقین ہو جاتا کہ وہ خود جرمانہ ادا نہیں کر سکتا، اس کی رقم اپنے پاس سے دے دیتے۔ محض پولیس کی رپورٹ پر کسی کو سزا دینے کیلئے راضی نہ ہوئے، گواہوں پر خود جرح کر کے حقیقت حال پوچھتے، پہلے ہی فرما دیتے کہ دیکھو سچ بتانا، خدا مجھ سے بہت بڑا ہے اس کی بارگاہ میں سچ کے سوا کوئی چیز کام نہ دے گی

بھکر کا ایک بہت بڑا زمیدار جلال نام تھا جس کو عام لوگ جلّو کہتے تھے اسے بد قماشی کی لت پڑ گئی۔ گرفتار ہو کر ملک صاحب کے سامنے آیا تو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ بے اختیار سر ملک صاحب کے قدموں پر رکھ کر رونے لگا۔ ملک صاحب نے سپاہیوں سے فرمایا کہ ہتھکڑی اتار دو اور جلّو سے کہا کہ دیکھو میں تمہیں چھوڑتا ہوں، مجھے شرم آتی ہے، لیکن تجھے بھی تو کچھ احساس ہونا چاہیئے اور ایسے کام نہ کرنے چاہئیں جو قانون کے خلاف ہوں، اس کے بعد جلّو سے کبھی کوئی جرم سرزد نہ ہوا۔

شکار کا شوق

ملک صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شکار کے لئے نکلتے تو بہت سے آدمی ساتھ ہوتے۔ ہر جگہ کھانے پینے کا انتظام ملک صاحب کے ذمّے ہوتا۔ ملک خضر حیات خاں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ جب ملک صاحب شکار پہ جاتے تھے تو ہمیں ٹرکوں اور اونٹوں پہ رسد جگہ جگہ بھیجنی پڑتی تھی، جب کبھی شاہ پور چھاؤنی جاتے تو اپنے محلے کے لوگوں کے لئے کھانے کا انتظام اپنے ذمے لے لیتے اور بتایا جاتا ہے کہ اس محلے میں کم و بیش ایک سو گھر تھے۔

بیوگان و مساکین دیہاتی

ملک صاحب کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ اپنے علاقے کی تمام بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے لئے اتنا غلّہ مقرر کر دیا تھا کہ وہ بہ سہولت گذارا کر سکیں۔ ایک مرتبہ ان کے ایک منشی نے ایک بیوہ عورت کو پنکھا کھینچنے پر لگا دیا۔ ملک صاحب کو یہ پتہ چلا تو بے حد ناراض ہوئے۔ منشی کی سخت مذمت کی۔ خود روتے رہے کہ اس بدبخت نے میرا صدقہ برباد کر دیا اور اس بیوہ سے معافی مانگی یہ دستور ان کے علاقے میں اب تک قائم ہے اور تمام ضرورتمندوں کو برابر غلّہ مل رہا ہے، جس مرد یا عورت کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اس کے لئے کھانے کے علاوہ کپڑے کا انتظام بھی برابر ہوتا رہتا تھا اور اب تک یہی سلسلہ جاری ہے۔

اہل علم کی خدمت

ملک صاحب کو اہل علم کی خدمت کا بڑا خیال رہتا تھا، ایک مرتبہ محمد علی شاہ

اور قریشی علی مردان علی شاہ نے مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے علم و فضل کا ذکر کیا اور یقیناً مولانا روحی وقت کے اکابر علم میں سے تھے - ملک صاحب نے دعوت دیکر انہیں بُلایا، رخصت کرتے وقت ململ، لٹھے اور ریشم کے تھانوں کے علاوہ بلیس سیر مصری اور ایک معقول رقم بہ صورت نقد ہدیۃً پیش کی ساتھ ہی عرض کیا، دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ایمان قائم رکھے :-

اسی طرح الٰہی بخش کندلانے ضلع جہلم کے تھے جنہوں نے سسی پنوں کا قصہ پنجابی میں نظم کیا تھا، ان کے لئے مستقل وظیفہ مقرر کر دیا تھا، جب وہ آتے تو وظیفہ کے علاوہ آنے جانے کا خرچ اور دو اڑھائی سو روپیہ دیسے لے جاتے :-

ایک درویش کا واقعہ

ایک درویش اس باغ میں رہتا تھا۔ جہاں ملک صاحب کے والد ماجد کا مقبرہ تھا اور بعد میں خود ان کا مقبرہ بنا، اسے کھانے پینے کے علاوہ وظیفہ ملتا تھا - ایک مرتبہ منشی نے اس درویش کا وظیفہ بند کر دیا، ملک صاحب کو پتہ چلا تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ایک وقت میں کسی انگریز مہمان پر جو کچھ خرچ ہو جاتا ہے، وہ اس غریب کا سال بھر کا خرچ ہے - بدبخت منشی نے یہ کیا کیا ؟ چنانچہ اس درویش کو دُگنے روپے دیئے

ارباب فن کی قدر شناسی

ملک صاحب ارباب فن کے بڑے قدر شناس تھے، چنانچہ انہیں کوئی بھی شخص کسی فن میں مشاق ملتا تو اس کی سرپرستی اختیار فرما لیتے، انہیں کی سرپرستی کی بدولت بعض پرانے دیہاتی کھیل از سر نو زندہ ہوئے انہیں میں سے ایک کھیل "بڑکوڈی" تھا علاقے کے

نوجوانوں کی ٹیمیں بن گئیں اور ان میں مقابلے ہوتے رہتے تھے ملک صاحب تمام مقابلوں کا خرچ خود برداشت کرتے اور کبھی کبھی منتخب ٹیم لے کر دورہ بھی فرماتے۔ اسی طرح اچھے شہسواروں اور پہلوانوں کی سرپرستی بھی برابر کرتے رہے۔ انہیں کی سرپرستی میں مشہور شاطر سلطان خاں نے عالمی شہرت حاصل کی۔

رفقاء ان کے پاس عجیب قماش کے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً ستارہ خاں نام ایک پٹھان شکار کا ماہر تھا۔ ملک صاحب نے اپنے کتوں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا تھا، سواری کے لئے ایک خچر دے دیا وہ بگٹم لے کر نکلتا۔ سارنگی بجانے اور گانے کا اسے بہت شوق تھا۔ جب وہ سارنگی بجانے لگتا تو سب سے بے پرواہ ہو جاتا۔ بلایا جاتا تو کہتا "ہم سرور میں ہے۔ آپ کیوں ہمارا سرور خراب کرو"، وہ اپنی خوشی سے سب کچھ کرتا اور کسی کا حکم نہیں مانتا۔ ایک مرتبہ اس نے ریچھ خریدنے کی درخواست کی۔ ملک صاحب نے درخواست دیکھ کر بے تکلف فرمایا:۔ ستارہ خاں ہمارے لئے ایک ریچھ کافی ہے۔ زیادہ نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح ان کے ملازموں میں ایک علی نقائی تھا جو مٹھا ٹوانہ کا باشندہ تھا۔ شتر سواروں میں اسے بھرتی کیا گیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ تین مہینے کی تنخواہ لیتا اور ایک مینڈھا ذبح کرکے گوشت سب میں بانٹ دیتا۔ ایک

مرتبہ ملک صاحب نے پوچھا، علی اس میں تمہیں کیا مزہ آتا ہے۔ اس نے بے تکلف جواب دیا: بہرحال آپ تین مہینے میرا انتظار تو کرتے رہتے ہیں۔

ورزش کا شوق

ملک صاحب خود بھی ابتدا میں کثرت سے ورزش کرتے تھے۔ شاہ پور چھاؤنی جاتے تو اپنی کوٹھی سے آگے شیر شاہ والی پکی سڑک سے ہو کر نہر کے کنارے ایک میل دوڑتے۔ اسی طرح دوڑتے ہوئے واپس آتے، گویا روزانہ دو میل کی دوڑ لگاتے:۔

ایک روز واپس آ رہے تھے تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی بوجھ اٹھائے جا رہا ہے، لیکن بڑی تکلیف میں ہے۔ ملک صاحب نے دوڑ چھوڑ دی۔ اس کا بوجھ خود اٹھا لیا اور کوٹھی میں لے گئے۔ کھانا کھلایا۔ پانچ روپے دیئے اور اپنی بگی پر سوار کر کے اسے جہاں جانا تھا پہنچا دیا۔

علمی ذوق

ملک صاحب علمی آدمی نہ تھے لیکن ابتدا ہی میں فارسی کی تمام ضروری کتابیں پڑھی تھیں اور یہ ذوق برابر ان میں قائم رہا۔ ان کی تقریروں سے ایسے اقتباسات پیش کئے جا چکے ہیں جن میں مختلف فارسی اشعار اور ضرب الامثال انہوں نے نہایت موزوں طریقہ پر استعمال کی ہیں اسی طرح کابل کی تیسری جنگ کے دوران میں وہ پشاور پہنچے تو ایک جگہ خس کی ٹٹیوں کا انتظام تھا ملک صاحب نے



۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ کے زمانے میں جب ریکروٹنگ کے دفاتر
کا معائنہ آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔



کبڈی کا پنجاب کپ جیتنے والی ٹیم ملک صاحب کے ساتھ

یہ دیکھتے ہی میر سیدی کا شعر پڑھا جو عام روایات کے مطابق اُس نے جہاں آرا بیگم کیلئے لکھا تھا۔:

بر قع بہ رخ افگندہ برد سیر بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

ایک سبق آموز واقعہ

ملک صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر فرد کو اپنی کوشش کی حد تک زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتے رہتے تھے اور کبھی کسی عزیز یا دوست کا اعزاز بڑھانے میں تامّل نہ کیا، یہاں تک کہ جو اصحاب بہ سلسلہ ملازمت بھی ان کے پاس آجاتے تھے ان کی زیادہ سے زیادہ عزت ملحوظ رکھتے۔

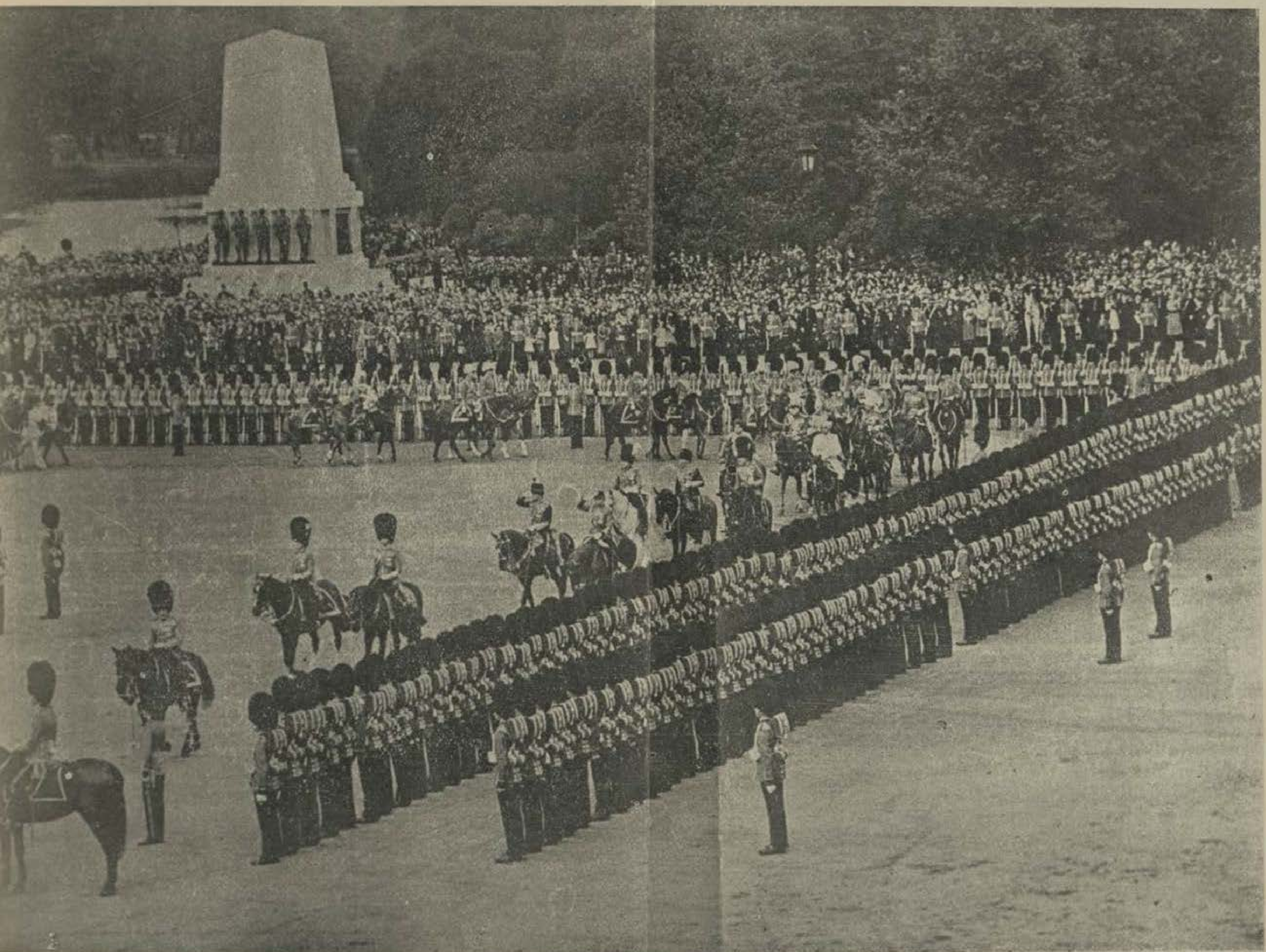
ملک صاحب ٹیریٹوریل آرمی کے نگرانِ اعلیٰ تھے اور اس کے معائنے کیلئے وقتاً فوقتاً انہیں دورے کرنے پڑتے تھے ایک مرتبہ دورے کے سلسلے میں وہ فیروزپور گئے، وہاں بلند پایہ فوجی اور سول افسروں نے ان کا استقبال کیا، جن میں بڑے بڑے انگریز بھی شامل تھے اور اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ملک صاحب نے بے تامّل فرمایا:۔

دیکھئے، میرا بھتیجا یہاں موجود ہے لہٰذا کسی دوسرے کے پاس ٹھہرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ٹیریٹوریل آرمی کے سلسلے میں جو ضروری کام ہیں میں برابر انجام دوں گا لیکن میرا قیام اپنے بھتیجے ہی کے پاس رہے گا:۔

جن بڑے بڑے افسروں نے ملک صاحب کو اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی تھی، ان کے مقابلے میں ملک صاحب کا رشتہ دار جس کے پاس وہ ٹھہرے سول کے معمولی عہدے پر فائز تھا لیکن ملک صاحب نے اپنے آرام یا اعزاز کا قطعاً خیال نہ کیا۔ یہی امر پیش نظر رکھا کہ اپنے رشتہ دار کی عزت میں اضافہ کریں اور اسی کے پاس ٹھہریں، حالانکہ ہمارے ہاں بڑے لوگ عموماً ایسے اقربا کی رشتہ داری کا اعتراف کرتے ہوئے بھی متامل ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جتنے روز فیروز پور میں قیام کیا اپنے رشتہ دار ہی کے پاس ٹھہرے رہے اور اکثر بڑے بڑے آدمی وہیں ان سے ملنے کے لئے آتے رہے۔ اس طرح تمام سول اور فوجی افسروں میں ان کے بھتیجے کا اعزاز بڑھ گیا۔

ایک اور واقعہ

اسی طرح کا ایک واقعہ ملک غلام محمد خاں بیرسٹر ایٹ لا کو پیش آیا، ملک عمر حیات خاں انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہو کر ولایت گئے تو ملک غلام محمد خاں بیرسٹر ایٹ لا سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، ملک عمر حیات خاں کو ایک مرتبہ جنرل برڈوڈ سے ملاقات کا موقعہ پیش آیا جو ہندوستان (موجودہ پاک و ہند) میں کمانڈر ان چیف رہ چکا تھا۔ ملک غلام محمد خاں بھی ساتھ تھے ملک عمر حیات خاں نے جنرل برڈوڈ سے ملک غلام محمد خاں کا تعارف



شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی ۱۹۳۵ء کے موقع پر لندن میں شاہی پریڈ - جنرل صاحب اے - ڈی - سی کی حیثیت سے شہنشاہ کے ہمراہ

کراتے ہوئے کہا : دیکھئے یہ میرے عزیز ہیں اور ہماری برادری میں پہلے فرد ہیں ، جنہوں نے بی ۔ اے کی سند حاصل کی ۔

غرض وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اپنے ہر عزیز اور دوست کا مرتبہ بڑھانے ہی پر آمادہ رہتے تھے۔ اس وجہ سے جن جن لوگوں کو ان سے تعلق یا ربط ضبط کا موقع ملا ، وہ ہمیشہ ان کے متعلق دلی محبت و عقیدت سے معمور رہے ۔

پیڈنگٹن کا ایک جلسہ

جب ملک عمر حیات خاں انڈیا کونسل کے رکن تھے تو ایک مرتبہ سر ڈونلڈ بائیڈ نے جو یہاں فنانشل کمشنر رہ چکا تھا ، ملک صاحب کے تعارف کے لئے پیڈنگٹن کاؤنٹی میں ایک جلسہ منعقد کیا ۔ ملک صاحب جلسے میں پہنچے تو ان سے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں چنانچہ وہ تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے اور حاضرین سے پوچھا کہ آپ فرمائیں کہ میں کس موضوع پر بولوں ؟ کہا گیا کہ آپ مسلمان ہیں ، خدا کے متعلق کچھ فرمائیے ۔ جلسے میں کمیونسٹ خیال کے لوگ بھی موجود تھے ، ملک صاحب نے تجویز سنتے ہی تقریر شروع کر دی ، ان کی پوری تقریر پیش کرنا تو ممکن نہیں کیونکہ اس کا کوئی ریکارڈ نہ رکھا گیا ۔ مگر ان کے استدلال کا خلاصہ یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے جتنے مشہور لوگ دنیا میں گزرے ہیں ، وہ سب خدا کے

قائل تھے اور عوام کی بھی بہت بڑی تعداد خدا کو مانتی ہے، یقیناً ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا کے منکر ہیں، سرسری اندازے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے دنیا کے ۸۰ فیصد لوگ خدا کے قائل رہے اور زیادہ سے زیادہ بیس فیصد ہوں گے جو خدا کو نہیں مانتے ہیں سچے دل سے خدا کو مانتا ہوں۔ اگر خدا ہے تو یہ عقیدہ میرے لئے سراسر فائدے کا سرچشمہ ہے۔ اگر بیس فیصد منکروں کی رائے درست ثابت ہو تو مجھے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں، کیونکہ اس رائے کے مطابق خدا موجود نہیں تو اس کے ہونے نہ ہونے کا عقیدہ زیر بحث ہی نہیں آئے گا۔

اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ فرض کیجئے کہ آپ کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں، جس کے سلسلے میں اقتصادی صورت حال یہ ہے کہ اسّی فیصد نفع یقینی ہے اور بیس فیصد یہ امکان ہے کہ نہ نفع ہوگا نہ نقصان تو سوچئے کہ اقتصادی لحاظ سے ایسا کاروبار کر لینے میں آپ کو یا کسی دوسرے شخص کو تامل ہو سکتا ہے؟

یہ سنتے ہی جلسے میں ہر طرف سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی اور کمیونسٹ خیال کے لوگ جن کی طرف سے اعتراض یا اختلاف کا امکان تھا بالکل چپ رہے، کیونکہ مسئلہ ایسی صورت میں پیش کر دیا گیا تھا کہ اس پر اعتراض کے تمام دروازے

بند ہو گئے تھے - ملک صاحب نہ عالم دین تھے نہ اپنے عقائد درست کرنے کے لئے انہوں نے علم کلام پڑھا تھا، البتہ جن چیزوں کو وہ حق سمجھتے تھے ان پر مضبوطی سے قائم تھے - جہاں ان کے اعلان و اظہار کا موقع پیش آتا کبھی خاموش نہ رہتے اپنے نقطۂ نگاہ سے انہوں نے ایسے دلائل مہیا کر لئے تھے جو ہر فرد کے لئے اطمینان کا باعث ہوتے یا کم از کم کسی کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہتی - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں کوئی بات کہی اس سے اختلاف شاذ ہی کیا گیا -

اہل و عیال

ملک صاحب نے دو شادیاں کیں بڑی بیگم سے ان کے ایک بچہ ہوا اور کوئی اولاد نہ ہوئی، ان کے صاحبزادے ملک خضر حیات خاں فوجی خدمات کے سلسلے میں والد کے نقش قدم پر چلے - ان خدمات کے علاوہ انہیں زراعت اور اس سے متعلقہ مشاغل کے ساتھ گہری دلبستگی تھی اور وہ اپنے املاک ہی کے انتظام میں مصروف رہے اس لئے کہ ملک عمر حیات خاں کو گوناں گوں مصروفیتوں کے باعث املاک کے انتظام پر زیادہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور جب وہ انڈیا کونسل کے رکن بن کر ولایت چلے گئے تو املاک کا پورا نظم و نسق ملک خضر حیات خاں ہی کو

سنبھالنا پڑا۔

۱۹۳۷ء میں صوبائی خود اختیاری کا نظام جاری ہوا تو ملک خضر حیات خاں پہلی مستقل وزارت پنجاب میں لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر بن گئے دسمبر ۱۹۴۲ء میں سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم کی وفات پر ملک خضر حیات خاں کو برسر اقتدار پارٹی نے بالاتفاق اپنا لیڈر چن لیا اور وہ وزیر اعظم بن گئے ان کے مفصل حالات ایک جداگانہ کتاب کے متقاضی ہیں، فروری ۱۹۴۷ء میں انہوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفا دے دیا پھر کوئی رسمی سیاسی مشغلہ اختیار نہ کیا۔

[م چھ ل پ]

ختم شد

پاکستان ٹائمز پریس لاہور